حدیثِ روشنی
سمیع اللہ ملک

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّ لَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَ لَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿النور:36﴾

اللہ آسمانوں اور زمین کا نُور ہے۔ ﴿کائنات میں﴾ اس کے نُور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہُوا ہو، چراغ ایک فانُوس میں ہو، فانُوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا، اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی جس کا تیل آپ ہی آپ بھڑکا پڑتا ہو چاہے آگ اس کو نہ لگے، ﴿اِس طرح﴾ روشنی پر روشنی ﴿بڑھنے کے تمام اسباب جمع ہو گئے ہوں﴾۔ اللہ اپنے نُور کی طرف جس کی چاہتا ہے رہنمائی فرماتا ہے، وہ لوگوں کو مثالوں سے بات سمجھاتا ہے، وہ ہر چیز سے خُوب واقف ہے۔

انتساب

ابّاجی کے نام..... جو میری زندگی میں روشنی کا استعارہ تھے

اپنے والد سے ہم کلام رہو

یوں وہ بوڑھا جوان رہتا ہے

دکھ مرنے کا نہیں ہوتا.....دکھ بچھڑنے کا ہوتا ہے

انسان کو موت نہیں رلاتی.....

وہ پیار رلاتا ہے جو مرنے والے کے ساتھ ہوتا ہے

تمہاری قبر پر
میں فاتحہ پڑھنے نہیں آیا
مجھے معلوم تھا
تم مر نہیں سکتے
تمہاری موت کی سچی خبر جس نے اڑائی تھی
وہ جھوٹا تھا
وہ تم کب تھے
کوئی سوکھا ہوا پتہ ہوا سے مل کے ٹوٹا تھا
مری آنکھیں
تمہارے منظروں میں قید ہیں اب تک
میں جو بھی دیکھتا ہوں
سوچتا ہوں
وہ وہی ہے
جو تمہاری نیک نامی اور بدنامی کی دنیا تھی
کہیں کچھ بھی نہیں بدلا
تمہارے ہاتھ میری انگلیوں میں سانس لیتے ہیں
میں لکھنے کے لیے
جب بھی قلم کاغذ اٹھاتا ہوں
تمہیں بیٹھا ہوا میں اپنی ہی کرسی میں پاتا ہوں
بدن میں میرے جتنا بھی لہو ہے
وہ تمہاری
لغزشوں ناکامیوں کے ساتھ بہتا ہے
مری آواز میں چھپ کر
تمہارا ذہن رہتا ہے
مری بیماریوں میں تم
مری لاچاریوں میں تم
تمہاری قبر پر جس نے تمہارا نام لکھا ہے
وہ جھوٹا ہے
تمہاری قبر میں میں دفن ہوں
تم مجھ میں زندہ ہو
کبھی فرصت ملے تو فاتحہ پڑھنے چلے آنا

حدیثِ روشنی

فہرست

سیریل نمبر	عنوان	تاریخ اشاعت	صفحہ نمبر
1	ذرا نہیں، مکمل سوچیئے	بروز جمعرات 20 ربیع الآخر 1443ھ 25 نومبر 2021ء	9
2	سرد جنگ، سپر پاور اور میڈیا	بروز اتوار 23 ربیع الآخر 1443ھ 28 نومبر 2021ء	13
3	واخان راہداری کا کلیدی کردار	بروز منگل 25 ربیع الآخر 1443ھ 30 نومبر 2021ء	18
4	دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا	بروز جمعۃ المبارک 28 ربیع الآخر 1443ھ 3 دسمبر 2021ء	22
5	ہم کیسے لُٹ گئے؟	بروز اتوار یکم جمادی الاوّل 1443ھ 5 دسمبر 2021ء	26
6	مجھے خوف آرہا ہے	بروز منگل 3 جمادی الاوّل 1443ھ 7 دسمبر 2021ء	30
7	قوم منتظر ہے	بروز جمعرات 5 جمادی الاوّل 1443ھ 9 دسمبر 2021ء	32
8	خوشی کا راز	بروز جمعۃ المبارک 6 جمادی الاوّل 1443ھ 10 دسمبر 2021ء	34
9	کوالٹی لائف	بروز اتوار 8 جمادی الاوّل 1443ھ 12 دسمبر 2021ء	38
10	رجعت پسندی کا نیا چہرہ	بروز سوموار 9 جمادی الاوّل 1443ھ 13 دسمبر 2021ء	41
11	تجارتی ناکہ بندی.....نیا عالمی تصادم	بروز منگل 10 جمادی الاوّل 1443ھ 14 دسمبر 2021ء	43
12	اور تضحیک کیا ہے؟	بروز جمعرات 12 جمادی الاوّل 1443ھ 16 دسمبر 2021ء	47
13	آزادی یا غلامی؟ فیصلہ ترے ہاتھ میں	بروز ہفتہ 14 جمادی الاوّل 1443ھ 18 دسمبر 2021ء	51
14	آخری تنبیہ	بروز سوموار 16 جمادی الاوّل 1443ھ 20 دسمبر 2021ء	55
15	موت سے بھاری قیامت	بروز منگل 17 جمادی الاوّل 1443ھ 21 دسمبر 2021ء	58
16	لیزر، بحری اور سائیبر جنگ کی تیاری	بروز بدھ 18 جمادی الاوّل 1443ھ 22 دسمبر 2021ء	61
17	آخر کب تک؟	بروز جمعرات 19 جمادی الاوّل 1443ھ 23 دسمبر 2021ء	63
18	قائد کی بالغ نظری اور ہم!	بروز جمعۃ المبارک 20 جمادی الاوّل 1443ھ 24 دسمبر 2021ء	66
19	کانپ اٹھتا ہوں	بروز اتوار 22 جمادی الاوّل 1443ھ 26 دسمبر 2021ء	70
20	تمہارا درد بڑا ہے یا میرا غم۔۔۔۔بولو	بروز اتوار 22 جمادی الاوّل 1443ھ 26 دسمبر 2021ء	72
21	مالک سے تعلق کی نئی راہیں	بروز سوموار 23 جمادی الاوّل 1443ھ 27 دسمبر 2021ء	78
22	عرفان یا سکون	بروز منگل 24 جمادی الاوّل 1443ھ 28 دسمبر 2021ء	80
23	امریکا اور یورپ کی باہمی مجبوریاں	بروز بدھ 25 جمادی الاوّل 1443ھ 29 دسمبر 2021ء	83
24	زندگی تو کب کی مر گئی ہے	بروز جمعۃ المبارک 27 جمادی الاوّل 1443ھ 31 دسمبر 2021ء	85
25	تدبر سے کام لے ناداں	بروز اتوار 29 جمادی الاوّل 1443ھ 2 جنوری 2021ء	89
26	پیوند لگے تھے، آبرو میں	بروز سوموار 30 جمادی الاوّل 1443ھ 3 جنوری 2021ء	92

سیریل نمبر	عنوان	تاریخ اشاعت	صفحہ نمبر
27	سقوطِ غرناطہ اور پاکستان	بروز بدھ 2 جمادی الآخر 1443ھ 5 جنوری 2021ء	96
28	خطے میں بھارت کی تجارتی پسپائی	بروز ہفتہ 5 جمادی الآخر 1443ھ 8 جنوری 2021ء	102
29	بے غیرتی کی شاہکار زندگی	بروز اتوار 6 جمادی الآخر 1443ھ 9 جنوری 2021ء	104
30	لاعلاج مرض!	بروز منگل 8 جمادی الآخر 1443ھ 11 جنوری 2021ء	108
31	امید نہ ٹوٹے!	بروز بدھ 9 جمادی الآخر 1443ھ 12 جنوری 2021ء	110
32	محبت کی سولی!	بروز جمعرات 10 جمادی الآخر 1443ھ 13 جنوری 2021ء	112
33	امت مسلمہ کو بڑا دھچکہ	بروز ہفتہ 12 جمادی الآخر 1443ھ 15 جنوری 2021ء	115
34	عدمِ مساوات کا مشترکہ مسئلہ	بروز اتوار 13 جمادی الآخر 1443ھ 16 جنوری 2021ء	117
35	خفیہ اکاؤنٹس کی ہنڈیا	بروز سوموار 14 جمادی الآخر 1443ھ 17 جنوری 2021ء	120
36	خوش حالی یا خسارہ	بروز منگل 15 جمادی الآخر 1443ھ 18 جنوری 2021ء	122
37	وقت اب آن پہنچا ہے	بروز جمعرات 17 جمادی الآخر 1443ھ 20 جنوری 2021ء	126
38	ریکوڈیک: معدنیات کا شوکیس	بروز جمعۃ المبارک 18 جمادی الآخر 1443ھ 21 جنوری 2021ء	129
39	وقت منادی	بروز اتوار 20 جمادی الآخر 1443ھ 23 جنوری 2021ء	133
40	وقت کا تمسخر	بروز سوموار 21 جمادی الآخر 1443ھ 24 جنوری 2021ء	135
41	موت کی خاموشی	بروز منگل 22 جمادی الآخر 1443ھ 25 جنوری 2021ء	137
42	اندر کی آنکھ	بروز بدھ 23 جمادی الآخر 1443ھ 26 جنوری 2021ء	139
43	روح کا گھاٹا	بروز جمعرات 24 جمادی الآخر 1443ھ 27 جنوری 2021ء	142
44	ہجوم میں تنہا	بروز جمعۃ المبارک 25 جمادی الآخر 1443ھ 28 جنوری 2021ء	145
45	غُسل خون کا اندیشہ بڑھ گیا ہے	بروز ہفتہ 26 جمادی الآخر 1443ھ 29 جنوری 2021ء	148
46	انسانوں کی تلاش	بروز سوموار 28 جمادی الآخر 1443ھ 31 جنوری 2021ء	151
47	مالک الملک کی تنبیہ	بروز منگل 29 جمادی الآخر 1443ھ یکم فروری 2021ء	154
48	إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ	بروز جمعرات 2 رجب المرجب 1443ھ 3 فروری 2021ء	157
49	آنسوؤں کا سورج اور یقیں محکم	بروز جمعۃ المبارک 3 رجب المرجب 1443ھ 4 فروری 2021ء	160
50	حق کسی آمیزش کو نہیں مانتا	بروز اتوار 5 رجب المرجب 1443ھ 6 فروری 2021ء	164
51	ایران اور اسرائیل حالت جنگ میں	بروز سوموار 6 رجب المرجب 1443ھ 7 فروری 2021ء	166
52	زندہ جاوید اور امر لوگ	بروز منگل 7 رجب المرجب 1443ھ 8 فروری 2021ء	168

سیریل	عنوان	تاریخ اشاعت	صفحہ
53	حُرمتِ نسواں	بروز جمعرات 9 رجب المرجب 1443ھ 10 فروری 2021ء	172
54	ان کہی کہانی	بروز ہفتہ 11 رجب المرجب 1443ھ 12 فروری 2021ء	177
55	ماں روٹھ گئی ہے	بروز سوموار 13 رجب المرجب 1443ھ 14 فروری 2021ء	181
56	بیتِ ندامت۔۔۔۔۔الامان الحفیظ	بروز بدھ 15 رجب المرجب 1443ھ 16 فروری 2021ء	185
57	مشرقِ وسطیٰ اور امریکا۔۔۔راستے جدا جدا	بروز جمعۃ المبارک 17 رجب المرجب 1443ھ 18 فروری 2021ء	189
58	لو اپنے دام میں صیاد آ گیا	بروز اتوار 19 رجب المرجب 1443ھ 20 فروری 2021ء	193
59	تو پھر کیا ہو گا؟	بروز سوموار 20 رجب المرجب 1443ھ 21 فروری 2021ء	197
60	کیا بھارت متحد رہ سکے گا؟	بروز منگل 21 رجب المرجب 1443ھ 22 فروری 2021ء	199

ذرا نہیں مکمل سوچیے!

آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ جتنی بڑی گاڑی ہے اسی قدر اس کی نگہداشت کا ساماں موجود! کسی شیڈ کے نیچے یا چھاؤں میں ایک طرف یا کسی پورچ میں۔ ڈرائیور وقفے وقفے سے اسے دیکھتا بھالتا اور کبھی کبھی تھوڑی سی بھی غیر ضروری گرد کو صاف کرتا رہتا ہے۔ اتنے میں بڑا دروازہ کھلتا ہے، ایک ہلچل سی مچ جاتی ہے۔ چپڑاسی بریف کیس اور صبح کی اخباروں کا بنڈل ہاتھ میں لئے باہر آتا ہے اور اگر کوئی ضروری فائل ہو تو وہ بھی ساتھ ہوتی ہے۔ ڈرائیور کے پیچھے والی سیٹ کا دروازہ کھول کر وہاں یہ سامان انتہائی سلیقے کے ساتھ رکھ دیا جاتا ہے۔ پھر ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ کو زور لگا کر ممکن حد تک آگے کر دیا جاتا ہے تاکہ پچھلی سیٹ کے سامنے کافی جگہ آرام سے ٹانگیں پھیلانے کیلئے میسر آجائے۔ گرمی کا موسم ہو تو صاحب کے آنے سے پہلے ہی گاڑی کا ائر کنڈیشنر چلا دیا جاتا ہے تاکہ دفتر اور گاڑی کے درمیان کا چند گز کے فاصلے کی حدت فوری طور پر کافور ہو جائے حالانکہ گاڑی چوکس حالت میں ممکن حد تک دروازے کے قریب لا کر کھڑی کر دی جاتی ہے۔

صاحب بہادر ایک شان بے نیازی سے برآمد ہوتے ہیں۔ ارد گرد موجود لوگ ایکدم ساکت و جامد ہو جاتے ہیں۔ گفتگو کرنے والا گفتگو بھول جاتا ہے، بے ترتیب یونیفارم والا ٹوپی سیدھی کر لیتا ہے اور سگریٹ پیتا ہوا شخص سگریٹ پھینک دیتا ہے یا پھر کہیں چھپا دیتا ہے۔ پچھلا دروازہ جو ڈرائیور سے دوسری سمت والا ہے اسے کھول کر کوئی شخص کھڑا ہوتا ہے۔ صاحب بہادر تشریف رکھتے ہیں۔ تمام لوگوں کے ہاتھ فوری طور پر سلام کرنے کیلئے ماتھے کی طرف بڑے ادب کے ساتھ اٹھتے ہیں۔ اشاروں کا منتظر گاڑی کو خراماں نکالتا ہوا منظر سے جب تک غائب نہیں ہو جاتا یہ تمام خادمین وہاں سے ہلنے کی جرأت نہیں کرتے۔ پورا راستہ صاحب بہادر یا تو اخباروں کی ورق گردانی کرتے ہیں، موبائل فون پر کسی کو احکام صادر کر رہے ہوتے ہیں یا پھر بیگم کی فرمائش کو پورا کرنے کا وعدہ وعید ہو رہا ہوتا ہے۔ اگر وقت بچ جائے تو کسی فائل کی رو گردانی شروع کر دی جاتی ہے۔ اس پورے سفر میں ڈرائیور کی حیثیت ایک پرزے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ یوں لگتا ہے کہ کمپنی نے سٹیرنگ، گئیر یا سیٹ کی طرح اسے بھی وہاں فکس کر دیا ہے جسے صرف احکامات سننے اور اس پر عمل کرنا ہے۔ وہاں روک دو، ادھر لے چلو، میرا انتظار کرو، میں واپس آرہا ہوں۔ مجھے دو تین گھنٹے لگیں گے اور وہ ڈرائیور اپنی سیٹ سے فوری چھلانگ لگا کر باہر نکل کر دروازہ کھولتا ہے اور روبوٹ کی طرح سر ہلا کر یا پھر منہ سے سعادت مندی کے الفاظ نکالتا رہتا ہے۔

یہ منظر آپ کو ہر اس دفتر یا ادارے کے باہر ملے گا جہاں کوئی ایک صاحب اختیار تشریف رکھتا ہے۔ کسی سرکاری یا غیر سرکاری کا کوئی امتیاز نہیں۔ وزیر کا دفتر یا سیکرٹری کا، جرنیل کا ہیڈ کوارٹر یا عدلیہ کی عمارت، کسی پرائیویٹ کمپنی کے دفاتر ہوں یا بینک کی شاندار عمارت، سب جگہ صاحبان طاقت اور والیان حیثیت کیلئے ایک ہی سیٹ مخصوص ہے۔ ان کی گاڑی کہیں پہنچے لوگ وہی دروازہ کھولنے کیلئے لپکتے ہیں۔

میں یہ سب منظر دیکھتا ہوں تو اکثر یہ سوال میرے ذہن میں اٹھتا ہے کہ یہ سب لوگ ڈرائیور کی ساتھ والی سیٹ پر کیوں نہیں بیٹھتے؟ کیا وہ آرام دہ نہیں؟ کیا وہاں ائر کنڈیشنڈ کی ہوا صحیح نہیں پہنچتی؟ کیا وہاں سے راستہ، ارد گرد کی عمارتیں یا لوگ ٹھیک سے نظر نہیں آتے؟ لیکن ان سب سوالوں کا جواب تو نفی میں ملتا ہے۔ یہ سامنے والی سیٹ زیادہ آرام دہ اور زیادہ ٹھنڈی بھی ہے۔ باہر کا منظر بھی صحیح نظر آتا ہے۔ تو پھر یہ سیٹ خالی کیوں رہتی ہے یا پھر اس پر سٹاف آفیسر یا پی اے کو کیوں بٹھایا جاتا ہے؟

یہاں کہانی اس نفرت کی ہے۔ یہ داستان اس تکبر کی ہے جس میں ڈرائیور کی حیثیت ایک انسان سے کم ہو کر بادشاہوں کے رتھ اور مہاراجوں کی بڑی بڑی سواریاں چلانے والوں کی ہوا کرتی تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک اعلیٰ مرتبہ اور مقام رکھنے والی شخصیت ڈرائیور کے برابر میں آ کر بیٹھ جائے اور دیکھنے والے ان دونوں کے درمیان تمیز تک نہ کر سکیں کہ کون افسر ہے اور کون معمولی حیثیت کا ڈرائیور۔ ایک زمانہ ان متکبر افسران اور وزرأ، جرنیل اور اعلیٰ عہدیداروں پر ایسا آیا کہ ان کو چھوٹی سی سوزوکی پر سفر کرنا پڑا۔ جس کی پچھلی سیٹ انتہائی بے آرام اور کم جگہ والی تھی لیکن تکبر اپنا راستہ خود بناتا ہے اور اس طریقہ کو رائج کرنے والوں کو بے شمار صلواتیں سنانے کے بعد آقا اور مالک کی تمیز کو برقرار رکھنے کے نئے نئے طریقے دریافت کئے گئے۔ اگلی سیٹوں کو مکمل طور پر فولڈ کیا جانے لگا۔

یہ رویہ ان ساری قوموں پر گزرا ہے جنہوں نے انسانوں کو غلام اور محکوم بنانے کے ڈھنگ ایجاد کئے تھے۔ امریکا میں "جم کرو" کے قوانین کے تحت بسوں تک میں کالوں کی سیٹیں گوروں کی سیٹوں سے نہ صرف الگ ساخت کی ہوتی تھیں بلکہ آگے ہوتیں اور اگر کوئی کالا اگلی سیٹ پر بیٹھ جاتا تو اسے گولی سے اڑا دیا جاتا اور اگر کوئی گورا پچھلی سیٹ پر بیٹھ جاتا تو اسے طعنے مار مار کر اس سے ناتا توڑ لیا جاتا۔ لندن کے بازاروں میں آج بھی کالے رنگ کی ٹیکسیوں کا رواج ہے جس میں ڈرائیور کی سیٹ اور سواریوں کے درمیان ایک شیشے کی دیوار کھڑی کر دی جاتی ہے جس کی کھڑکی صرف سواری کھول سکتی ہے تاکہ ڈرائیور کی حیثیت، مرتبہ اور اس سے بات کرنے کا تعین بھی وہی کرے جو پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہے۔ صدیوں تک فرعونوں، شہنشاہوں، آمروں، ڈکٹیٹروں اور ان کے چھوٹے چھوٹے کارپردازوں کی سواریاں بھی ایسی تھیں کہ ان کا عام لوگوں سے کوئی تعلق نہ رہے۔ دھول اڑاتی یہ سواریاں جہاں عوام الناس کا مذاق اڑاتی تھیں وہاں ان سواریوں پر سفر کرنے والے بھی انسانوں کے درمیان تمیز، فرق اور آقا و غلام کے قانون میں بٹے ہوئے تھے۔

تکبر، غرور اور گھٹنوں ساتھ چلنے، آرام پہنچانے والے شخص سے کراہت دوری کے اس ماحول میں پتہ نہیں کیوں مجھے اپنا ماضی یاد آجاتا ہے۔ اسلاف کے وہ معیار آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں۔ روم کے بادشاہوں کی طرح رہن سہن اور لباس پہننے والوں عیسائیوں کے بیت المقدس پر جب پھٹے پرانے کپڑے پہننے والے مسلمانوں نے فتح حاصل کی تو شہر حوالے کرنے کیلئے خلیفہ وقت عمر ابن الخطاب کا انتظار تھا۔ ایک گھوڑا جس کے سم گھس کر بیکار ہو چکے تھے۔ رک رک کر قدم رکھتا تھا۔ اس کے ساتھ خلیفہ وقت اور فاتح ایران و شام عمر ابن الخطاب اور غلام موجود۔ طے پایا کہ آدھا راستہ غلام سواری کرے گا اور آدھا راستہ خلیفہ وقت۔ بیت المقدس قریب آیا تو باری غلام کی آگئی اور پھر تاریخ نے انسانی احترام کا ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔ غلام گھوڑے پر اور خلیفہ وقت باگ تھامے بیت المقدس میں داخل ہوئے۔ شاہی کروفر اور لباس پہنے رومی عیسائی بے ساختہ صرف ایک فقرہ بول سکے کہ ایسا ہی شخص عزت کا مستحق ہے اور ایسے ہی شخص کو فتح نصیب ہوا کرتی ہے۔ اس تاریخی فقرے کے بعد بھی اگر کوئی مجھ سے سوال کرتا ہے کہ ہم دنیا میں ذلیل اور رسوا کیوں ہیں، بے آسرا کیوں ہیں تو مجھے کوئی حیرت نہیں ہوتی۔

چلتے چلتے یہ بھی سنتے جائیں معاملہ تو اب بہت ہی سنگین ہو گیا ہے۔ عوام تبدیلی کے ہاتھوں تلملا اُٹھے ہیں اور جرائم میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے اور لاقانونیت سر کے بال کھولے سرِ عام بازاروں میں ناچ رہی ہے۔ عمران خان نے اقتدار سنبھالنے سے پہلے جتنے وعدے کئے تھے، ان

پر موصوف ڈٹ کر یوٹرن کو اپنی سیاسی دانشمندی سے تعبیر دے چکے ہیں۔ قوم سے خطاب میں عوام کو خصوصی پیکج کا وعدہ تو کیا لیکن ساتھ ہی اور مہنگائی کا اعلان کر کے اگلے ہی دن قوم پر پٹرول بم گرا کر یہ سمجھایا جارہا ہے کہ عالمی طور پر مہنگائی ہو رہی ہے لیکن ملک کو مدینہ ریاست بنانے کا وعدہ کرنے والے جانتے ہیں کہ بیرون ملک ایک مزدور کیا کمارہا ہے؟ آپ نے تو ڈالر مہنگا ہونے کی دلیل حکمرانوں کی چوری بتایا تھا، اب آپ نے تو روپے کی قیمت کو بھی رلا دیا ہے، کس کو دوش دیا جائے۔

آپ نے پروٹوکول کو ایک لعنت قرار دیتے ہوئے اسے یکسر ختم کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن آپ نے ہیلی کاپٹر کے استعمال کے ساتھ روایتی پروٹوکول بھی اسی سج دھج سے قائم رکھا ہوا ہے۔ آج بھی صاحب بہادر کی سواری گزرنے سے پہلے کئی گھنٹے ہر قسم کی ٹریفک روک دی جاتی ہے، کئی مریض ایمبولنس میں ہی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں پھر اس کے بعد گاڑیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ اور وہ بھی بلٹ پروف اور ہزاروں افراد کی نگرانی میں قافلہ اپنی منزل تک بحفاظت پہنچا کر سکھ کا سانس لیا جاتا ہے۔ کیا قافلے کی تمام گاڑیاں بغیر پٹرول کے ساتھ بھاگتی دوڑتی ہیں۔ میرے محترم وزیر اعظم! آپ کی اپنی جماعت کا نام ہی "تحریک انصاف" ہے، کبھی تنہائی میں ایمانداری سے اپنا محاسبہ کر کے سوچیں کہ انصاف کی چڑیا کا تو کب سے گلہ گھونٹ کر رکھ دیا گیا ہے، کیا آپ مدینہ ریاست کے وعدے کی جوابدہی کیلئے تیار ہیں؟

ورلڈ کپ میں حسن علی نے ایک کیچ چھوڑا اور پاکستان میچ ہار گیا جس سے شائقین کو بہت دکھ ہوا اور حسن علی کی اب بھی درگت بنائی جارہی ہے، محاسبہ کیا جارہا ہے۔ اسی تناظر میں کچھ سوالات ہیں جو قوم آپ سے اور تمام ارباب اختیار سے پوچھ رہی ہے:

☆ ہم ان بدبختوں کا محاسبہ کیوں نہیں کرتے جنہوں نے کشمیر کو ظالموں کے چنگل میں پھنسا دیا جس کا درد ہر ایک مسلمان دل میں محسوس کرتا ہے۔ آپ نے خود کو کشمیر کا وکیل کہہ کر کسی بھی قسم کی تحریک چلانے سے منع کر دیا اور اعلان کیا کہ ہر جمعہ کی دوپہر کو ایک گھنٹہ کشمیریوں سے یکجہتی کیلئے مظاہرہ کیا جائے گا لیکن آپ پہلے ہفتے چند منٹوں کیلئے فوٹو سیشن کے بعد ایسے غائب ہوئے کہ آج تک کشمیری آپ کا سراغ نکالنے سے محروم ہیں۔ آپ ان کا محاسبہ کب کریں گے جنہوں نے افغانستان پہ حملہ کرنے والوں کا ساتھ دیا تھا؟ آپ تو افغانستان میں طاقت کے خلاف تھے لیکن امریکی انخلاء کے بعد جو بائیڈن کی کال کے بھی ویسے ہی منتظر رہے جس طرح مودی کی کال آج تک نہیں آئی۔

☆ ان کا محاسبہ کب کریں گے جو طاقت رکھنے کے باوجود مسلمانوں پر ہونے والے ظلم و ستم پر مجرمانہ خاموشی اختیار کئے ہوئے ہیں؟ آپ نے ترکی، ملائشیا اور ایران سے باہمی وعدے وعید کر کے عین وقت پر ان دوستوں کے اعتماد کو بری طرح توڑ ڈالا اور کانفرنس میں شرکت سے انکار کر دیا۔

☆ ان کا محاسبہ کب کریں گے جو فلسطینی اور کشمیری بہنوں بیٹیوں کی عصمتیں پامال کرنے والوں کو طاقت رکھنے کے باوجود کچھ نہیں کہتے بلکہ اب تو وہ ہنود و یہود غاصبوں کے ساتھ سفارتی و تجارتی تعلقات کو بڑھاوا دینے کیلئے مقبوضہ کشمیر میں سرمایہ کاری اور براہ راست پروازیں چلانے کا اعلان کر چکے ہیں؟ ان کی درگت کب بنائی جائے گی جنہوں نے پوری امت کو طاغوت کے سامنے ذبح کر رکھا ہے؟ اور شریعت کو مکمل طور پر معطل کر رکھا ہے؟

☆ آپ کے وزراء نے ایک مذہبی جماعت کے ڈانڈے "را" سے ملا کر بعد ازاں ان سے انہی کی شرائط پر معاہدہ کر لیا۔ کیا آپ نے اپنے وزراء کے قوم سے جھوٹ بولنے پر کوئی محاسبہ کیا؟ آخر اپنے ان رفقاء کو کب گریبانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا جائے گا جو قوم کے ٹیکسوں پر عیاشی کرتے ہوئے قوم کو دھوکہ دیتے ہیں جبکہ پوری قوم غربت اور مہنگائی کی وجہ سے کراہ رہی ہے۔ اگر آپ کو کشمیریوں اور اپنی قوم کے دکھ نظر نہیں آتے تو جان لیں کہ یہ پستی و

بربادی کے آخری زینے پر کھڑے ہیں اور جلد ہی یہاں کی ذلت کے ساتھ آخرت کی ہزیمت بھی ان ذمہ داروں کی منتظر ہے۔ ذرا نہیں مکمل سوچئے۔
آخر میں یہ کہانی بھی پڑھ لیں ممکن ہے کہ دل پر اثر کر جائے!
ایک لونڈی محل کی صفائی ستھرائی پر مامور تھی۔ ایک دن بادشاہ کی خوابگاہ میں اس کی ڈیوٹی تھی۔ بادشاہ کی مسہری دیکھ کر اس کی آنکھیں چندھیا گئی۔ اس نے ایسا اپنے تصور میں بھی نہ دیکھا تھا۔ سب کی آنکھ بچا کر اس نے مسہری کے نرم و گداز کو جب چھوا تو اس کی خواہش لیٹنے کیلئے مچل گئی۔ اس نے سوچا کوئی دیکھ بھی نہیں رہا کیوں نہ چند لمحوں کیلئے اس پر لیٹ کر اپنی خواہش پوری کر لوں۔ ایسے نرم و گداز بستر پر لیٹتے ہی اس بے چاری کی آنکھ لگ گئی۔ بد قسمتی سے بادشاہ کا وہاں سے گزر ہوا تو ایک معمولی لونڈی کو اپنے بستر پر دیکھ کر آگ بگولہ ہو گیا۔ فوری طور پر اس کو زندہ جلانے کا حکم دے دیا۔ ایک بہت بڑے الاؤ کے سامنے جب اس کو لایا گیا تو بادشاہ نے روایت کے مطابق اس کی آخری خواہش پوچھی۔ اس لونڈی نے اس مجمع کی طرف دیکھ کر کہا کہ مجھے اس بادشاہ سے تو کچھ نہیں کہنا لیکن اے لوگو! میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ اس مسہری پر چند لمحے کی نیند کی اگر اتنی بڑی سزا ہے کہ مجھے زندہ اس آگ کے الاؤ میں جلانے کی سزا ملی ہے تو ان لوگوں کا کیا حشر ہو گا جو ساری عمر ایسے نرم و گرم گداز بستر میں گہری نیند کے مزے لیتے ہیں؟ یہ کہ کر وہ خود ہی اس الاؤ کی طرف چل پڑی۔

اس سوز و درد میں ڈوبی ہوئی آواز نے اس بادشاہ کے ہوش اڑا دیئے۔ اس نے فوری طور پر اپنے خدام کو لونڈی کو روکنے کا حکم دیا اور اگلے لمحے اس لونڈی کو آزاد کر دیا۔ تخت و تاج اور بادشاہت چھوڑ کر اللہ سے لو لگائی۔ ساری عمر غریبوں اور مسکینوں کی خدمت میں گزار دی اور آج دنیا اس کو بڑے احترام کے ساتھ حضرت ابراہیم ادہم کے نام سے یاد کرتی ہے۔ کیا آج کے حکمران اور ہمارے اشراف کیلئے اس میں کوئی سبق پنہاں ہے؟؟؟

اب تو بتانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ہم دنیا میں ذلیل اور رسوا کیوں ہیں، بے آسرا کیوں ہیں!

بروز جمعرات 20 ربیع الآخر 1443ھ 25 نومبر 2021ء

سرد جنگ، سپر پاور اور میڈیا

چین کے حریفوں کی ہر ممکن کوشش ہے کہ کسی طرح وہ چین کی اقتصادی راہداری کے مقابل کوئی قابل عمل منصوبہ پیش کر سکیں۔ جی۔7 ممالک کے اجلاس میں بھی غور وخوض کے باوجود ابھی تک کوئی متبادل پیش نہیں کر سکے۔ "کلین گرین انیشیٹو" کا منصوبہ مغرب اور چین کے درمیان جاری حریفانہ کشاکش کا تسلسل اور بیجنگ کی بڑھتی ہوئی پیش قدمی کو روکنے اور دنیا کی بڑی طاقتوں کی بے چینی کا سبب بنا ہوا ہے۔ 2013ء میں جب سے چین کی اقتصادی راہداری "بی آر آئی۔ بیلٹ اینڈ روڈ انیشیٹو" کا آغاز ہوا، دنیا کی 100 ابھرتی ہوئی معیشتوں نے اس کا حصہ بن کر اس منصوبے میں 100 ارب ڈالر سے زیادہ سرمایہ کاری کی گئی۔ بیلٹ اینڈ روڈ انشیٹو کے تحت قرض حاصل کرنے والے ممالک کیلئے چین سے حاصل کیے گئے قرضوں کی واپسی، پروجیکٹ کی کامیابی سے تکمیل، مزدوروں کے حقوق کا خیال اہم چیلنج ہیں۔ صرف ایشیائی ممالک کو اگلی دہائی میں اپنے انفراسٹرکچر کو نئے طرز پر استوار کرنے کیلئے 1ء7 کھرب ڈالر درکار ہوں گے۔ لہٰذا یہ ممالک "بی آر آر بی" کے متبادل کسی دوسرے منصوبے میں شامل ہو سکتے ہیں۔

کیونکہ اس وقت کرونا نے "بی آر آئی" کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ لاک ڈاؤن کی پابندیوں کی وجہ سے چینی مزدور پروجیکٹ کیلئے دوسرے ممالک کا سفر نہیں کر سکتے۔ معاشی چیلنجز کے پیش نظر چین کی قیادت بھی دوسرے ممالک میں کسی نئے پروجیکٹ کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں، اس لئے جی۔7 ممالک نے صحیح وقت کا انتخاب کیا ہے۔ جی۔7 ممالک اس صورتحال میں کیا فیصلہ کرتے ہیں یہ اہم ہے۔ تاہم معلومات کے مطابق "گرین کلین انشیٹو" کوئی غیر معمولی منصوبہ نہیں، نہ ہی یہ کسی بھی طور "بیلٹ اینڈ روڈ انیشیٹو" کا متبادل ہو سکتا ہے جی۔7 ممالک کے پیش نظر محض بیجنگ کو سراسیمہ کرنا ہے۔ ٹرمپ کے دور حکومت میں، امریکا "بی آر آئی" کے خلاف مستقل بیان بازی کرتا رہا ہے۔ 2018ء میں امریکا کے سیکرٹری مائیک پومپیو نے چین کی پیش قدمی روکنے کیلئے ایک مخصوص فنڈ قائم کرنے کے عزم کا اظہار کیا تھا لیکن وہ کوشش کے باوجود صرف 113 ملین جمع کر سکا تھا۔ کچھ عرصہ پیشتر امریکا نے آسٹریلیا اور جاپان کے ساتھ مل کر "بلیو ڈاٹ" کے نام سے ایک منصوبے کا آغاز کیا۔ لیکن اس منصوبے کو بھی خاطر خواہ پزیرائی نہیں مل سکی۔

امریکا اور اس کے اتحادیوں کیلئے مشکل ہے کہ وہ چین کے کم لاگت لیکن اعلیٰ معیار کے منصوبوں کا مقابلہ کر سکے۔ چین اپنے مقاصد کیلئے کسی بڑے پروجیکٹ میں سرمایہ کاری سے دریغ نہیں کرتا، اس طرح کی سرمایہ کاری کسی اور ملک کیلئے ممکن نہیں۔ اس سال کے آغاز میں امریکا کے صدر بائیڈن نے بھی بورس جانسن کے ساتھ مل کر "بی آر آئی" کے حوالے سے مشترکہ کوششوں کیلئے بات کی تھی۔ اس وقت امریکی صدر چین کے ساتھ ہر محاذ پر بھرپور مسابقت چاہتے ہیں۔ امریکا کیلئے دوسرے ممالک کے انفرااسٹرکچر میں مدد اور اس میں سرمایہ کاری کرنا مشکل نہیں۔ اس حوالے سے جاپان کی مثال ہمارے سامنے ہے، جاپان نے ایشیائی ممالک میں بڑی خاموشی سے خطیر رقم کی سرمایہ کاری کی ہے۔ معیار کے اعتبار سے جاپان، چین سے بہت آگے ہے۔ اگر جی 7 ممالک، یورپی یونین اور ترقی یافتہ ایشیائی ممالک جاپان، آسٹریلیا کے ساتھ شراکت کریں تو نتائج مختلف ہو سکتے ہیں۔ امریکا یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ اس نوعیت کی شراکت میں قائدانہ کردار ادا کر سکے۔ تاہم، یہ اہم ہے کہ اس نوعیت کے کسی بھی منصوبے کی کامیابی کیلئے وسائل اور سیاسی عزم کا ہونا ضروری ہے لیکن بدقسمتی سے امریکا اپنے سپر پاور کے تکبر میں وہ غلطیاں کر چکا ہے اور مزید کرتا چلا جا رہا ہے کہ اس کی واپسی کا راستہ بھی مسدود ہوتا چلا جا رہا ہے۔

افغانستان سے بری طرح ہزیمت اٹھانے کے بعد امریکا دانشمندی کی بجائے انتقامی کاروائیوں کے خبط میں مبتلا ہو گیا ہے، اسرائیل اور بھارت جو امریکی کندھوں پر بیٹھ کر خطے میں سپر پاور بننے کا خواب دیکھ رہے تھے، اپنی ہر قسم کی آرزوؤں کا خون ناتمام دیکھ کر حواس باختہ ہو چکے ہیں۔ بالخصوص بھارت جو اسرائیل کی معاونت سے افغانستان میں اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری محض اس لئے کر رہے تھے کہ پاکستان اور چین کو ناگزیر نقصان پہنچا کر خطے میں اپنی برتری قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن وقت نے ایسا پلٹا کھایا کہ تمام متکبر قوتوں کی ناک خاک آلود کر دی ہے۔ حال ہی میں امریکا نے اپنے ہاں افغانستان کے زرمبادلہ کے 9/ارب 50 کروڑ ڈالر لے ذخائر منجمد کر دیئے ہیں تاکہ طالبان کو معاشی مشکلات میں مبتلا کر کے ان کو سزا دی جا سکے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ چین اور روس بہت تیزی سے ابھر کر ایک بڑے خطرے کی شکل اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ امریکا اور مغرب کی الجھن بڑھتی ہی جا رہی ہے کہ ان دونوں مملکتوں کو ایک خاص حد تک محدود کرنے میں کیوں کر کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔ مغرب کو یہ فکر لاحق ہے کہ چین اور روس جیسے ممالک سے نپٹنے کیلئے بہترین حکمتِ عملی کیا ہو سکتی ہے؟ انہیں چیلنج کرنا، ان سے ٹکرانا، انہیں ایک خاص حد تک رکھنے کی کوشش کرنا؟ کیا صرف معاشی معاملات میں کوئی بڑا قدم اٹھا کر ان دونوں طاقتوں کو دبا کر اپنی مرضی کے حجم کا حامل بنایا جا سکتا ہے؟ اس وقت چین اور روس جو کچھ کر رہے ہیں، کیا ویسا ہی کچھ کر کے اُن سے بہتر طور پر نمٹا جا سکتا ہے؟ ان تمام سوالات کے درست جواب کی شکل ہی میں مغرب کیلئے اپنی طاقت کو برقرار رکھنے کی کوئی راہ مل سکتی ہے۔

امریکا، یورپی یونین اور برطانیہ نے چین کو دبوچنے کی کوشش میں جو تجارتی پابندیاں عائد کی تھیں انہیں چینی قیادت نے بیک جنبشِ قلم مسترد کر دیا ہے۔ برطانوی وزیر اعظم بورس جانسن چین کے معاملے میں کچھ زیادہ جذباتی دکھائی دیتے ہیں۔ چینی قیادت بھی محسوس کرتی ہے کہ اگر وہ مطلوب حد تک جذباتی نہ ہوئی اور کسی بھی اقدام کا فوری جواب نہ دیا تو اُس کیلئے آگے بڑھنا انتہائی دشوار ہو جائے گا۔ یہی سبب ہے کہ کسی بھی مغربی اقدام کا فوری جواب دینے میں تساہل کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے نہ بخل کا۔

سنکیانگ کے مسلمانوں کے حقوق کی خلاف ورزیوں کی بنیاد پر اب تک کمیونسٹ پارٹی کے چار نچلے درجے کے عہدیداروں کو مغرب نے دوروں سے روک دیا ہے اور مغرب میں اثاثے رکھنے پر بھی پابندی عائد کی گئی ہے۔ اس کے جواب میں چین نے بھی مغربی دنیا کے قانون سازوں کو اپنے ہاں آنے سے روک دیا ہے۔ ان میں برطانیہ کے دارالعوام خارجہ امور کی کمیٹی کے سربراہ ٹام ٹیوگنڈیٹ، جرمن پارلیمان کے رکن رائنہارڈ بوٹینگو فراور فرانس کے سوشلسٹ رکن پارلیمان رافیل گلکسمین شامل ہیں۔ ان اقدامات کے جواب میں فرانس میں چینی سفیر کو احتجاجاً دفتر خارجہ طلب کر کے مختلف امور پر وضاحت طلب کی ہے۔

جو کچھ چین اور مغربی دنیا کے درمیان ہو رہا ہے اُس سے چین اور یورپی یونین کے درمیان سرمایہ کاری کے معاہدے کی یورپی یونین اور یورپی ممالک سے الگ الگ باضابطہ توثیق کے امکانات محدود ہوتے جا رہے ہیں۔ 2020ء کے آخر تک اس معاہدے کو فریقین کیلئے غیر معمولی کامیابی قرار دیا جا رہا تھا مگر اب معاملہ الجھ گیا ہے۔ چین نے اب تک

محسوس ہوا ہے کہ اُنہیں خطرناک حالات یورپی ممالک کے حوالے سے جو اقدامات کیے ہیں وہ کارگر ثابت ہوئے ہیں کیونکہ برطانیہ، فرانس اور جرمنی کو وہ واقعات کا سامنا ہو سکتا ہے۔ دوسری طرف امریکا نے اب تک یہی ثابت کیا ہے کہ وہ چین کے معاملے میں واضح اپروچ اپنانا چاہتا ہے۔ جو بائیڈن چین اور روس دونوں کے حوالے سے کوئی بھی بات چھپ کر اور دب کر نہیں کر رہے ہیں۔ انہوں نے ٹی وی پر پیوٹن کو قاتل کہا ہے اور صدارتی مہم کے ایک مباحثے میں انہوں نے چینی صدر شی جن کو دھوکے باز بھی قرار دیا تھا۔

امریکی خارجہ پالیسی کی تشکیل کے حوالے سے سوچنے والوں کے پلیٹ فارم "دی اٹلانٹک کونسل" نے اب ''دی لانگر ٹیلی گرام'' کے مصنف کا نام منظرِ عام پر لائے بغیر کہا ہے کہ اگر امریکا کی قیادت میں فعال مغربی لبرل نظام کے تحت کام کرنا ہے تو چین کو اپنی قیادت میں تبدیلی لانا ہوگی اور امریکی قیادت سے بھی کہا گیا ہے کہ اگر چین اور روس سے بہتر طور پر نپٹنا ہے تو جاپان، آسٹریلیا اور بھارت سے تعلقات کو وسعت دینا ہوگی۔ ساتھ ہی ساتھ اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ جاپان اور جنوبی کوریا کے درمیان اختلافات گھٹانے اور تعلقات خوشگوار بنانے پر بھی توجہ دی جانی چاہیے تاکہ یہ دونوں ممالک مل کر مغربی دنیا کا عمومی طور پر اور واشنگٹن کا خصوصی طور پر ساتھ دیں۔ اِسی مضمون میں امریکا پر بھی زور دیا گیا ہے کہ وہ روس سے معاملات درست کرنے پر توجہ دے۔ یہ سب کچھ اصلاً اس لیے ہے کہ چین اور روس میں حکومت ہی نہیں بلکہ حکومتی نظام کو بھی تبدیل کر دیا جائے۔ یہ جنگ کے باضابطہ اعلان سے کچھ زیادہ دور کا معاملہ نہیں کیونکہ گھیرا تنگ تو کیا ہی جا رہا ہے۔

یورپ کیلئے الجھنیں ہی الجھنیں ہیں۔ برطانیہ، فرانس، جرمنی اور دیگر یورپی طاقتیں مخمصے کا شکار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ چین اب اُن کیلئے امریکا سے بڑی منڈی ہے۔ اکیسویں صدی میں جرمنی کے دو چانسلر گیرہارڈ شروڈر اور اینگلا مرکل نے جمہوریت کو فروغ دینے کے لبرل نظام کے بڑے آئیڈیل کو چین اور روس کیلئے برآمدات بڑھانے کے آئیڈیل پر قربان کر دیا ہے۔ پولینڈ کے سابق وزیر خارجہ اور سابق وزیر دفاع رادیک سکورسکی نے، جو اب پارلیمان کے رکن ہیں، حال ہی میں ایک مقالہ شائع کیا ہے، جس میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ یورپی یونین کو چین کی جانب سے چلائی جانے والی غلط بیانی کی مہم اور مسلط کیے جانے والے بیانیوں کے خلاف شدید مزاحمت کرنی چاہیے۔ رادیک سکورسکی کا شمار یورپ کے ان قانون سازوں میں ہوتا ہے جو خارجہ پالیسی اور چین سے تعلقات کے حوالے سے غیر معمولی بیباکی پر مبنی خیالات کے حامل ہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ یورپی یونین کے کمیشن نے 2019ء میں چین کو مختلف معاشی مفادات کا حامل ملک ہونے کے باوجود ایک ممکنہ اچھا شراکت دار قرار دینے سے متعلق جو موقف اپنایا تھا وہ اب فرسودہ ہو چکا ہے اور چین کو ایک کٹّر حریف کے طور پر ہی لینا چاہیے۔

مغربی طاقتیں چین کی پالیسی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں پر گہری نظر رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے خیال میں چین دھیرے دھیرے اپنی پالیسیوں میں ایسی تبدیلیاں لا رہا ہے جنہیں کسی بھی طور قبول نہیں کیا جا سکتا۔ وہ کسی بھی معاملے میں پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔ اُس کی بھرپور کوشش ہے کہ کسی نہ کسی طور معاشی معاملات میں زیادہ سے زیادہ مفادات یقینی بنانے کی راہ اپنائی جائے۔ وہ بنیادی حقوق کی خلاف ورزی کے حوالے سے یورپ اور امریکا کی تنقید کو اب لائقِ توجہ نہیں سمجھتا۔ ہانگ کانگ اور تائیوان کے حوالے سے اُس نے جو رویہ اختیار کیا ہے اُس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اب کسی بھی سطح پر باضابطہ لڑائی کا چیلنج قبول کرنے کیلئے بھی تیار ہے۔

بہت سے ممالک میں میگنٹسکی قوانین اب چینی باشندوں پر اطلاق پذیر ہوتے ہیں۔ ان قوانین کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں اور

اور دیگر جرائم کی بنیاد پر روس اور چین کی ناپسندیدہ شخصیات کو مغربی ممالک میں داخل ہونے سے روکا جائے۔ان قوانین ہی کی مدد سے پیوٹن کے ایسے ایجنٹس کی امریکا میں آمد روکی گئی، جو اہم شخصیات پر قاتلانہ حملے کرنا چاہتے تھے۔یہی معاملہ برطانیہ کا بھی تھا۔

ایک اہم سوال یہ ہے کہ اس طرح کے اقدامات سے مغربی یونین کا کچھ بھلا ہوگا یا چین کو کچھ نقصان پہنچ سکے گا۔اب تک تو یہی ثابت ہوا ہے کہ ایسے اقدامات محض نمائشی نوعیت کے ہیں۔سنکیانگ میں بنیادی حقوق کی خلاف ورزیوں کے الزام کی بنیاد پر چینی کمیونسٹ پارٹی کے جن چار نچلے درجے کے عہدیداروں پر پابندیاں عائد کی گئی ہیں اُن کے مغرب میں اثاثے ہیں نہ وہ مغربی اداروں سے کسی طرح کا کاروباری لین دین کرتے ہیں۔دوسری طرف برطانوی وزیر اعظم نے سنکیانگ کے کمیونسٹ پارٹی چیف چین کوانگو کے خلاف پابندیاں عائد کرنے سے گریز کیا ہے جبکہ امریکا چاہتا ہے کہ چین کوانگو کے خلاف اقدامات کیے جائیں۔

کیا مغربی اور بالخصوص یورپی جمہوریتیں اتنی ہی بے بس ہوگئی ہیں؟ کیا اب وہ چین کے خلاف کچھ بھی کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہیں؟ایک اہم تجویز یہ ہے کہ روس اور چین کے غیر معمولی اثر ورسوخ کے حامل اور پالیسیوں کی تشکیل و تہذیب پر اثر انداز ہونے والے سیاستدان جو سوشل میڈیا پر مغربی جمہوریت کے خلاف غلط بیانی کے ذمہ دار ہیں، انہیں خاص طور پر نشانہ بنا کر سوشل میڈیا پر بھرپور منظم جوابی مہم چلائی جائے۔

چین اور روس نے سیاست کے حوالے سے اب تک چھاپہ ماروں کا سا انداز اپنایا ہے۔اب مغربی دنیا میں یہی انداز اپنانے کی بات کی جارہی ہے گویا یہ لڑائی میڈیا کے محاذ پر لڑی جائے گی۔امریکا اور یورپ میں یہ خواہش تیزی سے پروان چڑھ رہی ہے کہ ایسے ماہرین تیار کیے جائیں جو سوشل میڈیا پر چین اور روس کے ناپسندیدہ سیاستدانوں کو حتمی منزل بنا کر ان کے خلاف زیادہ سے زیادہ مواد پیش کریں۔اب میڈیا کے محاذ پر لڑائی تیز کرنے کی تجویز کو سراہا کو سراہا جارہا ہے۔امریکا اور روس کے درمیان یہ لڑائی کچھ مدت سے جاری ہے مگر اس میں وہ تیزی نہیں آئی جس کے بارے میں لوگ سوچ رہے تھے۔اب ایسا لگتا ہے کہ امریکی قیادت نے سوشل میڈیا کے ذریعے کچھ کرنے کی ٹھان لی ہے۔آثار گواہی دے رہے ہیں کہ پیوٹن اور اُن کے رفقائے کار کو بطور خاص نشانے پر لیا جائے گا تاکہ ایسے بیانیے تیار کیے جائیں جن کا مقصد روس کو زیادہ سے زیادہ جارح ثابت کرنا ہو۔یہ سب کچھ اس لیے ضروری سمجھا جارہا ہے کہ اب تک پیوٹن نے میڈیا کے محاذ پر غیر معمولی نوعیت کی کامیابی حاصل کی ہے۔

مغرب میں چینی صدر کے خلاف میڈیا مہم چلانے کی بات بھی اب زور دیکر کہی جارہی ہے کہ شی جن نے خالص آمرانہ انداز اختیار کرکے اپنے ہاں جمہوریت کے پنپنے کی راہ بالکل مسدود کردی ہے۔امریکا اور یورپ چاہتے ہیں کہ چین میں بھی لبرل ڈیموکریسی کو پروان چڑھنے کا موقع ملے۔شی جن نے غیر معمولی آمرانہ انداز کے ساتھ معاملات کو چلایا ہے۔ایسے میں لازم ہوگیا ہے کہ ان کے خلاف بھی سوشل میڈیا پر طاقتور اور وسیع البنیاد مہم چلائی جائے۔

اب ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا یورپی یونین اور برطانیہ کے پاس اتنی طاقت ہے کہ وہ روس اور چین کے خلاف میڈیا پر کوئی طاقتور مہم چلا سکیں۔اب تک کے تجربے سے یہ ثابت ہوا ہے کہ ان دونوں کے پاس معاملات کو بگڑتا ہوا دیکھ کر بے بسی سے ہاتھ ملنے کے سوا کوئی راستہ نہیں بچا۔اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ جرمنی کو ساتھ ملائے بغیر ڈھنگ سے کچھ بھی کرنا ممکن نہیں ہو پارہا۔جرمنی کا معاملہ یہ ہے کہ اس کی تمام اسٹیبلشمنٹ پارٹیز چاہتی ہیں کہ فی الحال روس اور چین کے معاملے میں احتیاط برتی جائے اور کوئی بھی ایسا قدم اٹھانے سے گریز کیا جائے جو براہِ راست تصادم کی طرف لے جاتا ہو۔اس کا مطلب

یہ ہے کہ یورپی یونین اور برطانیہ کو فی الحال جرمنی سے روس اور چین کے خلاف کچھ خاص مدد نہیں مل سکتی۔ برطانیہ اور باقی یورپ کی طرح جرمنی کو بھی اپنے معاشی مفادات عزیز ہیں۔ وہ چین کے خلاف ایسا کچھ بھی نہیں کرنا چاہتا جس سے برآمدات متاثر ہوں اور سرمایہ کاری کا گراف گرے۔

اس وقت جرمن قیادت کی کوشش ہے کہ معاشی معاملات کو سیاست کی چوکھٹ پر قربان نہ کیا جائے۔ سیاسی نظام کے آئیڈیلز کو مضبوط تر بنانے کے نام پر معاشی معاملات کو بربادی کی طرف دھکیلنے کی کوئی بھی کوشش جرمن قیادت کو گوارا نہیں۔ صورتِ حال کی نزاکت دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا زیادہ دشوار نہیں کہ یورپی یونین اور برطانیہ کو اب کچھ اور سوچنا پڑے گا۔ سب سے بڑھ کر کہ وہ جرمنی کے رحم و کرم پر تو روس اور چین کے خلاف کوئی بڑی میڈیا مہم چلا نہیں سکتے۔ ایسے میں انہیں امریکا کے ساتھ مل کر ہی کچھ کرنا ہوگا۔ امریکا اُن کا ساتھ کہاں تک دے سکے گا، یہ سوال بھی اہم ہے۔ امریکا کی اپنی بھی مشکلات اور مجبوریاں ہیں۔ امریکا اور یورپ کو اس وقت روس اور چین کے خلاف جو کچھ بھی کرنا ہے اُس میں دانش مندی کا دامن بھی تھامے رہنا ہے۔ محض جذباتیت کے ریلے میں بہہ کر کچھ کرنے سے ایسی خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں جن پر قابو پانا پھر کسی کے بس میں نہ ہوگا۔

بروز اتوار 23 ربیع الآخر 1443ھ 28 نومبر 2021ء

واخان راہداری کا کلیدی کردار

اب جبکہ امریکا اور اس کے اتحادیوں کی افواج افغانستان سے نکل چکی ہیں، تمام پڑوسی ممالک افغانستان سے اپنے تعلقات پر نظرثانی کر رہے ہیں۔ امریکی انخلاء کے بعد طالبان رہنماؤں کے دورۂ چین نے افغانستان کے حوالے سے چینی عزائم کے بارے میں بہت کچھ سوچنے کی دعوت دی ہے۔ زمین کا ایک ایک چھوٹی سی پٹی دونوں ممالک کے تعلقات کے حوالے سے کلیدی کردار ادا کر سکتی ہے۔ اس پٹی کے دونوں طرف مختلف النسل لوگ چھوٹا سا ٹکڑا، رہتے ہیں اور ان کے روابط گہرے ہیں۔

واخان راہداری کم و بیش 217 میل لمبی اور 9 میل چوڑی ہے جو افغانستان میں ختم ہوتی ہے۔ یہ راہداری افغانستان اور چین کی 47 میل لمبی سرحد پر محیط ہے۔ یہ راہداری 1895ء میں روس اور برطانیہ کے درمیان مذاکرات کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آئی تھی اور اسے دونوں سلطنتوں کے درمیان بفر زون کا درجہ حاصل تھا۔ اس کا نظم و نسق علامتی طور پر کابل کے امیر کو سونپا گیا تھا۔ اس راہداری کے شمال میں گورنو بدخشاں کا تاجکستانی علاقہ ہے جہاں 1990ء کی دہائی میں انتہائی خونریزی ہوئی تھی۔ اس راہداری کے جنوب میں عظیم تر کشمیر ہے جس پر پاکستان اور بھارت میں تنازعہ چل رہا ہے۔ واخان راہداری کے انتہائی مشرق میں برف پوش درّۂ وخجر کے پار چین کا صوبہ سنکیانگ ہے جس میں ترک نسل کے اویغور مسلم رہتے ہیں۔

واخان راہداری انتہائی پتھریلی اور دشوار گزار ہے اور شاید اسی لیے طالبان نے باقی افغانستان پر متصرف ہونے کے باوجود اس راہداری میں قدم جمانے میں دلچسپی نہیں لی۔ واخان راہداری کے مغربی حصے کے علاقے دریائے پنج میں طغیانی سے آنے والے سیلابوں کے حوالے سے شہرت رکھتے ہیں۔ دونوں طرف واضح ڈھلوان والی بے آب و گیاہ پہاڑیاں ہیں۔ مشرق کی سمت بڑھیں تو دریائے پنج سے نکلنے والی آبی گزرگاہیں چھوٹے اور بڑے پامیر کے افغان جو سخت ترموسمِ سرما اور متاثر کن بلندی کیلئے معروف ہیں۔ اس علاقے کیلئے 14 سال سے سیاحت کا نظم و نسق چلانے والی کمپنی کے مالک علاقے ہیں، جیمز ولکاکس کے مطابق ایسا دور افتادہ اور حواس باختہ کر دینے والا اجاڑ خطہ شاید ہی کہیں اور ہو۔

اس خطے کی ثقافتی تاریخ بھی کم حیرت انگیز نہیں۔ یہ دریائے پنج کے کنارے مغرب میں غیر استعمال ایک ایسا اسٹوپا ہے جو اب بدھ ازم کے پیروکاروں کے شاندار ماضی کی داستان سناتا ہے، جب چین کا معروف سیاح شوان زینگ یہاں آیا تھا۔ آٹھویں صدی عیسوی میں یہاں واقع سرحدِ بروغل کے دیہات سے ایک قلعہ تبت اور ٹینگ سلطنتوں کے درمیان انتہائی اہم تجارتی راہداری شاہراہِ ریشم پر تصرّف کیلئے ہونے والی لڑائی کا گواہ ہے۔ واخان راہداری بھی بالا شاہراہِ ریشم ہی کا حصہ رہی ہے۔

اس علاقے میں اسماعیلیوں کی اکثریت ہے، جن کے مکانات کی طرزِ تعمیر ایرانی فن و ثقافت کے واضح اثرات لیے ہوئے ہے۔ اس علاقے میں پائے جانے والے لوگ آج بھی سکندرِ اعظم کے گُن گاتے ہیں جو وسطِ ایشیا میں ہیرو کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کا جسدِ خاکی یہاں لایا گیا تھا تاکہ اس کنیز سے ملاپ ہو جس کے عشق میں وہ دیوانہ تھا۔ معروف سیاح مارکوپولو بھی اس راہ سے گزرا تھا۔ یہاں کی زبان نے اُس کی توجہ حاصل کی تھی۔ واخان راہداری کے لوگ آج ایرانی زبانوں کے گروپ سے تعلق رکھنے والے الفاظ سے تشکیل پانے والی زبان بولتے ہیں۔ مشرقی ایران سے تعلق رکھنے والی یہ زبان بدخشاں اور پامیری خطے سے تعلق رکھتی ہے، جس سے تعلق رکھنے والی نسل کے لوگ تاجکستان، پاکستان، افغانستان اور چین میں بسے ہوئے ہیں۔ پامیری نسل کے

رشتوں اور تجارت نے جوڑ رکھا ہے۔ منشیات اور قیمتی پتھروں کی تجارت زیادہ پرکشش ہے گو کہ اب چینی سرحد پر غیر معمولی نگرانی لوگوں کو روایات، کا نظام موجود ہے۔

امیر خورد اور پامیر بزرگ میں کرغیز نسل کے کم و بیش ایک ہزار افراد رہتے ہیں، جو ایک طویل مدت سے مشکلات سہتے آئے ہیں۔ بیسویں صدی کے دوران تیزی سے بدلے ہوئے حالات میں انہوں نے سال میں ایک بار پہاڑی علاقوں کی طرف جانے کے بجائے وہیں ڈیرے ڈالنے کا فیصلہ 2015ء سے 2019ء کے دوران کرغیز نسل کے ان لوگوں کے درمیان وقفے وقفے سے اچھا خاصا وقت گزارنے والے ماہر بشریات ٹوبیاز مارشل کا کہنا ہے کہ یہ لوگ اس گروپ کے بچے کھچے لوگ ہیں جس کی قیادت رحمن کل خان کے ہاتھ میں تھی۔ رحمن گل خان کو لوگ اب بھی جانتے ہیں۔ 1979ء میں پاکستان کیلئے ترک سفیر کی حمایت ملنے پر رحمن کل خان نے اپنے گروپ کے نصف ارکان کے ساتھ مغرب کی سمت خطرناک ہجرت شروع کی۔ ٹوبیاز مارشل کے مطابق ان میں سے بہت سوں نے وان نامی تالاب کے کنارے بود و باش اختیار کی، گو کہ بعد میں ان میں سے بہت سے پامیر کے علاقے میں واپس آباد ہوئے۔ اس پورے گروپ کو الاسکا میں آباد کرنے کی ایک تجویز بھی سامنے آئی تھی۔

اپریل میں پہلی بار تبدیلی کے باضابطہ آثار دکھائی دیے جب کرغیزستان کے صدر سید رجاپاروف نے نقل مکانی کے بعد کرغیزستان میں آباد ہونے والے کرغیز نسل کے ان لوگوں سے ملاقات کرکے تسلیم کیا کہ ان لوگوں نے بہت کچھ برداشت کیا ہے اور اب ان کی مشکلات کا خاتمہ ہونا ہی چاہیے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ان لوگوں کو ان کے آبائی وطن میں آباد کرنے کی خواہش ایک مدت سے میرے دل و دماغ میں بسی ہوئی ہے اور اب وقت آگیا ہے کہ اس حوالے سے واقعی کچھ کیا جائے۔ جولائی کے اوائل میں طالبان مغرب کی سمت آئے۔ اسٹریٹجک اہمیت کے باوجود واخان راہداری میں 14 ہزار یا اس سے کچھ ہی زیادہ لوگ آباد ہیں۔ طالبان کی آمد پر خوفزدہ ہونے کی بجائے لوگ یہ دیکھنے کیلئے گھروں سے نکل آئے کہ ان کے رہنما طالبان سے کیا بات کرتے ہیں۔ طالبان اور واخان راہداری کے لوگوں کے درمیان کچھ زیادہ گرم جوشی پر مبنی تعلقات نہیں رہے۔ اس خطے میں اچھا خاصا وقت گزارنے اور یہاں کی زبانیں بولنے والی سوزین لیوی سانچیز کا کہنا ہے کہ چند مقامی گھرانوں کے لوگوں نے قابض سوویت افواج کے خلاف لڑائی میں مجاہدین کا ساتھ دیکر عزت ضرور کمائی۔ ان میں کچھ لوگ آج طالبان قیادت کا حصہ بھی ہیں۔

واخان راہداری میں آباد لوگوں میں 80 فیصد اسماعیلی ہیں۔ یہ لوگ طالبان کی انتہائی نوعیت کی بنیاد پرستی میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے۔ مونا کو میں رہائش پذیر ارب پتی شاہ کریم الحسینی کیلئے اس علاقے میں غیر معمولی احترام پایا جاتا ہے۔ واخان راہداری میں بنیادی ڈھانچے کو بہتر بنانے، پوست کی کاشت گھٹانے، تعلیم اور سیاحت کو فروغ دینے پر انحصار سے متعلق آغا خان فاؤنڈیشن کے منصوبوں میں شاہ کریم الحسینی نے غیر معمولی فنڈنگ کی ہے۔ طالبان کی آمد نے واخان راہداری میں آباد لوگوں کو خوفزدہ کردیا ہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ اب ہوگا کیا؟ کیا بچوں کی تعلیم جاری رکھی جاسکے گی؟ کیا خواتین کو ملنے والے حقوق کی پاسداری ہوسکے گی؟ پامیر کے

علاقے میں آباد کرغیز نسل کے لوگوں میں تو اتنا خوف پایا جاتا ہے کہ طالبان کی آمد کی سُن گُن ملتے ہی اُن کا ایک گروپ واخانی چرواہوں کے ایک گروپ کے ساتھ تاجکستان بھاگ گیا، گو کہ کچھ ہی دنوں میں اُن میں بیشتر کو واپس بھیج دیا گیا۔ واپس آنے والے 200 افراد کہنا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ ان کے ملک مئی میں تاجکستان اور کرغیزستان کے درمیان معدنی وسائل پر اور کرغیزستان کے درمیان بڑھتی ہوئی کشیدگی کے باعث انہیں واپس بھیجا گیا ہو۔ تصرف کے تنازع میں خوں ریز جھڑپوں کے دوران دونوں ممالک کے کم و بیش 55 فوجی ہلاک ہوئے تھے۔

یونیورسٹی آف ایگزیٹر میں یوریشیائی امور کے ماہر جان ہیدرشا کہتے ہیں کہ لسانی یا نسلی بنیاد پر یکجہتی کا اظہار اس خطے میں بڑھتا جا رہا ہے۔ قومی سطح کی سوچ کا فقدان معاملات کو مزید بگاڑتا رہا ہے۔ کرغیز نسل کے لوگ بھاگ کر تاجکستان کے علاقے گورنو بدخشاں گئے تھے۔ 1990ء کی دہائی کے دوران اس علاقے میں انتہائی خوں آشام خانہ جنگ ہوئی تھی۔

2012ء اور 2014ء میں جنوب مغرب میں سرکاری فوج سے ان لوگوں کی جھڑپیں ہوئیں جو بشکیک کی اتھارٹی تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں یا اس حوالے سے تحفظات کے حامل ہیں۔ پامیر کے خطے میں قومی سرحدوں کے آر پار عوامی سطح کے تعلقات اتنے مستحکم ہیں کہ بہت سے تجزیہ کار اور محققین باضابطہ سرحدوں کو بھی ''فرنٹیئر زون'' قرار دیتے ہیں۔ 2012ء کے المناک واقعات کی ابتدا واخان راہداری کے داخلی حصے پر افغانستان اور تاجکستان کے درمیان واقع اشکاسم نامی قصبے میں ایک ہلاکت سے ہوئی تھی۔

سرحدوں کے دونوں طرف پائی جانے والی نسلی یکجہتی چین کو مضطرب کرتی ہے کیونکہ چینی صوبے سنکیانگ میں کروڑوں اویغور مسلمانوں کو کنٹرول کرنے پر غیر معمولی طاقت صَرف کی جا رہی ہے۔ کسی زمانے میں سنکیانگ کے باشندے واخان اور گورنو بدخشاں میں اپنے ہم زبان و ہم نسل لوگوں سے باآسانی مل لیتے تھے۔ طالبان ہی سہی، واخان راہداری پر تصرف مضبوط بنانا ہی اس مشکل کا واحد حل ہے۔

چین کی قیادت سنکیانگ کے مسلمانوں کے خلاف کریک ڈاؤن کیلئے انتہا پسندی کو ایک ٹھوس جواز کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ یہاں بھی تضاد نمایاں ہے۔ ایک طرف تو وہ سنکیانگ کے مسلمانوں پر انتہا پسندی کا الزام عائد کرتی ہے اور دوسری طرف طالبان سے معاملات طے کرنے میں اُسے کوئی الجھن محسوس نہیں ہوتی۔ اس نوعیت کے معاملات کم ہی افغانوں کو حیرت سے دوچار کرتے ہیں اور واخان راہداری کے لوگوں کو تو خیر یہ سب کچھ ذرا بھی حیرت انگیز نہیں لگتا۔ بیجنگ کم و بیش ایک عشرے سے واخان راہداری کے گرد عسکری اور سفارتی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہے۔ "پورے" سے بخوبی واقف افراد کا کہنا ہے کہ چینی سیکورٹی فورسز اس علاقے میں ایک عشرے سے بھی زائد مدت سے متحرک ہیں۔ 2012ء میں چینی قیادت نے اس علاقے کے بااثر خاندانوں کے بچوں کو چین کے مطالعاتی دورے کیلئے اسکالر شپس دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ بعد میں واخان راہداری کے سرے پر واقع درّۂ خنجر پر گہری نظر رکھی جانے لگی تاکہ سنکیانگ سے مسلمانوں کے فرار کی راہ مسدود کی جا سکے۔

چین ایک طرف تو طالبان کے ساتھ مل کر لڑنے والے اویغور مسلمانوں کی مذمت کرتا رہا ہے اور دوسری طرف اس نے اس بات کی تردید کی ہے کہ اس نے واخان راہداری سے متصل گورنو بدخشاں کے علاقے میں فوجی تعینات کر رکھے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ طالبان کے ساتھ مل کر لڑنے والے بہت سے اویغور مسلمان افغانستان میں ہیں۔ ویسے افغانستان سے براہِ راست چین میں داخل ہونا بہت مشکل ہے کیونکہ واخان راہداری کے مشرقی حصے کی غیر معمولی نگرانی کی جاتی ہے۔

چینی قیادت نے افغانستان کے گرد اپنا جال مزید وسیع کر دیا ہے۔ انٹرنیشنل کرمنل کورٹ میں دائر کی جانے والی ایک درخواست میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ تاجکستان ان ممالک میں شامل ہے جو اویغور مسلمانوں کو چین کے حوالے کرتے ہیں۔ چین اور تاجکستان کے درمیان اس حوالے سے ایک معاہدہ بھی ہوا ہے۔ تاجکستان اب چین، پاکستان اور افغانستان کے بہت نزدیک آچکا ہے۔ متعدد خاموش معاہدے چین اور وسطِ ایشیا کے ممالک کو مختلف منصوبوں کیلئے قریب تر لانے میں فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔ مئی میں چین کے بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے کے حوالے سے اعلیٰ سطح کا ایک اجلاس اس امر کا بیّن ثبوت ہے۔

واخان راہداری پر نظر رکھنا چین کی معاشی مجبوری بھی ہے۔ بحیرۂ جنوبی چین کے خطے میں بڑھتی ہوئی دشواریوں کے پیشِ نظر چینی قیادت نے پاکستان میں سرمایہ کاری کی ہے۔ شاہراہِ قراقرم کو بہتر حالت میں رکھنے کی کوشش کی جارہی ہے کیونکہ بحرِ ہند تک رسائی میں شاہراہ کلیدی کردار کی حامل ہے۔ شاہراہِ قراقرام انتہائی دشوار گزار راستوں سے گزرتی ہے 1960ء اور 1970ء کی دہائیوں میں اس شاہراہ کی تعمیر کے دوران ایک ہزار سے زائد مزدور اور انجینئر ہلاک ہوئے۔ خطے کی ساخت بہت پیچیدہ ہے۔ پُل تعمیر کرنے میں الجھنوں کا سامنا رہا ہے اور سرنگیں کھودنا بھی کبھی آسان نہیں رہا۔

خیر، شاہراہِ قراقرم کو تجارت کیلئے انتہائی موزوں بنانے میں حاصل ہونے والی کامیابی اور مثالی نوعیت کے پاک چین اشتراکِ عمل نے واخان راہداری سے جُڑے ہوئے درّہ و خجر پر بھی توجہ دینے کی گنجائش پیدا کی ہے۔ واخان راہداری کے اس ٹکڑے میں سڑک کی تعمیر افغانستان کی حکومت نے 2019ء میں شروع کی تھی۔ اس کا محض ایک حصہ ہی تعمیر کیا جاسکا ہے۔ یہ سڑک پامیر خورد تک جاتی ہے اور اس کی تعمیر سے الگ تھلگ پڑے ہوئے کرغیز نسل کے باشندوں اور واخان راہداری میں بسے ہوئے لوگوں کے درمیان تجارت آسان ہوئی ہے۔ اب تک اس امر کا کوئی ٹھوس اور واضح ثبوت نہیں ملا کہ چین نے اس سڑک کی تعمیر میں کوئی کردار ادا کیا ہے، اور نہ ہی طالبان نے چینی قیادت سے مذاکرات کے دوران ایسی کوئی ضمانت فراہم کی ہے کہ وہ اس خطے میں کسی شاہراہ کی تعمیر کو قبول کریں گے تاکہ تجارت کا دائرہ وسیع ہو۔

خطے کی بدلی ہوئی صورتِ حال میں ایک بات تو بہت واضح ہو کر سامنے آئی ہے اور وہ بات یہ ہے کہ وسطِ ایشیا کی بیشتر معیشتوں کو مضبوط رکھنے میں کلیدی کردار چین کا ہے۔ تاجکستان اس کی ایک واضح مثال ہے۔ بڑے پیمانے کی تجارت، برآمدات اور بیرونی سرمایہ کاری کے معاملے میں تاجکستان کا کم و بیش مکمل انحصار چین پر ہے۔ یہی سبب ہے کہ دونوں ممالک کے درمیان سرحدی تنازع بھی بہت حد تک ختم ہو چکا ہے اور چین نے تاجکستان کی کم و بیش ایک ہزار مربع کلومیٹر زمین بھی واپس کی ہے۔ چینی سرمایہ کاری کے حوالے سے افغانستان نسبتاً مزاحمتی مزاج کا حامل رہا ہے۔ میس اینک کے مقام پر تانبے کی ایک بڑی کان کا ٹھیکہ چینی کمپنیوں کے گروپ نے حاصل تو کیا مگر اس منصوبے پر کام رکا ہوا ہے۔ ہاں، مغرب کے بہت سے سرمایہ کاروں کیلئے چینی کمپنیوں نے ٹھیکیداروں کا کردار ضرور ادا کیا ہے۔ افغانستان میں حالات کی تباہ کن نوعیت بدلے بغیر اور بیرونی سرمایہ کاری کیلئے زیادہ سے زیادہ تحفظ کی ضمانت فراہم کیے بغیر چین اور افغانستان کے معاشی تعلقات میں نمایاں بہتری کا امکان نہیں۔ چینی انٹیلی جنس کے واخان راہداری کے ذریعے افغانستان تک رسائی ایک اچھا طریقہ ہے۔ چین کئی برس سے افغانستان میں اپنے مفادات کا زیادہ سے زیادہ تحفظ یقینی بنانے کیلئے کوشاں ہے۔ گزشتہ دسمبر میں کابل میں چین کے انٹیلی جنس نیٹ ورک کے تحت کام کرنے والا ایک گروہ پکڑا گیا تھا۔ واخان راہداری میں جو لوگ رہتے ہیں وہ خواہ کچھ چاہتے ہوں، یہ خطہ بڑی طاقتوں کے درمیان تناؤ کی کیفیت پیدا کرتا رہے گا کیونکہ اس راہداری پر متصرف ہونے میں بہت سوں کا بھلا ہے۔

بروز منگل 25 ربیع الآخر 1443ھ 30 نومبر 2021ء

دیتے ہیں دھوکہ یہ بازیگر کھلا

3نومبر 2020ء میں "ابراہیمی مذاہب کی اصطلاح.....عالمی سازش" کے عنوان سے میں نے آرٹیکل لکھا تھا جو آج بھی میری ویب سائٹ پر دیکھا جاسکتا ہے، اب ٹھیک ایک سال کے بعد اس مرتبہ کچھ زیادہ محنت اور نوک پلک سنوار کر اس موضوع کو مشقِ سخن بنایا جارہا ہے۔ دراصل اس سال فروری میں اسی موضوع پر انٹرنیشنل یونین آف مسلم سکالرز، مسلم سکالرز لیگ اور عرب مغرب لیگ نے ایک کانفرنس منعقد کی جہاں ابراہیمی مذہب پر چند علما نے اس خیال کا دفاع کیا اور اسے امن کا راستہ بتایا لیکن اب تک ابراہیمی مذہب کے وجود کا کوئی سرکاری اعلان نہیں ہوا۔ اس مذہب کے قیام کی بنیاد نہ تو کسی نے رکھی اور نہ ہی اس کے کوئی پیروکار موجود ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس کیلئے کوئی مذہبی متن بھی دستیاب نہیں۔ فی الحال اسے "مذہبی" منصوبہ سمجھا جاسکتا ہے۔ اس منصوبے کے تحت ماضی قریب میں اسلام، عیسائیت اور یہودیت مذاہب میں شامل مشترکہ پیغامات پر مبنی حضرت ابراہیم کے نام پر ایک مذہب بنانے کی کوششیں شروع کی گئی جس کا مقصد ان تینوں مذاہب میں شامل ایمان اور عقیدے سے متعلق تقریباً ایک جیسی باتوں پر انحصار کرنا ہے۔ اس کے علاوہ باہمی اختلافات کو بڑھانے والی چیزوں کو کوئی وزن نہ دیا جانا بھی اس میں شامل ہے۔ باہمی اختلافات سے بالاتر ہو کر عوام اور ریاستوں کے درمیان امن قائم کرنے کے مقصد سے بھی اس خیال کو فروغ دیا جارہا ہے۔

دراصل اس مذہب پر بحث کا اور اس سے منسلک تنازعات تقریباً ایک سال پہلے شروع ہوئے۔ اگرچہ لوگ اب بھی یہ سمجھنے کی کوشش کررہے ہیں کہ اب اچانک اس موضوع پر دوبارہ بحث شروع کرنے کی کیا وجہ ہے اور اس کے پیچھے کیا مقاصد پنہاں ہیں۔ بظاہر تو اسے تین بڑے عالمی مذاہب کے ماننے والوں یعنی اہل کتاب کو مشترکہ پیغامات پر اتفاق کرنے کی دعوت دی جارہی ہے اور اختلافات سے گریز کرنے کا کہا جارہا ہے لیکن ان موجودہ مذاہب میں اللہ سے شرک کو جو کبیرہ گناہ قرار دیا جارہا ہے، اس کو نکالے یا ختم کئے بغیر اتفاق کی راہ کیسے نکالی جاسکتی ہے۔ تمام مذاہب کی بنیاد توحید پر رکھی گئی ہے اور اس وقت دوسرا نبی یا رسول مبعوث نہیں ہوتا جب تک پہلے نبی کی لائی ہوئی شریعت یا تو مکمل طور پر ختم نہیں ہو جاتی یا وہ تعلیم مسخ ہو کر اصل تعلیمات کے منافی نہیں ہو جاتی۔

اس سلسلے میں الازہر کے شیخ کی طرف سے دی گئی تقریر میں مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان بقائے باہمی کی بات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ مصر کے شہر اسکندریہ جہاں عیسائیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، 2011 کے بعد پوپ شینوڈا تھرڈ اور الازہر کے ایک وفد کے درمیان بات چیت کے بعد مصر فیملی ہاؤس کے قیام پر غور کیا گیا تھا۔ دو مذاہب کے درمیان بقائے باہمی اور رواداری کے بارے میں بات کرنا قابل فہم اور توقع خیر بھی ہے۔ شیخ الازہر نے فیملی ہاؤس سے ابراہیمی مذہب کے حامیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ "وہ یقینی طور پر دو مذاہب، اسلام اور عیسائیت، کے درمیان بھائی چارے کی الجھنوں اور دونوں مذاہب کے انضمام کے بارے میں پیدا ہونے والے شکوک کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں"، لیکن اب ایک قدم اور بڑھ کر عیسائیت، یہودیت اور اسلام کو ایک مذہب میں ضم کرنے کی خواہش کا مطالبہ کرنے والے میدان میں اتر آئے ہیں (کہ وہ) تمام برائیوں سے نجات دلائیں گے لیکن کیسے ؟"

جس نئے مذہب کی بات کی جارہی ہے اس کا نہ تو کوئی رنگ ہے اور نہ ہی اس کا کوئی ذائقہ اور نہ بو گی۔ ابراہیمی مذہب کے حق میں مبلغین یہ کہیں گے کہ وہ لوگوں کے باہمی جھگڑوں اور تنازعات کو ختم کردیں گے لیکن درحقیقت یہ اپنی آزاد مرضی کے عقیدے اور ایمان کے انتخاب کی آزادی کی دعوت ہے

یایوں کہہ لیں کہ اس کی آڑ میں یہ نیا مذہب متعارف کروانے کی سازش ہے۔ اگر باہمی جھگڑوں اور تنازعات کو ختم کرنے کی بات ہے تو کیوں نہیں سب سے پہلے فلسطین کے مسئلے کو حل کرنے کیلئے اقدامات کئے جائیں جہاں یروشلم میں بیت المقدس کا شہر ان تینوں مذاہب کے ماننے والوں کو ہر روز اس خون خرابے کو ختم کرنے کی دعوت دے رہا ہے۔ اس نئے مذہب کے بانیوں کو اپنے اس نئے نوبل مقصد کو شروع کرنے کیلئے اس سے بہتر اور کون سا موقع مل سکتا ہے کہ وہ اپنے نیک ارادوں، خواہشات اور دنیا میں بقائے امن کیلئے اپنے کام کا آغاز اس سے شروع کریں۔ کیا اسرائیل اپنے ان تمام ناپاک عزائم یعنی گریٹر اسرائیل اور ہیکل سلیمانی کے ارادے سے باز آنے کا اعلان کرے گا؟ بیت المقدس تو تینوں مذاہب کیلئے ایک انتہائی محترم اور پاکیزہ مقام ہے، کیا ویٹیکن والے ان تینوں مذاہب کی نئی شکل "ابراہیمی مذہب" کو تسلیم کرنے کیلئے تیار ہیں؟ دوسروں کے عقیدے کا احترام کرنا ایک بات ہے اور اس عقیدے کو ماننا دوسری بات ہے۔ مختلف مذاہب کو ایک ساتھ لانے کی دعوت حقیقت اور فطرت کی صحیح سمجھ پیدا کرنے کے بجائے ایک پریشان کن خواب ہے۔ تمام مذاہب کے لوگوں کو اکٹھا کرنا ناممکن ہے۔

تاہم لوگوں کے دلوں میں یہ احتمال پیدا ہونا لازمی ہے کہ ابراہیمی مذہب دھوکے اور استحصال کی آڑ میں ایک سیاسی دعوت ہے جس کا مقصد اسرائیل کے ساتھ تعلقات کو خاص طور پر عرب ملکوں میں معمول پر لانا اور بڑھانا ہے۔ نئے مذہب کو مسترد کرنے والوں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اسے نظریاتی طور پر درست سمجھتے ہیں لیکن اسے خالصتاً ایک سیاسی کیمپ کے طور پر دیکھتے ہیں، لفظ "ابراہیمیہ" کا استعمال اور اس سے متعلق تنازعہ گزشتہ سال ستمبر میں متحدہ عرب امارات اور بحرین کے اسرائیل کے ساتھ رشتوں کو معمول پر لانے کے معاہدے پر دستخط کے ساتھ شروع ہوا تھا۔ امریکا اور اس وقت کے صدر ڈونلڈ ٹرمپ اور ان کے داماد اور مشیر جیرڈ کشنر کے زیر اہتمام اس معاہدے کو "ابراہیمی معاہدہ" کہا گیا۔ معاہدے پر امریکی محکمہ خارجہ کے اعلامیے میں کہا گیا تھا کہ "ہم تین ابراہیمی مذاہب اور تمام انسانیت کے درمیان امن کو آگے بڑھانے کیلئے بین الثقافتی اور بین المذہبی مکالمے کی حمایت کرنے کی کوششوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

یہ پیراگراف "نارملائزیشن آف کنڈیشنز ایگریمنٹ" کے ابتدائی حصے میں شامل ہے۔ اس معاہدے کے بانیوں نے بڑی محنت کے ساتھ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسرائیل کے ساتھ تعلقات کو معمول پر لانا خالصتاً سیاسی یا اقتصادی معاہدہ نہیں بلکہ اس کا ثقافتی مقصد بھی تھا۔ اس کے بعد ہی مختلف ممالک کے مختلف فرقوں کے لوگوں کے درمیان مذہبی رواداری اور باہمی مکالمے کے بارے میں بات چیت شروع ہوئی جو بعد میں "ابراہیمی مذہب" کے نام سے مشہور ہوئی۔

ٹرمپ نے معاہدۂ ابراہیمی کے ذریعے اسرائیل اور متحدہ عرب امارات کے درمیان تعلقات قائم کرا کے کوئی نیا یا انوکھا کام نہیں کیا، 1978ء اور 1979ء میں اس وقت کے امریکی صدر جمی کارٹر نے مصر کو اسرائیل کا وجود تسلیم کرنے پر راضی کیا تھا اور اس سلسلے میں کیمپ ڈیوڈ معاہدے پر اس وقت کے اسرائیلی وزیر اعظم مناہم بیگن اور مصر کے صدر انور سادات نے دستخط کیے تھے۔ اُس موقع پر جمی کارٹر نے کہا تھا "اچھا ہے کہ اب ہم جنگ کو ایک طرف رکھ دیں۔ آیئے، ہم ابراہیم

علیہ السلام کے بچوں کو نوازیں جو مشرقِ وسطیٰ میں جامع امن کیلئے ترس رہے ہیں۔اب ہم مکمل انسان، مکمل پڑوسی اور مکمل بہن بھائی بننے کی حقیقت سے لطف اندوز و سرفراز ہوں''۔

1993ء میں امریکی ایوانِ صدر میں اوسلو معاہدے پر فلسطینی لیڈر یاسر عرفات اور اس وقت کے اسرائیلی وزیر اعظم یزاک رابن کی طرف سے دستخط کیے جانے کے موقع پر امریکی صدر بل کلنٹن نے کہا تھا''اس موقع پر ہمیں یاد کرنا چاہیے کہ اب تمہاری سرزمین پر تشدد کی چیخ سنائی نہیں دے گی اور نہ ہی تمہاری سرحدوں کے اندر تباہی و بربادی ہوگی۔ابراہیم علیہ السلام کے بچے،اور اسحاق واسماعیل علیہم السلام کی اولادیں، مل کر ایک نئے جرأت مندانہ سفر پر نکلے ہیں۔آج ہم دل اور روح کی گہرائیوں سے دونوں کو مبارک باد دیتے ہوئے مکمل سلامتی کی نوید سناتے ہیں''۔

مگر ٹھیک ایک سال بعد 1994ء میں امریکا ہی کی وساطت سے اسرائیل اور اردن کے درمیان تعلقات معمول پر لائے جانے کے معاہدے پر دستخط کے وقت بل کلنٹن نے ابراہیم علیہ السلام کا حوالہ نہیں دیا تاہم یہ ضرور کہا کہ ''ایک نسل کے اس امن کے طلوع ہونے کے وقت اس قدیم مقام پر ہم تاریخ کی عظمت کے ساتھ ساتھ اسرائیلیوں اور اردنیوں کے مذہب کا بھی جشن منا رہے ہیں۔''ساتھ ہی ساتھ انہوں نے قرآن کی آیات اور یہودیت کی مقدس کتب کے حوالے بھی دیے تھے۔بل کلنٹن نے ضمنی طور پر ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا تھا جس پر اردن کے شاہ حسین نے کہا تھا''جب تک ہم زندہ ہیں تب تک اس دن کو یاد رکھیں گے اور اردنیوں،اسرائیلیوں، عربوں، فلسطینیوں اور ابراہیم علیہ السلام کی تمام اولاد اور اُن کی آنے والی نسلیں اس دن کو یاد رکھیں گی''۔1997ء میں جب شاہ حسین اور نیتن یاہو کے درمیان اختلافات نے شدت اختیار کی تو شاہ حسین نے ابراہیم علیہ السلام کا حوالہ دیتے ہوئے اُنہیں لکھا''سب سے تکلیف دہ حقیقت مجھ پر اس نکتے کا منکشف ہونا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی تمام اولاد کے درمیان حتمی نوعیت کی مفاہمت کے قیام کے فریضے سے سبکدوش ہونے کیلئے میں آپ کو اپنے ساتھ نہیں پا رہا ہوں''۔

ابراہیم علیہ السلام کا حوالہ دیے جانے کا تعلق چند برسوں کے دوران مغرب میں پروٹسٹنٹ اور استشراقیت پسند حلقوں کی وضع کردہ اصطلاح''ابراہیمی مذاہب''سے ہے،جو تین توحیدی مذاہب کو بیان کرنے کیلئے ہے جبکہ اس میں مسلمانوں کو غلط طور پر شامل کیا گیا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی روایات میں بھی ابراہیم علیہ السلام کا غیر معمولی مقام ہے تاہم''ابراہیمی مذاہب''کی اصطلاح نئی ہے۔یہ اصطلاح عربی کے علاوہ عبرانی میں بھی غیر معروف اور نامانوس ہے۔زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ انگریزی اصطلاح کا ترجمہ کر دیا جاتا ہے۔

اس نئے مذہب ابراہیمی کی آڑ میں اسرائیل کے ساتھ حالات کو معمول پر لانے کی کوششوں کو تیز کرنے اور فلسطین کے مسئلے کو مکمل طور پر بھول جانے کی واضح علامات موجود ہیں بلکہ اب تو خدشہ اس بات کا بھی بڑھ گیا ہے کہ "گریٹر اسرائیل" کے منصوبے کو درپردہ دوستی کے لبادے میں ہی آگے بڑھایا جائے گا۔میں اپنے کئی ایک ٹی وی پروگرامز اور مضامین میں گریٹر اسرائیل کی تمام وہ تفصیلات جو اسرائیل میں بچوں کو پڑھائے جانے والے نصاب میں شامل ہیں،آپ سے شئیر کر چکا ہوں۔کیا ہمارے یہ عرب حکمران اپنے اقتدار اور دولت کو بچانے کیلئے گریٹر اسرائیل سے ناواقف ہیں کہ یہودی اپنی سرحدیں کہاں تک بڑھانا چاہتے ہیں جس میں خاکم بدہن مدینہ منورہ بھی شامل ہے اور دوسری جانب شام،لبنان، عراق، مصر اور سوڈان سے آگے ان کی سرحدیں بنانے کا پروگرام ہے اور دوسری طرف مکار ہندو اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ بحر ہند کے کنارے جن ملکوں کو چھوتے ہیں،وہ دراصل مہابھارت کا حصہ ہیں اور یہ دونوں ریاستیں،یعنی یہود و ہنود کی سرحدیں آپس میں مل جائیں گی اور یہی ورلڈ آرڈر تشکیل دینے والے یہودی ہنری

کسینجر کا وہ مکروہ پلان ہے جس پر عملدر آمد جاری ہے۔ عراق ایران جنگ اور اس کے بعد مسلسل عرب بہار کے نام پر لیبیا اور دیگر ممالک کو تاراج کر دینا اسی پالیسی کا حصہ ہے جس میں بد قسمتی کے ساتھ چند عرب حکمرانوں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔

اب متحدہ عرب امارات پر سوشل میڈیا سائٹس پر ابراہیمی مذہب کی تشہیر شروع ہو چکی ہے۔ بہت سے لوگوں نے ابراہیمی مذہب سے متعلق کال کو ابراہیمی فیملی ہاؤس سے بھی جوڑا ہے جو 2019 کے اوائل میں دبئی کے حکمران محمد بن زاید نے ابو ظہبی میں "پوپ فرانسس اور شیخ الاظہر احمد الطیب کے مشترکہ تاریخی دورے کی یادگار" بنانے کے لیے قائم کرنے کا حکم دیا تھا۔ یہ اسرائیل کے ساتھ تعلقات کو معمول پر لانے کے معاہدے سے ڈیڑھ سال قبل ہوا تھا۔ ابراہیمی فیملی ہاؤس میں ایک مسجد، ایک چرچ اور یہودیوں کی عبادت گاہ بنائی گئی ہے، جسے 2022 میں عام لوگوں کیلئے کھولا جائے گا۔ اس کی تشہیر کرنے والوں میں متحدہ عرب امارات کی شیخ سلطان بن زید مسجد کے مولوی وسیم یوسف بھی شامل ہیں حالانکہ اس کو کویت کے مشہور مذہبی رہنما عثمان الخمیس نے شدید تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ "ابراہیمی معاہدے" پر دستخط اور 'نئے مذہب' کی بحث کے بعد مذہب اسلام کے علما اور رہنماؤں نے اسے مسترد کرنا شروع کر دیا ہے۔ طارق السویدان جیسے کچھ مذہبی رہنما نے اس کا موازنہ توہین رسالت سے کیا ہے۔ اس لئے یہ معاہدہ کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکے گا، اسے نہ تو عیسائی پیشوا ویٹیکن والے تسلیم کریں گے اور نہ ہی سخت گیر یہودیوں کا وہ ٹولہ جو اس وقت اسرائیل کو کنٹرول کر رہا ہے، اس کو تسلیم کرے گا کیونکہ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ دین ابراہیمی کے ماننے والے دونوں مذاہب عیسائی اور یہودی اپنی دینی تعلیمات میں ایک دوسرے سے نہ صرف شدید نفرت اور دشمنی رکھتے ہیں بلکہ برسوں برسرپیکار جنگوں میں کشت وخون بہاتے آئے ہیں رہ گئی بات اسلام کی تو اس سلسلے میں قرآن کے واضح احکام سے کوئی بھی روگردانی کر کے ایمان سے خارج ہونے کی جرات نہیں کر سکتا۔ بہت جلد یہی سازشی عناصر اپنے ہی ہاتھوں سے اس دین ابراہیمی کے غبارے کو پھوڑ دیں گے ان شاءاللہ۔ اللہ کے اس فرمان کو ایک مرتبہ غور سے پڑھ کر دل میں اتار لیں کہ میرے رب نے اس آت کو قرآن کی تین سورتوں میں من وعن نازل فرمایا ہے کہ

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ (سورۃ التوبہ:33، الفتح:28 الصف:9)

وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پورے کے پورے دینوں پر غالب کر دے خواہ مشرکین کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

بروز جمعۃ المبارک 28 ربیع الآخر 1443ھ 3 دسمبر 2021ء

ہم کیسے لُٹ گئے

میرا ماتھا اس وقت ٹھنکا جب میں نے حکومت کے اہم رکن، ملک کے سب سے بڑے صوبے پنجاب کے گورنر چوہدری محمد سرور صاحب کو یہ کہتے سنا کہ آئی ایم ایف نے چھ ارب ڈالر قرضے کے عوض پاکستان کا سب کچھ لکھوالیا ہے۔ یہ بیان کسی اپوزیشن لیڈر کی طرف سے نہیں آیا بلکہ مقتدر قوتوں کی طرف سے ایک کھلا اعتراف ہے جس کیلئے سوئی ہوئی قوم کو جگانے کیلئے برسوں سے ڈھول پیٹ کر اب ہاتھ بھی شل ہوتے جارہے ہیں کہ ہماری تباہی کا ساماں تیزی سے اکٹھا کیا جارہا ہے اور بالخصوص اس وقت خطے میں پاکستان کی عظیم معجزاتی اور جغرافیائی حقیقت کو ہمارے دشمن ہم سے زیادہ جان چکے ہیں۔ آیئے میں آپ کو تاریخی جھروکوں میں لئے چلتا ہوں تاکہ ہم ایک مرتبہ پھر مڑ کر اپنے جغرافیہ کی فکر کر سکیں۔

14/اگست 1947ء کو جب پاکستان دنیا کی سب سے زیادہ مسلم آبادی والی ریاست کی حیثیت سے نقشے پر ابھرا تو قائد نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو پہلا گورنر جنرل بنانے سے اس لئے انکار نہیں کیا تھا کہ وہ خود اس عہدے کے خواہاں تھے بلکہ اس لئے کہ اپنی قوم اور اقوام عالم کو سیاسی آزادی کی علامت کے طور یہ باور کروایا جائے کہ اب برطانوی راج ختم اور سلطانی جمہور کا زمانہ آگیا ہے اور ملک کے فیصلے ملک کے اندر ہوں گے۔ اس کے ایک سال بعد جب یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ آیا پاکستان کے طے شدہ تمام اثاثے پہلے کی طرح "ریزرو بینک آف انڈیا" میں جمع رہیں یا اس کا اپنا بینک ہو تو قائد اعظم نے فیصلہ کیا کہ آزاد ملک پاکستان کا اپنا آزاد بینک ہونا چاہیئے، اس طرح انہوں نے اقتصادی آزادی کا اعلان کرتے ہوئے اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے قیام کا اعلان کیا اور کراچی میں بولٹن مارکیٹ میں واقع تاریخی عمارت میں پاکستان کے پہلے اسٹیٹ بینک کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا کہ میں ایسا معاشی نظام نہیں چاہتا جس میں امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر ہو جائے۔ انہوں نے سودی نظام کو استحصالی نظام قرار دیتے ہوئے ماہرین اقتصادیات اور علمائے دین کو تلقین کی کہ وہ اسلام کے اصولوں پر مبنی بینکاری کے قیام کیلئے تحقیق اور غور و خوض کریں۔ انہوں نے سابقہ مشرقی پاکستان کی بندرگاہ چٹاگانگ میں استحصال کے خاتمے اور فلاحی مملکت کے قیام پر بھی زور دیا۔

انہوں نے پاکستان کی خارجہ پالیسی کے بارے میں رہنما اصول متعین کرتے ہوئے فرمایا: پاکستان دنیا کے ہر ملک سے برابری کی بنیاد پر دوستانہ تعلقات کا خواہاں ہے لیکن ساتھ ہی مظلوم قوموں کی حمائت بھی جاری رکھے گا۔ یہ صرف سیاسی بیان نہیں تھا بلکہ قائد اعظم نے فلسطین، جنوبی افریقا اور انڈونیشیا کے عوام کی جدوجہد آزادی کی کھل کر برملا حمائت کی، نسلی امتیاز اور نوآبادیات کے خاتمے کیلئے قرار واقعی اقدامات بھی کئے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ صرف مسلم ممالک کی آزادی کے حامی تھے تو جنوبی افریقا کی اکثریت تو غیر مسلم تھی تو پھر انہوں نے اس کی حمائت کیوں کی؟ قائد اعظم نے پاکستان کے قبائلی علاقوں میں سلطنت برطانیہ کے زمانے سے تعینات فوج کو ان کی چوکیوں سے واپس بلالیا اور کہا کہ اب ہمارے قبائلی بھائی ہماری شمال مغربی سرحد کی حفاظت کریں گے لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ 60 سال بعد کوئی خود ساختہ محافظ پاکستان امریکی قصر سفید میں بیٹھے فرعون کے حکم پر ان ویران چوکیوں پر جو کھنڈر بن چکی تھیں، پھر فوج تعینات کر دے گا جیسے برصغیر کے برطانوی آقاؤں نے حریت پسندوں کی بستیوں پر سامراج کی گرفت مضبوط کرنے کیلئے کر رکھا تھا جہاں سیاسی ایجنٹ چیدہ چیدہ قبائلی سرداروں کو رشوت دیکر ان کی وفاداریاں خرید لیتے تھے۔

یہ کاروبار اس وقت اپنے عروج پر پہنچ گیا جب ایک آمر نے اپنے غاصبانہ اقتدار کو طول دینے کیلئے چند ڈالروں کے عوض قبائلی عوام کو کچلنے کیلئے امریکی سی آئی اے کو وہاں اڈے بنانے کی اجازت دے دی۔ اس سے قبل خود ساختہ یا مغرب ساختہ دختر مشرق (مغرب) نے امریکی خفیہ پولیس ایف بی آئی کو

پاکستان کی سرزمین پر تھانے قائم کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ کیا یہ ستم ظریفی نہیں کہ قائدِ اعظم تو انگریز گورنر جنرل گوارہ کرنے کو تیار نہیں تھے اور ایک ایک کر کے نو آبادیات کی باقیات کو مٹاتے جا رہے تھے جبکہ ان کی وفات کے تقریباً نصف صدی کے بعد آنے والے حکمران استعمار کے غیر ملکی گماشتوں اور جاسوسوں کی میزبانی کرتے رہے اور نوبت بہ ایں جا رسید کہ یہ ڈکٹیٹر اپنے عوام سے خاص کر غیور قبائلیوں سے اس قدر خائف ہو گیا کہ اپنے غاصبانہ قبضے کو بچانے کی خاطر غیر ملکیوں صہیونی و صلیبی عناصر کو گلے لگانے اور خود کو محفوظ رکھنے کیلئے اپنے ہی عوام، اپنے دین، اپنے اعتقادات اور اپنے نظریات سے خطرہ محسوس کرتے ہوئے غیر ملکی ایجنٹ اور غیر اسلامی نظریات کو درآمد کرنا شروع کر دیا۔

قائدِ اعظم کی 11/اگست کی تقریر کا بعض لوگ اس طرح حوالہ دیتے ہیں کہ جیسے انہوں نے زندگی میں پہلی بار یہ تقریر کی ہے اور ان کی باقی تقاریر منسوخ ہو گئیں۔ یہ لوگ قائدِ اعظم کے متعدد بیانات کو نظر انداز کر دیتے ہیں جن میں انہوں نے واضح طور پر تواتر اور تکرار کے ساتھ یہ واضح کر دیا تھا کہ پاکستان ایک اسلامی فلاحی ریاست ہو گی، ساتھ ہی قوم کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ اسلام میں پاپائیت یا برہمنیت جیسا کوئی طبقہ نہیں ہے جسے ریاست کی اجارہ داری کا کوئی پیدائشی حق حاصل ہو۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قائدِ اعظم ایک سیکولر ریاست چاہتے تھے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انہوں نے پاکستان کا مطالبہ محض اس لئے کیا تھا کہ برصغیر میں دو سیکولر ریاستیں ہوں ایک پاکستان اور دوسری اس کے پڑوس میں ہندوستان؟ پھر دو ریاستوں کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اگر پاکستان حق خود ارادیت کے نتیجے میں وجود میں آیا تو اس میں اور بھارت میں اسلام کا عنصر انہیں ایک دوسرے سے ممیز کرتا ہے۔ کون اس تاریخی حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ برصغیر کے مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں نے جذبہ یگانگت کے تحت مطالبہ پاکستان کی حمائت کی تھی، لہٰذا یہ کہنا کہ مطالبہ پاکستان کی عوامی حمائت کے محرکات معاشی تھے، قطعاً غلط ہے کیونکہ مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو قیام پاکستان سے کون سے معاشی فوائد کی توقع تھی؟ وہ تو بیچارے ہندو اکثریت کے یرغمال بن گئے، البتہ میں ان جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی نیّتوں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا جنہوں نے راتوں رات یونینسٹ پارٹی چھوڑ کر حکمران مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی تاکہ ان کی مراعات باقی رہیں۔

میں بھارت سے نقل مکانی کرنے والے ان مفاد پرستوں کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا جو حصول جائیداد مال و دولت اور جاہ و حشم کے لالچ میں پاکستان آئے بلکہ پاکستان کی ایک لسانی جماعت کے اکثر رہنما ایسے بھی ہیں جو قیام پاکستان کے موقع پر ہندوستان میں ہی مقیم رہے۔ اس بات کا جائزہ لیتے رہے کہ پاکستان کے معاشی اور سیاسی حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔ اپنے کاروبار اور دوسری تمام املاک کو اچھے داموں فروخت کر کے پاکستان میں مہاجر کا لیبل لگا کر پاکستانی مایہ میں خوب ہاتھ رنگے۔ پاکستان کی بیوروکریسی کے توسط سے پاکستان کی نوکر شاہی اور دوسرے ملکی اہم اداروں میں کالے انگریزوں کی طرح بطور حکمران قابض ہو گئے اور آج کھلے عام ملک کی لوٹ کھسوٹ کے علاوہ پاکستان کیلئے اپنے بزرگوں کی قربانی کا ذکر بھی بڑی بے شرمی کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان مذکورہ طبقات کے محرکات یقیناً معاشی تھے لیکن خود پاکستان میں بسنے والے کروڑہا عوام نے اسلامی جذبے سے سرشار ہو کر جدوجہد پاکستان میں اپنا کردار ادا کیا تھا۔ ان میں کتنے کٹ مرے، کتنی عصمتیں لٹ گئیں لیکن ان کے پائے استقلال میں ذرہ بھر بھی لغزش نہ آئی۔

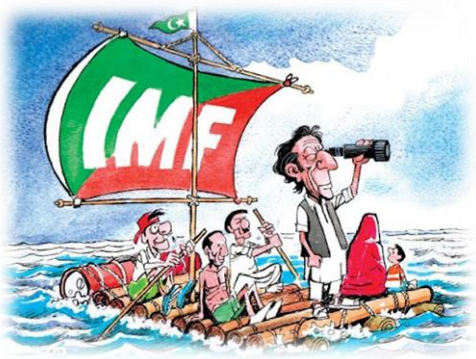

ذرا پیچھے مڑ کر مشرقی پنجاب ہی کو دیکھ لیں جہاں سوا لاکھ سے زائد مسلمان بچیاں ہندوؤں اور سکھوں نے اغوا کر لیں اور آج بھی یقیناً آسمان کی طرف منہ اٹھا کر نجانے کس حال میں پاکستان کی سلامتی کیلئے دعا گو ہوں گی۔ یہ جذبہ ایمانی نہیں تھا تو اور کیا تھا؟ اس کی پشت

پر کربلا کی روایت تھی،اس کی آکسیجن تحریک خلافت کا نظریہ تھا۔ کیا مسلم عوام نے جس وطن کیلئے اتنی قربانیاں دیں،وہ اس لئے کہ ان کے ملک پر امریکا اور آئی ایم ایف کا تسلط قائم ہو جائے،ان کو ان اداروں کا ایک ادنیٰ سا اہلکار یہ بتائے کہ چین سے تعلقات کو لپیٹنا اور سی پیک کو گول کرنا ہو گا۔ کیا قائد اعظم محمد علی جناح نے پاکستان کے اثاثے "ریزرو بینک آف انڈیا" سے نکال کر اس لئے اسٹیٹ بینک آف پاکستان میں رکھے تھے کہ سٹی بینک کا ایک مینیجر درآمد کر کے اس ملک کا وزیر اعظم بنا دیا جائے جو پاکستان کے قومی اثاثوں کو اونے پونے داموں میں فروخت کر کے اپنا کمیشن کھرا کر کے رات کے اندھیرے میں گم ہو جائے ؟اور اس کو وزیر اعظم بنانے والا ملک کے تمام اداروں کی موجودگی اور دن کے اجالے میں سینہ پھلائے ملک سے باہر چلا جائے ؟

کیا قائد اعظم نے کشمیر میں استصواب رائے عامہ کی حمایت اس لئے کی تھی کہ کوئی طالع آزما آکر یہ کہے کہ اب رائے شماری سے متعلق سلامتی کونسل کی دادیں غیر ضروری ہو گئی ہیں اور نیا پاکستان اور اس کو مدینہ ریاست بنانے والے خود کو کشمیر کا وکیل کہہ کر ساری قوم کو کشمیر کے بارے میں تمام قرار جہاد سے منع کر دے اور ہر جمعہ ایک گھنٹہ کے احتجاج کا اعلان کر کے 15 منٹ کیلئے فوٹو سیشن کیلئے باہر نکلے اور اس کے بعد اپنے ہی کہے پر عمل نہ کرے !

جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں ذکر کیا گیا ہے۔ قائد اعظم نے قبائلی بستیوں سے فوج ہٹائی لیکن کمانڈو مشرف نے نہ صرف فوج کشی کر دی اور ایک لاکھ دس ہزار فوج پاک بھارت سرحد سے ہٹا کر قبائلی علاقوں اور افغان سرحد پر لگا دی اور وہ بھی قصر سفید کے فرعون کے حکم پر ! پاکستان کو بیرونی حملے سے بچانے کیلئے نہیں بلکہ مقبوضہ افغانستان میں امریکی پٹھو حکومت کو افغان عوام پر مسلط کرنے کیلئے تاکہ افغانستان پر امریکا کا غاصبانہ قبضہ مضبوط ہو لیکن اب تاریخ اتحادیوں کے منہ پر کالک مل کر جو فیصلہ سنایا ہے، کیا یہ مقام عبرت نہیں ہے ؟امریکا اپنے 70 اتحادیوں کی افواج، جدید ترین نے ان تمام غاصبوں اور اسلحے اور ٹیکنالوجی کے ساتھ بیس سال تک ناک رگڑتا رہا اور بالآخر خاک چاٹ کر لوٹنا پڑا اور اب بھی اپنی شکست کی ندامت کو چھپانے کیلئے مداخلت سے باز نہیں آرہا۔

مودی سرکار کو سلامتی کونسل کا صدر بنانے میں ووٹ دینا اور صدارت کی کرسی پر بیٹھتے ہی سلامتی کونسل کے اجلاس میں پاکستان کو مدعو نہ کرنا اور ہمارا صرف احتجاج کرنا کس بات کی چغلی کھاتا ہے ؟مقبوضہ کشمیر کے معاملے پر مجرمانہ خاموشی کیا بھارت سے تمام متنازعہ امور پر کوئی خفیہ مفاہمت ہو چکی ہے جو حکومت نے بھارت کو سلامتی کونسل کی صدارت کیلئے ووٹ دیکر اپنی وفاداری کا ثبوت دیا تھا؟اگر ایسا نہیں ہے تو آج تک اس جرم عظیم کی تفصیلات قائد اعظم کی وفات کے چھ سال بعد ہی نوکر شاہی نے اپنی سرزمین پر امریکا کو فوجی اڈے دے دیئے جہاں سے سوویت یونین کیوں سامنے نہیں آسکیں ؟ کے خلاف جاسوسی پروازیں جاری رہیں جس کے باعث روس نے کھل کر پاکستان کو اپنا دشمن سمجھتے ہوئے پاکستان کو دولخت کرنے میں اپنا کردار ادا کیا اور ہر مرتبہ کشمیر میں رائے شماری کی قرارداد کے خلاف حق تنسیخ استعمال کر کے اسے کالعدم بنا دیا۔اسی طرح مشرقی پاکستان سے فوجوں کی واپسی کی قرارداد کو بھی منسوخ کر کے بھارتی فوج کو مشرقی پاکستان پر قبضہ کرنے اور اسے بنگلہ دیش بنانے کا بھرپور کردار ادا کیا۔

قائد اعظم نے فرمایا تھا کہ ملک میں جمہوریت ہو گی اور ہر صوبے کو اندرونی خود مختاری حاصل ہو گی جبکہ ان کے جانشینوں نے مشرقی پاکستان کو آبادی کے تناسب سے نمائندگی دینے سے انکار کر دیا اور مغربی پاکستان کے صوبوں کا وجود ختم کر کے ایک اکائی بنا دیا، جب صوبے ہی نہ رہے تو پھر صوبائی خود مختاری کیسی ؟لیکن اندر ہی اندر علیحدگی پسندی کی آگ سلگتی رہی جو مشرقی پاکستان میں آتش فشاں بن کر پھٹ پڑی اور صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان تک پھیل گئی۔

اس طرح پاکستان کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا گیا اور استعمار کے گماشتے اس کے ٹوٹنے کا ذکر کرنے لگے اور اپنے شیطانی دماغوں سے اس کے نقشے بنانے لگے۔ یہ خبیث اور شیاطین ٹولہ، پاکستان کی نفرت میں اتنے اندھے ہو گئے کہ یہ تک نہ دیکھا کہ وہ امریکا جس کی چاکری میں ہم نے عمر گنوادی، 168 بلین ڈالر کے خطیر نقصان کے ساتھ ساتھ 70 ہزار افراد کی جانوں کی قربانی دی، امریکا کی لگائی ہوئی آگ اب تک ہمارے گھروں کو خاکستر کرنے کی کسی بھی کوشش سے باز نہیں آرہی، جس نے ہمارے ازلی دشمن کو نہ صرف سول ایٹمی مواد فراہم کر کے اسے علاقے کا تھانیدار بنانے میں اسے گود میں لے لیا اور افغانستان سے انخلاء میں ایک اہم کردار ادا کرنے کے باوجود اب باقاعدہ ہندوستان کا اپنا اسٹریجک پارٹنر ڈکلیئر کرنے کے اعلان سے پاکستان سے کھلم کھلا دشمنی پر اتر آیا ہے، اسی امریکا کی لگائی ہوئی آگ سے اپنے گھر کو محفوظ بنانے کیلئے پہلی مرتبہ افغانستان کے ساتھ ڈھائی ہزار کلو میٹر طویل سرحد کے ساتھ ساتھ خاردار تار اور 373 سرحدی چوکیاں تعمیر پر کروڑوں ڈالر خرچ کرنے پڑ گئے جبکہ اس سے پہلے ہماری یہ سرحد اس قدر محفوظ تھی کہ ہمیں ایک فوجی بھی کھڑا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ آزادی کا یہ لمحہ قوم کیلئے لمحہ فکریہ ہے، یہ ہمیں ترغیب دے رہا ہے کہ ہم تحریک پاکستان کے جذبے اور عزم کو از سر نو زندہ کریں اور ملک کو ہر قسم کے استعمار کے تسلط سے آزاد کرائیں چاہے وہ کسی بھی شکل ہم پر حکومت کر رہا ہو۔ گورنر پنجاب کے اس بیان کے بعد ساری قوم کا یہ مطالبہ ہونا چاہئے کہ آئی ایم ایف کے ساتھ کیا گیا معاہدہ پارلیمنٹ میں لایا جائے اور میڈیا کے ذریعے ساری قوم کے سامنے لایا جائے کہ ہمیں کس نے کتنے داموں میں فروخت کر دیا ہے۔ آیئے اپنی وعدہ خلافی پر اجتماعی طور پر اللہ سے استغفار کرتے ہوئے اس بات کا عزم کریں کہ پاکستان بنانے کیلئے ہم نے اپنے رب سے قرآن کو نافذ کرنے کا جو "اوفو بالعہد" کیا تھا، اس پر عملدرآمد کرنے میں اپنی تمام توانائیاں صرف کریں اور ان عہد شکنوں کو ان کے بیرونی آقاؤں کے ساتھ ہی حتمی انجام تک پہنچائیں۔ انشاءاللہ

بروز اتوار یکم جمادی الاوّل 1443ھ 5 دسمبر 2021ء

مجھے خوف آرہا ہے

اسلام میں جتنی تاکید کے ساتھ انسان کے قتل کی حرمت کو بیان کیا گیا ہے، عصر حاضر میں اس کی اتنی ہی بے حرمتی ہو رہی ہے۔ معمولی باتوں پر قتل ناحق کے واقعات روزانہ اخباروں کی سرخیاں بنتے ہیں۔ افسوس! بعض مسلمان تو اس جرم کا ارتکاب دینی خدمت سمجھتے ہیں حالانکہ قرآن وحدیث میں کسی انسان کو ناحق قتل کرنا پوری انسانیت کے قتل کے مترادف ہے۔

سیالکوٹ کی ایک فیکٹری میں مشتعل ہجوم کے ہاتھوں سری لنکن مینجر پریانتھا پر بہیمانہ تشدد کر کے اسے جان سے مار ڈالا اور بعد ازاں اس کی لاش کو گھسیٹ کر بازار میں لیجا کر آگ لگادی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ یہ جلنے والی لاش سری لنکن کی نہیں، اس ملک کے مستقبل کی ہے، اس ریاست کی ہے، اس سماج کی ہے اور اس معاشرے کی ہے۔ بدنصیبی تو یہ ہے کہ اس سری لنکن کو بچانے کی بجائے کثیر تعداد اس ہولناک دلدوز واقعہ کی سیلفی بنا رہے تھے۔ اس سارے مجمعے میں صرف ایک شخص پر تشدد ہجوم کے سامنے ہاتھ جوڑ کر ان کو منع کرتا نظر آیا اور دوسرا شخص تو اس سری لنکن کے اوپر لیٹ بھی گیا تھا لیکن اسے گھسیٹ کر دور پھینک دیا گیا۔ آپ دیکھ لیں گے کہ یہ سیلفی تاریخ انسانی کی سب سے بدترین سیلفی تصور کی جائے گی اور اسے شائد لاکھوں ڈالرز میں فروخت کر کے کسی بڑے عجائب گھر کی زینت بنایا جائے گا کہ کیسے بائیس کروڑ انسانوں کا ملک ایک شر پسندانہ مذہبی فکر نے یوں نگل لیا کہ اس کو بھاگنے کا وقت بھی نہ ملا۔ ہم نے یہ بھی نہ سوچا کہ سری لنکا دنیا کا واحد ملک ہے جو پاکستانیوں کو آنکھیں عطیہ کرتا ہے اور اب تک 22 ہزار پاکستانیوں کو مفت آنکھیں فراہم کر چکا ہے اور جس دن اس کے شہری کو آگ لگا کر جلایا جا رہا تھا، اسی دن ہم نے سری لنکا سے مزید 62/افراد کیلئے آنکھیں وصول کیں۔

مشتعل ہجوم کے ہاتھوں سری لنکن مینیجر پریانتھا کے قتل نے ایسے سوالات کو جنم دیا ہے کہ ایسے واقعات میں ملزمان کی شناخت کیسے ہوتی ہے اور آیا قانون کے مطابق انہیں سزائیں دی جاتی ہیں۔ اس ویڈیو میں جو افراد سری لنکن شہری پر یانتھا پر تشدد کر رہے ہیں اور اسے جان سے مار رہے ہیں وہ سب نظر آرہے ہیں۔ اس کے علاوہ فیکٹری کے اندر کی سی سی ٹی وی فوٹیج سے بھی یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ پریانتھا کے ساتھ اس سارے تنازع کی بنیاد کس نے رکھی۔ اس دن کون کون ڈیوٹی پر موجود تھا اور اس وقت جب یہ تنازع شروع ہوا تو کس نے کیا کردار ادا کیا تھا۔ نجانے مجھے اس بہیمانہ قتل پر میرے سارے دکھ ایک مرتبہ پھر تازہ ہو گئے ہیں۔

سابق گورنر پنجاب سلمان تاثیر کو انہی کے محافظ ممتاز قادری نے گولیوں سے بھون دیا تھا، تو پاکستان میں لوگوں کی رائے منقسم تھی کہ ممتاز قادری کو ہیرو مانا جائے یا قاتل۔ سلمان تاثیر کے قتل کے ایک ماہ بعد اس قانون کی مخالفت پر مذہبی اقلیتوں کے وزیر شہباز بھٹی کو بھی اسلام آباد میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ جب 2016 میں سلمان تاثیر کے قاتل ممتاز قادری کو سزائے موت دی گئی تو ان کے جنازے میں لاکھوں لوگوں نے شرکت کی۔ 2017 مردان کی عبدالولی خان یونیورسٹی میں شعبہ ابلاغیات کے طالب علم مشال خان پُر تشدد ہجوم کے ہاتھوں قتل ہوئے تو یہ سب مناظر کیمرے کی آنکھ نے محفوظ بھی کئے۔ بعد میں اس واقعے کی تصاویر اور ویڈیوز سوشل میڈیا پر وائرل ہو گئیں۔ گزشتہ برس پشاور ہائی کورٹ نے مشال خان قتل کیس میں مرکزی ملزم عمران علی کی سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کر دیا ہے اور باقی تمام ملزمان کو رہا کر دیا گیا ہے۔

2010 میں سیالکوٹ کے نواحی علاقے بٹر میں پولیس کی موجودگی میں بہت سے لوگوں نے دو سگے بھائیوں حافظ مغیث اور منیب کو رسیوں سے باندھا اور اس کے بعد دونوں بھائیوں پر ڈنڈوں سے تشدد کر کے انھیں ہلاک کر دیا۔ ہجوم نے دونوں بھائیوں کی لاشوں کو پہلے الٹا لٹکایا اور بعد میں ان بھائیوں کی لاشوں کو شہر میں گھمایا۔ ان دو بھائیوں کے قتل کے ذمہ داران کو سنائی جانے والی سزائے موت کو گزشتہ برس سپریم کورٹ نے عمر قید میں بدل دیا۔

2015 میں لاہور کے یوحنا آباد کے علاقے میں مسیحی برادری کی دو عبادت گاہوں پر بم دھماکوں کے بعد مشتعل علاقہ مکینوں نے احتجاج کے دوران شک کی بنیاد پر نعمان اور حافظ نعیم پر تشدد اور بعد ازاں تیل چھڑک کر آگ لگا دی گئی۔ پولیس نے ایک طویل تفتیش کے بعد 40 سے زائد ملزمان پر انسدادِ دہشتگردی سمیت قتل اور دیگر کئی دفعات کے تحت مقدمات درج کئے تھے۔ شنید یہ بھی ہے کہ اس سلسلے میں بیرونی ممالک کے جمہوریت پسند اور انسانی حقوق کے چیمپئن بھی ان عیسائیوں کو رہائی دلوانے کیلئے کافی متحرک ہو گئے تھے۔ بعد میں لواحقین نے اس مقدمے میں صلح کر لی، جس کے بعد ایک نئی بحث چھڑ گئی کہ ایسے واقعات میں صلح کی بھی گنجائش ہوتی ہے۔

مارچ 2019 میں گورنمنٹ صادق ایجرٹن کالج بہاولپور میں شعبہ انگریزی کے ایسوسی ایٹ پروفیسر خالد حمید کو اسی کالج کے بی ایس انگریزی پروگرام کے پانچویں سمسٹر کے طالب علم خطیب حسین نے اسٹاف روم میں چھری کے پے در پے وار کر کے قتل کر دیا اور آج پونے تین سال کے بعد عدالت نے اسے سزائے موت کا حکم دیا ہے۔ ہمارے ملک میں وکلاء کو معاشرہ کا سب سے زیادہ معزز اور پڑھا لکھا طبقہ مانا جاتا ہے لیکن وکلاء گردی کے عدالتوں میں جاری واقعات اور معاشرہ کے مسیحا ڈاکٹرز کی دھینگا مشتی کا ذکر تو انتہائی قابل شرم ہے۔ آخر ہم کس طرف چل پڑے ہیں؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کیلئے اپنے رسول، اصحابہ کرام اور قرآن سے وابستگی ایمان کا حصہ ہے اور یہ بڑا جذباتی عمل ہے لیکن اس نازک اور حساس معاملے کی آڑ میں پاکستان میں ایک خطرناک ڈاکٹرائن متعارف کروادی گئی ہے۔ وہ افراد جو اس ظالمانہ کھیل کا حصہ بن رہے ہیں، اور جو اپنے اس فعل پر بڑے فخریہ بیانات دیکر ہیرو بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ سختی کے ساتھ ایسے تمام افراد کے ساتھ اس خطرناک ڈاکٹرائن کو بھی پھانسی دی جائے اور اس عمل کے فیصلے کیلئے عدلیہ کی کمزوریوں کو بھی فوری دور کر کے تیز ترین اور انتہائی کم وقت میں جاندار فیصلے کئے جائیں۔ اگر ایسا فوری نہ کیا گیا تو مجھے اس بات کا خوف ہے کہ کہیں کوئی نیا ہلاکو خان ہم پر مسلط نہ کر دیا جائے۔

وَمَن يَّقْتُلْ مُؤْمِناً مُّتَعَمِّداً فَجَآاؤُه جَهنَّمُ خَالِداً فِيه وَغَضِبَ الله عَلَيه وَلَعَنه وَاَعَدَّ له عَذَاباً عَظيماً

اور جو شخص کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اللہ اس پر غضب نازل کرے گا اور لعنت بھیجے گا اور اللہ نے اس کے لئے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

بروز منگل 3 جمادی الاوّل 1443ھ 7 دسمبر 2021ء

قوم منتظر ہے

ان مردوں کے ہاتھوں، عورتوں کے ساتھ ہونے والے جنسی مظالم اب کس سے ڈھکے چھپے ہیں؟ لاہور سیالکوٹ موٹروے پر اپنے معصوم بچوں کے سامنے لٹ جانے والی ماں ہو یا میر والاں کی دھول اڑاتی سڑک پر مختاراں مائی، ان سب کی بے بسی کا نوحہ آج تک پڑھتے چلے آرہے ہیں۔ ڈیرہ بگٹی کی تاریک راتوں کو ڈاکٹر شازیہ کی کرب ناک چیخیں اب بھی ہم سب کو یاد ہیں، یہی قضیہ بعد ازاں اکبر بگتی کے قتل پر منتج ہوا۔ پنچایت کے حکم پر تسلیم سولنگی پر چھوڑے گئے کتوں کی غراہٹ خیر پور کے چوباروں میں اب تک مسلسل گونجتی ہے کہ وہاں کے سرداروں نے اسے اپنے قبیلہ کے رسم ورواج کا نام دیکر قانون سازی تک نہیں ہونے دی اور پوری قوم کو متنبہ کیا کہ ہمارے معاملات میں دخل دینے کی کوئی جرات نہ کرے، خیبر پختون خوا کے باغیرت لوگوں نے ڈیرہ اسمعیل خان سے تعلق رکھنے والی شاداں کی تذلیل سے چھ سال پہلے بھی وہ سنسان دوپہر دیکھی، جب ایک بیٹے کے جرم کی سزا میں ماں کو بے لباس کر کے سڑکوں پر گھسیٹا گیا لیکن زمین پھٹی نہ آسمان لرزا۔ کس کس کو روئیں ٹوبہ ٹیک سنگھ کی شازیہ کے ساتھ ہونے والے ظلم پر سر پیٹیں یا گوجرانوالہ کی صبا کا غم منائیں یا پھر معصوم زینب کے ساتھ جو کچھ ہوا، جس نے ساری دنیا میں ہمیں رسوا کر دیا۔ تیزاب سے جھلسے چہروں کا کرب پڑھیں یا غیرت کے نام پر قتل ہونے والیوں کا ماتم کریں۔

پاکستان میں عورتوں کے اکثریت میں ہونے کے باوجود، کیا یہاں آج تک کوئی ایسا واقعہ رونما ہوا ہے کہ عورتوں نے آپس کے جھگڑے میں کسی بے گناہ مرد کو بے لباس کر کے سڑکوں پر گھمایا ہو۔ کبھی سنا کہ جرگے کی بااثر عورتوں نے کسی مظلوم مرد کی اجتماعی عصمت دری کا فرمان جاری کیا ہو۔ کسی زمیندارنی نے اپنے بیٹے کا قرآن سے نکاح کروادیا ہو، بہنوں نے بھائی کی پیشانی پر بندوق رکھ کر جائداد میں سے اس کا حق معاف کروالیا ہو؟ کبھی نہیں! آخر کیوں، یہ واقعات عورتوں کے ساتھ ہی کیوں پیش آتے ہیں۔ تعداد میں مردوں سے زیادہ ہونے کے باوجود عورتوں پر ہی ظلم کے یہ پہاڑ کیوں توڑے جاتے ہیں۔ مقامِ حیرت ہے کہ مردانہ اقلیت زنانہ اکثریت پر اس قدر حاوی ہو چکی ہے کہ اکثریت کی جان، مال، عزت آبرو سب بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔

سنا تھا، جہاں انسان بستے ہیں وہاں سے درندے ہجرت کر جاتے ہیں، وجہ تو اب سمجھ آئی ہے کہ انسان نما درندوں کے سامنے حقیقی درندے بھی رکنے کا خطرہ مول نہیں لیتے۔ عورتوں کے معاملے میں تو یہ شیطان صفت اور انسان نما درندے ہر گز اکیلے نہیں ہوتے بلکہ نام نہاد مذہبی اور معاشرتی روایتیں ان کی پشت ٹھوکنے کو ساتھ کھڑی ہوتی ہیں۔ یوں یہ انفرادی ہو کر بھی اجتماعی گناہ قرار پاتا ہے۔ اس کی سزا بھی معاشرے کے تمام تماش بینوں کو ملنی چاہیے اور سب سے پہلے ان کو ملنی چاہیے جنہوں نے اپنی بیٹیوں کو تو غیرت کا درس رٹوایا لیکن بیٹوں کی صورت میں درندوں کو مزید توانا کیا۔ ان درندوں کی تربیت کون کرے گا؟ اب کون یہاں قابل اعتبار رہا؟

حال تو یہ ہے کہ کبھی خود کو ایک مذہبی عالم کہلانے والے چلتی گاڑی میں گارڈز کی موجودگی میں ایک نوجوان لڑکے کے ساتھ اپنا شوق پورا فرماتے ہوئے ویڈیو بھی بنواتے ہیں، تو کبھی دوسرے نسوانی حسن کی پوجا میں مدہوش بلکہ غرق پائے جاتے ہیں، بلکہ موجودہ حکومت کے بہت بڑے حامی مفتی قوی کا حریم شاہ کے ساتھ ٹک ٹاک تو بہت شہرت حاصل کر چکا ہے جس کے بعد ان کے اپنے بیٹوں نے میڈیا سے درخواست کی کہ ان کے والد کے کسی قول و فعل کو ان سے نہ جوڑا جائے اور دوسری طرف منافقت کا یہ عالم ہے کہ ایک دینی مدرسے کے سربراہ ہونے کا بھی برملا اعلان کرتے ہیں جس سے تمام

دینی مدارس کے بارے میں ہم غلط تصورات قائم کر لیتے ہیں۔ پھر یہ نہیں بلکہ اسلام کے اور بہت سے ٹھیکے داروں کے موبائل فونزاور لیپ ٹاپ میں بھی وہی ننگی فلمیں پائی جاتی ہیں، جن کو دیکھ دیکھ کر مردوں نے اب فلمی دنیا سے باہر بھی مظلوم عورتوں کے جسم سے لباس نوچنے شروع کر دیئے ہیں، اور وہ کہ جن بے چاریوں کو بچپن سے ہی سکھایا گیا کہ مرد کے سامنے زبان کھولنا تو بڑی بے شرمی کی بات ہے، حیران ہیں کہ اب کریں تو آخر کیا؟ کس سے گلہ کریں؟ کس سے منصفی چاہیں؟ اس ظلم کی بنیاد تو یہاں کے ایک ڈکٹیٹر فاسق کمانڈو کے ایک قابل نفرت بیان نے رکھ دی تھی جس میں اس نے انتہائی بے شرمی سے یہ بیان دیا کہ یہ عورتیں دراصل مغرب میں سیاسی پناہ کیلئے یہ تمام ڈرامے رچاتی ہیں۔

کیا ہم اب لاہور کے علاقے ٹاؤن شپ میں واقع یتیم اور بے سہارا بچیوں کے "کاشانہ ویلفیئر ہوم" کو بھی بھول جائیں جسے آج بھی پنجاب حکومت کے محکمہ سوشل ویلفیئر کی زیر نگرانی چلایا جاتا ہے۔ کاشانہ ویلفیئر ہوم میں رہنے والی لڑکیوں کی عمریں پانچ سال سے لے کر 18 سال تک ہیں۔ نومبر 2019 میں ٹاؤن شپ لاہور میں واقع یتیم اور بے سہارا بچیوں کے مرکز کاشانہ کی سابق سپرنٹنڈنٹ افشاں لطیف نے الزام عائد کیا تھا کہ کاشانہ میں کم عمر لڑکیوں کی زبردستی شادیاں کرائی جاتی ہیں اور صوبائی وزیر اجمل چیمہ بھی بچیوں سے ملتے تھے جس میں سابق سپرنٹنڈنٹ بھی ملوث تھی۔

افشاں لطیف نے یہاں ہونے والے غیر قانونی اقدامات اور حکومتی اہلکاروں کے ظلم و ستم کو بے نقاب کرنا شروع کیا تو اس پر کیا کیا ظلم و ستم نہیں ڈھائے گئے۔ اس کے ڈرانے دھمکانے کیلئے اس کے گھر پر مسلح افراد کے حملوں سے لیکر اس پر مقدمات کی بھرمار کر دی گئی، اس کو پاگل قرار دینے کیلئے پاگل خانے کا راستہ بھی دکھانے کی کوششیں کی گئی۔ افشاں لطیف کا شانہ سکینڈل کی گواہ کائنات جسے قتل کر دیا گیا، اس کی فرانزک پوسٹ مارٹم رپورٹ میڈیا کو دینے باہر گئی، تو کاشانہ ویلفیئر ہوم میں چھپے مسلح افراد اس کے گھر میں گھس گئے اور جب وہ موقع پر پہنچنے والی پولیس کے کہنے پر مقدمہ دائر کرنے کیلئے ایف آئی آر درج کروانے گئی تو متعلقہ تھانہ اس پر ہونے والے مظالم پر باوجود شواہد پیش کرنے کے کوئی مقدمہ درج کرنے سے انکاری ہے۔ اعلیٰ حکومتی و سرکاری عہدیدران کی جانب سے ہونے والے غیر قانونی اقدامات کو بے نقاب کرنے والی افشاں لطیف اب بھی اپنے سچ پر ڈٹی ہوئی ہے لیکن پنجاب پولیس اور دیگر ادارے افشاں لطیف کے الزمات کا جواب دینے کی بجائے اس کو ہراساں کرنے کیلئے تمام غیر قانونی اقدامات اختیار کر کے اس کو ہمیشہ کیلئے خاموش کرنے کیلئے اپنے آقاؤں کی خدمت بجالانے میں سر گرم ہے۔ آپ کب تک سچ کا گلہ دبا کر مدینہ ریاست کے نعرے کے پیچھے چھپتے رہیں گے؟ اب تو آڈیو اور ویڈیو نے بھی میدان کو کافی گرم کر دیا ہے۔ سپریم کورٹ متعدد وزرائے اعظم کو نااہل کر چکی ہے۔ عدلیہ کے ریکارڈ پر ایک وزیر اعظم کی پھانسی کا فیصلہ بھی موجود ہے۔ اس وقت عدلیہ کے دو اعلیٰ ججز پر ان متنازع اقدامات آڈیوز پر عوامی سطح پر کافی غم و غصہ دیکھا جا رہا ہے۔ اسلام آباد ہائیکورٹ میں سابق چیف جسٹس ثاقب نثار کی آڈیو ٹیپ اور عدلیہ پر دیگر الزامات کی تحقیقات کیلئے کمیشن بنانے کی درخواست دائر کر دی گئی جس میں کہا گیا ہے کہ سابق چیف جسٹس سے منسوب آڈیو ٹیپ سے تاثر ملتا ہے کہ عدلیہ بیرونی قوتوں کے دباؤ میں ہے۔ اس بدنامی کو دور کرنے اور نیک نامی کیلئے کب اقدامات اٹھائے جائیں گے۔ اب معاشرہ تبدیل ہو رہا ہے۔ قوم منتظر ہے۔

بروز جمعرات 5 جمادی الاوّل 1443ھ 9 دسمبر 2021ء

خوشی کا راز

یوں تو ہر روز بے شمار ای میلز اور سوشل میڈیا پر پیغامات موصول ہوتے ہیں جو بعض اوقات عدیم الفرصتی کی بناء پر پڑھنے سے قاصر رہتا ہوں لیکن ایک نوجوان کا پیغام پڑھنے کو ملا جس میں وہ اپنے ادھیڑ ماں باپ سے شکوہ کناں ہے کہ "میرے والدین ادھیڑ عمر ہیں اور اکثر و بیشتر وہ مجھ سے خفا رہتے ہیں حالانکہ میں انکو ہر وہ چیز مہیا کرتا ہوں جس کا وہ مطالبہ کرتے ہیں"۔ میں نے مناسب سمجھا کہ کیوں نہ اس پر اپنی بساط کے مطابق کچھ لکھا جائے تاکہ اس سے اور نوجوان بھی استفادہ کریں جن کو ایسی شکائت ہے۔ میں ایسے تمام افراد سے مخاطب ہوں جو اس پریشانی میں مبتلا ہیں اور اس کو پڑھ کر دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیں کہ وہ کہاں تک اپنے بوڑھے والدین کے ساتھ انصاف میں کوتاہی برت رہے ہیں۔

بوڑھے والدین کی ناراضگی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ جب وہ مانگتے ہیں اور آپ ان کو لا کر دیتے ہیں۔ شائد آپ کو یہ بات سمجھ نہ آئے تو میں اس کی مزید وضاحت کر دیتا ہوں۔ کیا کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ جب تم دنیا میں نہیں آئے تھے تو تمہارے آنے سے پہلے ہی تمہارے والدین نے تمہارے لئے ہر چیز تیار کر رکھی تھی۔ تمہارے لئے کپڑے، تمہاری خوراک کا انتظام، تمہاری حفاظت کا انتظام، تمہیں سردی نہ لگے اگر گرمی ہے تو گرمی نہ لگے۔ تمہارے آرام کا بندوبست تمہاری قضائے حاجت تک کا انتظام تمہارے والدین نے تمہاری دنیا میں آنے سے پہلے ہی کر رکھا تھا۔ تمہارے لئے خود سے زیادہ بہتر جوتے، کپڑے، کھلونے، تمہاری پہلی سائیکل، تمہارا پہلا موٹر سائیکل، تمہارا پہلا اسکول، تمہاری بول چال، تمہاری تربیت تمہارا رہن سہن، چال چلن رنگ ڈھنگ، گفتگو کا انداز..... یہاں تک کے تمہارے منہ سے نکلنے والا پہلا لفظ تک تم کو تمہارے ماں باپ نے مفت میں سکھایا اور تمہارے مطالبے کے بغیر سکھایا ہے۔ اگر خدانخواستہ تم کبھی بیمار پڑ گئے تو کندھوں پر اٹھا کر ڈاکٹروں کی مہنگی فیسوں اور ادویات کا بوجھ اٹھاتے ہوئے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں دعائیں اور صدقے واری جاتے ہوئے صدقے دیتے ہوئے تم سے کبھی نہیں پوچھا اور تمہاری صحت یابی اور کامیابی کیلئے راتوں کو اٹھ اٹھ کر اپنے رب کے حضور سجدوں میں آہ وزاری کرتا رہا لیکن اس نے ساری عمر تم کو ایک مرتبہ بھی نہیں جتایا۔

پھر آگے چلو..... کیا تمہارے والدین نے کبھی تم سے پوچھا تھا کہ بیٹا تم کو سکول میں داخل کروائیں یا نہیں۔ تمہارے اسکول جانے اور تمہارا بستہ اٹھانے کیلئے خوشی خوشی اپنے کندھے پیش کئے، تمہیں معلوم ہی نہیں کہ تمہارے اسکول کے تمام اخراجات اٹھانے میں کس قدر محنت کر کے خوشی محسوس کرتے رہے۔ اسی طرح تمہارے سکول کی ٹرانسپورٹ کیلئے تمھارے یونیفارم کیلئے تمہارے والد صاحب نے کبھی تم سے نہیں پوچھا ہو گا بلکہ اپنی استطاعت کے مطابق بہتر سے بہتر چیز تمہارے مانگنے سے پہلے ہی تمہیں لا کر دی ہو گی۔ تمہاری تعلیم میں کوئی کمی نہ آئے، اس کیلئے خصوصی ٹیوشن کیلئے اسے اضافی محنت بھی کرنا پڑی لیکن تمہیں اپنی تھکاوٹ کے بارے میں محسوس بھی نہیں ہونے دیا۔

مجھ کو تھکنے نہیں دیتا یہ ضرورت کا پہاڑ
میرے بچے مجھے بوڑھا نہیں ہونے دیتے

اسی طرح کالج یا یونیورسٹی میں داخلے کیلئے تم سے کبھی پوچھا ہو بلکہ تمہارے بہتر مستقبل کیلئے تم سے پہلے ہی سکول اور کالج میں داخلے کا بندوبست کر دیا ہو گا اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ تمہیں بہترین سواری بھی مہیا کی ہو گی کہ تمہیں گرم سرد موسم میں چلنے میں کوئی تکلیف محسوس نہ ہو۔ تمہیں تو شاید اس کا بھی احساس نہ ہو کہ جب تم نے جوانی میں قدم رکھا تھا تو تمہارے والدین نے تمہارے لئے ایک اچھی لڑکی بھی ڈھونڈنی شروع کر دی ہو گی جو اچھی طرح

تمہاری خدمت کر سکے اور تمہارا خیال رکھ سکے۔ لڑکی تلاش کرتے ہوے بھی ان کی اوّلین ترجیح تمہاری خدمت ہی ہو گی بلکہ ان کے تو ذہن میں کبھی یہ خیال بھی نہیں آیا ہو گا کہ ہم ایسی دلہن بیٹے کیلئے لائیں جو ہماری خدمت بھی کرے اور ہمارے بیٹے کی بھی بلکہ مجھے یہ کہنے دو کہ تم نے جب ان کی تمام خواہشات کو روندتے ہوئے خود ہی اپنا جیون ساتھی تلاش کر کے ان سے مطالبہ کیا ہو گا تو انہوں نے معمولی پس و پیش کے بعد تمہارا دل نہیں توڑا ہو گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ تمہاری اس خواہش کو پورا کرنے کیلئے انہیں اپنی ساری جمع شدہ پونجی خرچ کر کے مزید قرض بھی اپنے بوڑے کندھوں پر اٹھایا ہو گا اور آج تم کہتے ہو کہ جو کچھ وہ مجھ سے مانگتے ہیں میں ان کو لا کر دیتا ہوں اس کے باوجود وہ خفا رہتے ہیں۔

جاؤ والدین کو بن مانگے دینا شروع کرو، ان کی ضروریات کا خیال اپنے بچوں کی ضروریات کی طرح کرنا شروع کرو۔ اگر ان کی مالی مدد نہیں کر سکتے تو ان کو اپنا قیمتی وقت دو، ان کی خدمت کرو، گھر کی ذمہ داریاں خود لو۔ جیسے اپنے بچوں کے باپ بنے ہو ویسے ہی اپنے والدین کی نیک اولاد بنو، اور ان کی خواہشات کو بن مانگے پورا کرنا شروع کرو۔

اپنے آپ کو اس قابل بنالو کہ ان کو تم سے مانگنے کی یا مطالبے کی ضرورت ہی نہ پڑے، یا ان کو کبھی تمہاری کمی محسوس ہی نہ ہو، کم سے کم اتنا وقت تو ان کو عطا کر دو، ان کے مسائل خود پوچھو، وہ تم کو بتانے میں اگر حجاب محسوس کریں تو ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر محبت سے ضد کر کے ان سے پوچھو، اگر ان کی مالی مدد نہیں کر سکتے تو ان کی خدمت کرو، وہ کبھی بھی تم پر ناجائز بوجھ ڈالنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ دنیا میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ جب ڈاکٹر نے بیٹے سے بیمار باپ کیلئے قیمتی انجیکشن خریدنے کیلئے کہا تو باپ نے خاموشی سے ڈاکٹر کے کان میں سرگوشی سے کہا کہ میرا بیٹے کی استطاعت نہیں کہ وہ یہ قیمتی ٹیکا خرید سکے، تم مجھے کوئی پانی کا ٹیکا لگا دو کہ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

کیا کبھی ماں یا باپ کے پاؤں کی پھٹی ہوئی ایڑیاں دیکھیں ہیں تم نے؟؟ باپ نے تمہارے نئے جوتوں کیلئے خود کئی سال جوتا تبدیل نہیں کیا، لیکن اس کے باوجود سردیوں گرمیوں میں نجانے کتنی بار تمہارے پاؤں خود اپنے ہاتھوں سے دھو کر اس پر مختلف قسم کی کریم لگا کر موزے پہنائے ہوں گے۔ کیا کبھی باپ کے پاؤں دبائیں ہیں حالانکہ تمہارے باپ نے تمہیں بہت دفعہ دبایا ہو گا۔ کیا کبھی تم نے اپنے ادھیڑ ماں باپ کی پھٹی ہوئی ایڑیوں میں کوئی کریم یا تیل لگایا ہے جیسے وہ تم کو چھوٹے ہوتے وقت لگاتے تھے؟؟ کیا کبھی ماں یا باپ کے سر میں تیل لگانے کا لطف اٹھایا ہے تم نے، کیونکہ جب تم بچے تھے تو وہ باقاعدہ تمہارے سر میں تیل لگا کر کنگھی بھی کرتے تھے، تمہاری ماں تو سردیوں کی راتوں کو تمہارے چہرے اور ہاتھوں پر ویسلین بھی لگاتی تھی تاکہ تم خشک سردی کے عذاب سے بچ سکو تمہارے بال سنوارتی تھی کبھی ماں کے بال سنوار کر تو دیکھو۔

کیا کبھی ماں یا باپ کیلئے ہاتھ میں پانی یا تولیہ لے کر کھڑے ہوئے ہو جیسے وہ تمہارا منہ بچپن میں نیم گرم پانی سے دھویا کرتے تھے۔ کچھ کرو تو سہی..... ان کو بغیر مانگے لا کر دو..... ان کو پوچھے بغیر لا کر دو..... ان کی ذمہ داریاں اٹھا کر دیکھو..... ان کو وقت دے کر دیکھو.....

ان کی خدمت کر کے دیکھو.....ہمیشہ ان کو اپنے ساتھ رکھو.....ان کو اپنے آپ پر بوجھ مت سمجھو نعمت سمجھ کر دیکھو..... جس طرح انہوں نے تم کو بوجھ نہیں سمجھا بغیر کسی معاوضہ کے تمہاری دن رات پرورش کر کے معاشرے کا ایک کامیاب انسان بنایا ہے۔ کم سے کم ان کی وہی خدمات کا صلہ سمجھتے ہوئے ان سے حسن سلوک کا رویہ اختیار کرو۔ پھر دیکھنا وہ بھی خوش اور اللہ بھی خوش۔ پھر تمہیں کبھی اپنے ادھیڑ ماں باپ سے یہ گلہ نہیں ہو گا کہ وہ مجھ سے خوش نہیں رہتے۔

ہم نے کبھی ملک الموت کی آواز پر غور ہی نہیں کیا کہ وہ ہر روز ہمارے گھر کے دروازے پر کھڑا ہو کر یہ منادی کرتا ہے کہ "میں تمہارے گھر میں بار بار آتا رہوں گا، یہاں تک کہ تم میں سے کسی کو بھی باقی نہ چھوڑوں گا۔" یہ الفاظ اس کے ہیں جو ہر گھر، ہر عالیشان محفل اور ہر اس جگہ آتا ہے جہاں کوئی متنفس رہتا ہے۔ دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں جس کے پاس ملک الموت نے نہیں آنا۔ ہر ایک کے پاس آنا ہے، شاہ و گدا کے پاس بھی، امیر و غریب کے پاس بھی ، صحت مند اور بیمار کے پاس بھی، نبی اور ولی کے پاس بھی، کوئی حاجب و دربان، کوئی چوکیدار اور پہرے دار اور کوئی تالہ و دروازہ اسے اندر جانے سے نہیں روک سکتا۔

حافظ ابن ابی الدنیا نے نقل کیا ہے کہ سیدنا حسن بصری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ملک الموت ہر گھر میں تین مرتبہ روزانہ چکر لگا کر دیکھتے ہیں کہ کس کا رزق پورا ہو گیا، کس کی مدت عمر پوری ہو گئی۔ جس کا رزق پورا ہو جاتا ہے۔ اس کی روح قبض کر لیتے ہیں اور جب اس کے گھر والے اس کی موت پر روتے ہیں تو ملک الموت دروازے کی چوکھٹ پر کھڑے ہو کر کہتے ہیں۔ "میرا کوئی گناہ نہیں۔ مجھے تو اسی کا حکم دیا گیا ہے۔ واللہ! میں نے نہ تو اس کا رزق کھایا اور نہ اس کی عمر گھٹائی، نہ اس کی مدت عمر سے کچھ حصّہ کم کیا۔ میں تمہارے گھروں میں بار بار آتا رہوں گا یہاں تک کہ تم میں سے کسی کو بھی باقی نہیں چھوڑوں گا۔"

سیدنا حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اگر میت کے گھر والے ملک الموت کا کھڑا ہونا دیکھ لیں اور اس کا کلام سن لیں تو اپنی میت کو بالکل بھول جائیں اور اپنے اوپر رونا شروع کر دیں۔ مولانا روم کیا خوب فرما گئے کہ "انسانیت محبت کا مرکز ہے اور محبت انسانیت کی معراج ہے، اگر میرا علم مجھے انسان سے محبت کرنا نہیں سکھاتا تو ایک جاہل مجھ سے ہزار درجہ بہتر ہے۔" اگر عام انسان سے محبت کا یہ صلہ ملتا ہے تو ماں باپ تو آپ کی دنیا اور اخروی زندگی کی نجات کا وسیلہ ہیں۔

یاد رکھیں کہ کتابِ زندگی کے ورق برابر الٹ رہے ہیں ہر آنے والی صبح ایک نیا ورق الٹ دیتی ہے یہ الٹے ہوئے ورق بڑھ رہے ہیں اور باقی ماندہ ورق کم ہو رہے ہیں اور ایک دن وہ ہو گا جب ہم اپنی زندگی کا آخری ورق الٹ رہے ہوں گے، جونہی آنکھیں بند ہوں گی یہ کتاب بھی بند ہو جائے گی اور ہماری یہ تصنیف محفوظ کر دی جائے گی..... کبھی غور کیا اس کتاب میں ہم کیا درج کر رہے ہیں، روزانہ کیا کچھ لکھ کر ہم اس کا ورق الٹ دیتے ہیں ہمیں شعور ہو یا نہ ہو ہماری یہ تصنیف تیار ہو رہی ہے اور ہم اس کی ترتیب و تکمیل میں اپنی ساری قوتوں کے ساتھ لگے ہوئے ہیں اس میں ہم وہ سب کچھ لکھ رہے ہیں جو ہم سوچتے ہیں دیکھتے ہیں سنتے ہیں اور سناتے ہیں اس میں صرف وہی کچھ نوٹ ہو رہا ہے جو ہم نوٹ کر رہے ہیں، اس کتاب کے مصنف ہم خود ہیں۔ ذرا سوچیں..... غور کریں کہ ہم اپنی کتابِ زندگی میں کیا درج کر رہے ہیں.....! اگر اس کتاب کے کسی صفحے پر ماں باپ سے یہ شکائت درج ہوئی تو پھر کیا ہو گا؟

کوشش کریں کہ زندگی کی اس کتاب کا ہر صفحہ ماں باپ کے مسکراتے چہرے سے روشن ہو اور یہ اسی صورت میں ممکن ہو گا کہ اپنے والدین کی ڈیمانڈ سے پہلے ہی ان کی ضروریات کو جانتے ہوے پایہ تکمیل تک پہنچا دیا جائے۔ کیا میرا رب آپ کو بن مانگے عطا نہیں کر رہا، کیا میرے رب نے آپ پر نعمتوں کی بارش کر کے کسی کو بتایا ہے، آپ اپنے ماں باپ کی خواہشات کی تکمیل اور ان کی خوشی کیلئے جو کچھ خرچ کریں گے، کیا وہ مال اسی اللہ کا دیا ہوا نہیں جس نے ماں باپ کی خدمت کو فرض قرار دیتے ہوئے ان کی ناراضگی کو اپنی ناراضگی سے تعبیر کیا ہے۔ یقین کریں جب آپ ان کی ضروریات کو ان کے کہے بغیر پورا کر کے ان کے سامنے رکھیں گے تو ان کی آنکھوں کی چمک اور دمکتا چہرہ آپ کو ایسی نعمتوں، خوشیوں اور دعاؤں میں شرابور کر دے گا جو آپ کو دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی اور اطمینان کی بے تحاشہ دولت سے مالا مال اور سرفراز کر دے گا۔ وہ بڑے خوش نصیب اور خوش قسمت ہیں جن کے ماں باپ زندہ ہیں۔ اللہ سب کو اپنے ماں باپ کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے..... آمین

گھر کی اس بار مکمل میں تلاشی لوں گا
غم چھپا کر مرے ماں باپ کہاں رکھتے تھے

بروز جمعۃ المبارک 6 جمادی الاوّل 1443ھ 10 دسمبر 2021ء

کوالٹی لائف

ہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں کا چکر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ بس میں کا چکر۔ دھوکا ہی دھوکا اور خود فریبی۔ دربارِ عالیہ میں مسندِ نشین خوشامد پسند حکمران اور چاپلوس مشیرانِ کرام...راگ رنگ کی محفلیں، ناؤنوش کا دور اور عوام کا درد و غم یکساں کیسے ہو سکتے ہیں! ہو ہی نہیں سکتے۔ نہیں جناب آپ نے، آپ ہی تو صحیح فرماتے ہیں.....آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں آپ کے ارشاداتِ عالیہ۔ دُرِّ نایاب ہیں آپ، نجات دہندہ اور زمین پر اللہ بجا ارشاد فرمایا..... کا سایا۔ رحمتِ باری تعالیٰ اور اوتارِ زمانہ ہیں آپ سرکار آپ، جئیں ہزاروں سال سدا جئیں کا نعرہ، اور خود فریبی میں رچا بسا فریب خوردہ انسان۔ اتنی آوازوں میں کون اپنے آپ میں رہتا ہے۔ جامے سے باہر ہو ہی جاتا ہے۔

لیکن کون جیا ہے سدا! کوئی بھی نہیں۔ سب کو چلے جانا ہے۔ زندگی پر موت کا پہرہ ہے۔ نہیں بچا کوئی۔ کوئی بھی تو نہیں بچا لیکن کون سمجھائے جب قلب سیاہ ہو کر پتھر بن جائے چاہے دھڑکتا ہی ہو، اس سے کیا ہوتا ہے! ہاں پتھر تو پتھر ہوتا ہے۔ فریب ہی فریب اور دھوکا ہی دھوکا۔ زمین پر پاؤں ٹکنے ہی نہیں دیتا یہ دھوکا۔ چاہے کچھ کر لیں.....ہاں کچھ بھی، نہیں بچ سکا کوئی بھی موت کے منہ سے۔ بے حس و سفاک موت، کسی کو خاطر میں نہ لانے والی۔ ہاں وہ کسی کی بھی دھمکی نہیں سنتی، کسی کے نام و نسب، منصب و جاگیر سے اجنبی موت لیکن پھر بھی جیئے جیئے سدا جیئے آہ کا خمار۔ ایسا نشہ جو سارے نشے نہیں بچا کوئی۔ آگ و خون کی بارش کرنے والے بھی اور مظلوم، معصوم اور مقہور بھی۔ نہیں کوئی نہیں بچا لیکن پھر سب کو دو آتشہ اور سہ آتشہ کر دے۔ ساتھ چھوڑنے لگتے ہیں، تب خیال آتا ضرور ہے لیکن ساعت و لمحات بیت چکے ہوتے ہیں، سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاتا ہے، پھر پل کی خبر نہیں ہوتی حالانکہ سامان ہے۔ سو برس کا دھرا ہوتا

وہ مجھے اکثر کہتا ہے کوالٹی لائف ہونی چاہیے۔ ہاں وہ اسی طرح کی زندگی بسر کرتا ہے۔ ہر چیز وافر اور وقت نپا تلا لیکن کیا یہ ہے کوالٹی لائف! اچھی نوکری کیلئے بہترین تعلیم حاصل کرنا۔ پھر پیسے جمع کرنا اور کرتے ہی چلے جانا۔ پھر ایک خوب صورت لڑکی سے شادی۔ ایک آسائشوں بھرا گھر اور اس کے لان میں بچھی ہوئی آرام دہ کرسی پر جھولتے ہوئے گپ شپ۔ بس یہ ہے آج کی کوالٹی لائف۔ کیا یہی ہے زندگی! میرا ایک دیہاتی دوست بہت ہنستا اور کہتا تھا: کچھ لوگوں کی زندگی پتا ہے کیسی ہوتی ہے؟ میں کہتا نہیں پتا۔ تو کہنے لگتا: ان کی زندگی ہوتی ہے "نہ ہم کسی کے نہ ہمارا کوئی"۔ کسی سے کوئی مطلب ہی نہیں .....بس میں، میں اور میں کا چکر۔

زندگی پر موت کا پہرہ ہے، ان کا یہ جملہ ہر وقت میری سماعتوں میں رس گھولتا ہے۔ میں اکثر ان سے ملتا تھا۔ بس ہر وقت ایک ہی بات تھی ان کی "پیٹ کی نہ ماننا یہ کبھی نہیں بھرتا۔ دنیا بھر کی نعمتیں اس پیٹ میں ڈال لے، اگر ایک وقت کا فاقہ آ گیا تو ہٹ دھرمی سے کہنے لگتا ہے میں نے تو آج تک کچھ کھایا ہی ۔پیٹ بھی ایک جہنم ہے"۔ کیا تشبیہ ہے یہ۔ زندگی پر موت کا پہرہ ہے۔ مت بھولنا۔ نہیں

ہم اگر بھول بھی جائیں تب بھی کیا ہو گا؟ کچھ نہیں۔ خود کو فریب دیں گے۔ موت تو ہمیں نہیں بھولتی۔ زندگی کے ساتھ ہم سفر موت، کبھی نہیں مہلت دیتی۔ آ کر رہتی ہے۔ بس ایک فرق ہے۔ کس نے کس طرح موت کا استقبال کیا۔ بس یہ ہے اصل۔ ایک دن انہوں نے مجھے کہا تھا: دیکھ، سامان اوّل تو ہونا ہی نہیں چاہیے اور اگر ہو بھی تو بس مختصر۔ دیکھ، موت کی گاڑی زندگی کے ساتھ ہی روانہ ہوتی ہے، تجھے کسی اسٹیشن پر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس کا کوئی وقت ہی نہیں جو تجھے معلوم ہو لیکن آتی بروقت ہے۔اس لیے بس چھوٹی سی گٹھڑی سے زیادہ جمع نہ کرنا، موت کی ٹرین آئے تو بس ہنس کھیل کر سوار ہو جانا، ہونا تو ہے، تو پھر ہنس کھیل کر کیوں نہیں اور پھر ان کا نعرۂ مستانہ گونجتا "کوئی بھی نہیں بچے گا، آآ مجھے تو تیار پائے گی"۔انسان اور بندۂ عاجز لیکن طاقت کے زعم میں لتھڑا ہوا، فریب خوردہ سمجھ ہی نہیں پاتا، بس اتنی طاقت کے نشے میں چُور چلاتا رہتا ہے: یہاں سے ماریں گے، وہاں ماریں گے، کوئی نہیں بچے گا، نہیں چھوڑیں گے، بس ماریں گے ہم، ہلاک کر دیں گے، اور پھر آگ وخون کی بارش برستی ہے اور موت کا ہرکارہ پروانۂ اجل تقسیم کرنے لگتا ہے، اور پھر سب رخصت ہو جاتے ہیں، سب نے ہونا ہے رخصت۔

ہم خود اپنی آنکھوں سے اپنے انتہائی عزیزوں کو انتہائی عجلت کا اظہار کرتے ہوئے رخصتی کے سفر میں دیکھتے ہیں لیکن اگلے ہی دن سب کچھ فراموش کر کے لوگ چائے پھینک دیتے ہم زندگی کی اس ڈگر پر آنکلتے ہیں جہاں معمولی سا رتبہ انسانوں کے مابین تفریق پیدا کر دیتا ہے۔ مکھی جب چائے میں گر جائے تو ہیں لیکن وہی مکھی اگر دیسی گھی میں گر جائے تو لوگ کبھی بھی اس دیسی گھی کو نہیں پھینکتے بلکہ مکھی کو نکال کر پھینک دیتے ہیں، اسی طرح جب کوئی غریب آدمی اپنے حق کیلئے کوئی سچ بول دے تو کرسی پر بیٹھا ہوا فرد بغیر سوچے سمجھے اس کی بے عزتی کر دیتا ہے اور بعض اوقات تو اس کی فائل اٹھا کر دور پھینک دیتا ہے، سائل آنکھوں میں بے بسی کے آنسوؤں اور کانپتے ہاتھوں سے فرش پر اپنی عرضی کے بکھرے ہوئے اوراق سمیٹتے ہوئے دوبارہ سر جھکا کر شکریہ ادا کرتے ہوئے دفتر سے باہر آسمان کی طرف دیکھ کر اپنے دل کے غبار کو دباتا ہوا سر جھکائے چلا جاتا ہے لیکن یاد رکھیں کہ اس کے ساتھ ہونے والے سلوک کی ایف آئی آر ضرور درج ہو جاتی ہے اور بعض اوقات فوری طور پر اسی آدمی کو جب اس کا افسر بالا اپنے دفتر بلا کر اس سے وہی یا اس سے بھی بدتر سلوک کرتا ہے تو یہ بدقسمت پھر بھی نہیں سمجھتا کہ یہ مکافات عمل ہے، اگر کوئی اسے سمجھائے تو اپنے بلڈ پریشر کے بڑھنے کا ذکر کر کے خود کو بری الذمہ قرار دینے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ بھول جاتا ہے کہ اس کا ہائی بلڈ پریشر اس کے اپنے بالا افسر کے سامنے کیوں سر جھکا کر کھڑا تھا؟ دراصل یہی نامراد اپنے مفادات کو دیکھ کر اصول اور آداب کا ڈھونگ رچاتے ہیں اور اگلے کی طاقت اور حیثیت دیکھ کر فیصلے کرتے ہیں۔

دنیا دھوکا ہے، سراسر دھوکا۔ کسی کی رہی نہ رہے گی، اپنے اپنے حصے کی آگ اور اپنے اپنے حصے کے پھول لے کر سب چلے جائیں گے۔ بس دیکھ کہیں تُو اپنے لیے آگ ہی آگ تو جمع نہیں کر رہا۔اس کی ماں نے اس ریگستان کی ٹھنڈ سے بیتاب ہو کر اس سے کہا تھا: جا آگ لا۔ بہت دیر بعد وہ خالی ہاتھ لوٹا اور ماں کے حضور دست بدستہ عرض گزاری: "ماں! کہیں سے آگ نہیں ملی "تب ماں نے تلخ ہو کر پکارا" جا کر جہنم سے ہی لے آتا۔ "تو پھر اپنا سر خم کیا اور عرض کی "ماں وہاں بھی گیا تھا، میں نے وہاں کے نگراں سے کہا مجھے کچھ آگ درکار ہے، تب اس نے مجھے کہا جا اپنا رستہ لے، ہر انسان اپنی آگ دنیا سے خود لے کر یہاں آتا ہے۔

ٹھہرو! مجھے وہ خوش نصیب بھی یاد آگیا، جب نزع کا وقت طاری ہوا تو اللہ ورسول کو بے اختیار پکارتے ہوئے پاکستان کی سلامتی کی دعا مانگتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو گیا، اس نے شہداء کے قبرستان میں دفن ہونے کی وصیت کی لیکن بزدل ومکار ہندو نے پاکستانی جھنڈے میں لپٹی میت کو چھین کر فوری طور پر حیدر پورہ کے قبرستان میں دفن کر کے ان کے لواحقین پر غداری کا مقدمہ درج کر کے قطعی شرم محسوس نہیں کی لیکن کیا ہمارے حکمرانوں نے

اس وفاداری کی کوئی قدر کی؟ ہاں ایک اور ایسا خوش نصیب یاد آگیا، اُس کی گردن تن سے جدا کرنے لگے تو پکارنے لگا: رب کعبہ کی قسم، میں تو کامیاب ہو گیا۔ ہاں یہ بھی ایک موت ہے، بارود کی بارش میں معصومیت کا قتل عام۔ لیکن دنیا نے دیکھا کہ خود کو سپر پاور کہنے والا کس طرح اور کس کرب سے سر جھکا کر نکلنے کیلئے مجبور ہوا۔ اب تو یقین کر لینا ہو گا کہ کوئی بھی نہیں بچے گا جناب۔ زندگی پر موت کا پہرہ ہے اور مہلتِ عمل بہت تھوڑی۔ جناب اب بھی وقت ہے، نہ جانے مہلتِ عمل کب ختم ہو جائے۔ زندگی کی ہمسفر ہے موت۔ نہ جانے کہاں اچک لے۔ کچھ بھی تو نہیں رہے گا۔ بس نام رہے گا اللہ کا۔

بروز جمعۃ المبارک 6 جمادی الاوّل 1443ھ 10 دسمبر 2021ء

رجعت پسندی کا نیا چہرہ

پال اے نٹل تاریخ دان ہونے کے ساتھ ساتھ مصنف اور سیاستدان بھی رہ چکے ہیں، 2009 سے 2019 تک وہ یورپی پارلیمان کے رکن رہے اور بریگزٹ کی تحریک چلانے والوں میں شامل رہے ہیں۔ یورپین عدالت کا ورک پلیس پر حجاب پر پابندی لگانے کا متنازع فیصلہ تنگ نظر سوچ اور پسماندگی یورپی عدالت برائے انصاف نے یہ کی علامت ہے یہ فیصلہ آنے والے وقت میں دوسرے مذاہب پر بھیانک اثرات ڈالے گا، یورپ کی اعلی عدالت، فیصلہ دیا ہے کہ لوگوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ حجاب والی خواتین کو ملازمت سے برطرف کر سکتے ہیں، جب وہ آجروں سے معاملات کر رہی ہوں یا گاہکوں سے گفتگو کر رہی ہوں یا اگر اس حجاب کی وجہ سے ملازمت کی جگہ پر کوئی تنازع کھڑا ہو۔ اس مقدمے کو دو حجاب پہننے والی نو مسلم جرمن خواتین نے فائل کیا تھا جنہیں حجاب کی وجہ سے نوکری سے برطرف کیا گیا، جن میں سے ایک خاتون فارمیسی میں ملازمت کرتی تھیں اور ایک کا تعلق اسپیشل کیئر کے محکمے سے تھا۔ دونوں خواتین کے کام کے بارے میں انتہائی مثبت رپورٹس بھی عدالت کو پیش کی گئیں اور اب تک کسی نے ان کے حجاب کو ان کے پیشہ وارانہ کام میں مخل نہیں دیکھا لیکن اس کے باوجود مقدمے کی سماعت میں عدالتی ٹریبونل نے بیان دیا کہ کسی بھی ایسی حرکت یا ایسے لباس کی قانونی ممانعت کی ضرورت ہے جو عوامی مقامات پر کسی طرح بھی سیاسی یا مذہبی اظہار کا باعث بنے تاکہ ملازمت پیشہ افراد لوگوں کے سامنے اپنا غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کر کے سوسائٹی کو تنازعے سے محفوظ رکھ سکیں۔

عدالت کا فلسفہ ہر ذی شعور کی سمجھ سے بالاتر ہے، کیا واقعی یہ عدالتی بیان کمیونٹی تعلقات کو بہتر بنانے میں مدد کر سکے گا؟ مذہبی لباس پر تنازعات پر غور کیلئے کئی عشرے پیچھے جا کر تاریخ کو دیکھنا پڑے گا، یہ مقدمہ رجعت پسندی کی ایک علامت ہے جو میرے ذہن کو اس زمانے میں لے گیا جب 1967 میں انگلش مڈلینڈ میں وولور ہیمپٹن کا بدترین واقعہ پیش آیا، جب ایک سکھ ترسیم سنگھ سندھو کو صرف اس وجہ سے نوکری سے نکال دیا گیا تھا کہ وہ داڑھی رکھتا تھا اور سکھوں کی طرح سر پر پگڑی پہنتا تھا۔ سکھوں کا اپنے بالوں کو پگڑی میں لپیٹنا ان کے پانچ اہم عقائد کا حصہ ہے، جب سندھو نے پگڑی اتارنے سے انکار کیا تو اس کے حق میں 6000 سکھ احتجاج کیلئے سڑکوں پر نکل آئے بس کمپنی کو اپنے متعصبانہ فیصلے سے دستبردار ہونا پڑا اور دو سال بعد بس کمپنی نے اپنا مؤقف تبدیل کیا، یہ بہت عقل مندانہ فیصلہ تھا اور مذہب کے حوالے سے قوت برداشت کا مظاہرہ تھا۔ وولور ہمپٹن میں وقوع پذیر ہونے والا واقعہ یہ بتاتا ہے کہ اس وقت ایک بس ڈرائیور کیلئے بھی مذہبی حوالے سے اس دور میں بھی زیادہ قوت برداشت موجود تھی، جو کہ تاحال یعنی اکیسویں صدی کے جدید دور میں ناپید ہو چکی ہے۔

بالکل اسی طرح مجھے وہ حیران کن واقعہ یاد ہے جب 2006 میں برطانیہ کی فضائی کمپنی کی ملازمہ نادیہ ایوداکو عیسائیوں کا مذہبی صلیب کا نشان گلے سے نہ اتارنے کی وجہ سے ملازمت سے برخواست کر دیا گیا تھا اگرچہ اس کی ٹریبونل اپیل کامیاب نہیں ہوئی لیکن جب وہ اپنا مقدمہ یورپی عدالت برائے حقوق انسانی میں لیکر گئی تو وہ اپنا مقدمہ جیت گئی اور فیصلے میں یہ کہا گیا کہ ان کے ساتھ بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہوئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کیس کو یورپی عدالت لیکر جانا ہی خود ایک اسکینڈل تھا لیکن عقل اور مذہبی رواداری بالآخر جیت گئی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یورپی عدالتِ انصاف کا حجاب پر دیے گئے متنازع فیصلے سے کہیں بہتر فیصلہ 2006 میں دیا گیا یورپی عدالت برائے انسانی حقوق کا فیصلہ تھا۔

یہاں پر کچھ پڑھنے والے راقم کے خیالات پڑھ کر غیر یقینی کی کیفیت میں ہوں گے کہ بیشتر افراد جو 2017 میں برقع پر پابندی کے حق میں یہ دلیل دیتے تھے کہ ایک صحت مند معاشرے کا لطف اٹھانے کیلئے ہر انسان اپنے چہرے کے ساتھ گفتگو کر سکے اور اس کے علاوہ برقع پوش خواتین کو سیکورٹی کے حوالے سے بھی خطرات کا اندیشہ رہتا ہے، مگر وہ بھی حجاب کی حقیقت سے آگاہی کے بعد اپنی مخالفت کو ختم کر چکے ہیں۔

یہاں برقع اور حجاب میں اک واضح فرق موجود ہے، جو خواتین حجاب کرتی ہیں ان کا چہرہ نظر آسکتا ہے۔ حجاب کسی بھی طرح کسی عورت کیلئے اس کے پسندیدہ پیشہ کے انتخاب میں رکاوٹ نہیں بن سکتا، حجاب عقیدے کا ایک حصہ ہے اور عورت کا اپنے عقیدے سے ایک اظہار ہے اور اسے برداشت کیا جانا چاہیے۔ لبرل مغربی یورپ مستقل طور پر مشرقی ممالک کو ایل جی بی ٹی کیو کیلئے عدم برداشت کے رویے پر لعن طعن کرتا رہتا ہے کیا آپ اس بات سے اتفاق نہیں کرتے کہ یورپی عدالت برائے انصاف کا اس مقدمے پر فیصلہ بدترین منافقت ہے۔

حجاب کے بارے میں یہ فیصلہ آنے کے بعد وہ عیسائی کیا کریں گے، جو کام کے دوران صلیب کا نشان پہنے رہتے ہیں حقیقت میں کیا ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ اب ایک آجر کسی بھی سکھ کو ایک بار پھر پگڑی اتارنے اور داڑھی صاف کرنے کا حکم دے سکتا ہے۔ کیا جو چیز راج ہنس کیلئے اچھی ہے وہ مادہ ہنس کیلئے اچھی نہیں ہو سکتی؟ مثال کے طور پر کیا ایک یہودی مخالف جذبات رکھنے والا کسی یہودی سے یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ کیفہ (یہودیوں کی مذہبی علامت) نہیں پہن سکتا کیونکہ اس کو پہننے سے کام کی جگہ پر تنازع پیدا ہونے اور گاہکوں کے متنفر ہونے کا ڈر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی بھی شخص کسی یہودی کو یہ بات کہنے کی ہمت نہیں کر سکے گا لیکن اس مقدمے کے فیصلے نے کچھ لوگوں کیلئے سوسائٹی میں مسئلے کھڑے کرنے کا راستہ آسان کر دیا ہے اور آگے جا کر یہ مختلف مذاہب کیلئے درد سر بن جائے گا۔

میرے لیے یہ فیصلہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہم ماضی میں عدم برداشت کی طرف پلٹ رہے ہیں لیکن اب یہ سیکولر عدم برداشت کا مظاہرہ ہے، میرا یہ ماننا ہے کہ لوگوں کو مذہبی آزادی دی جانی چاہیے۔ اپنے مذہب کے لحاظ سے وہ اپنے لباس کا انتخاب کرنے میں اس وقت تک آزاد ہوں جب تک کہ سوسائٹی میں اس وجہ سے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا اور راقم یہ جانتا ہے کہ معاشرے میں اب تک حجاب پہننے، سکھ پگڑی پہننے، صلیب کی علامت پہننے یا یہودیوں کا کیفہ پہننے میں کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا ہے۔ جن یورپ ممالک میں حجاب پر پابندی عائد کی جا چکی ہے، کیا اس قانون کے نفاذ کے بعد مسلمانوں کے خلاف تعصب میں کوئی کمی واقع ہوئی ہے تو اس کا جواب نفی میں ہو گا لیکن یہ حقیقت ہے کہ حجاب پر پابندی کے بعد یہاں کی مقامی آبادی کی خواتین میں اسلام کی حقیقت سمجھنے کیلئے اشتیاق بڑھتا جا رہا ہے۔ مقامی مساجد میں ان خواتین کی اسلامی لٹریچر میں دلچسپی میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ یہاں کے رجعت پسند ادارے اس کا مقابلہ کیسے کریں گے؟

بروز سوموار 9 جمادی الاوّل 1443ھ 13 دسمبر 2021ء

تجارتی ناکہ بندی.....نیا عالمی تصادم

یورپی یونین نے الزام لگاتے ہوئے اقوام عالم کو آگاہ کیا ہے کہ چین نے جن ممالک میں ریلوے، سڑکوں اور بندرگاہوں کے منصوبوں کو فنڈ کیا ہے وہ بھاری قرض میں پھنس گئے ہیں لیکن یورپی یونین مواصلات، توانائی، ماحولیات اور ڈیجیٹل 'شعبے جیسے ٹھوس منصوبوں میں گلوبل گیٹ وے کے نام سے 300/ارب یورو کی سرمایہ کاری کر کے افریقہ اور دنیا کے دیگر خطوں میں چین کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کا توڑ اور مقابلہ کرے گی، اس سلسلے میں کمیشن کی صدر ارسلا فان ڈرلی ین اگلے ہفتے "گلوبل گیٹ وے" منصوبے کی تفصیلات پیش کریں گے۔ یورپی یونین اس بات پر غور کر رہا ہے کہ وہ کسی طرح یورپی برادری کے رکن ملکوں، مالی اداروں اور نجی سرمایہ کاروں سے اس پلان کے تحت بنائے جانے والے منصبوں کیلئے اربوں یورو اکھٹا کر سکتا ہے۔

یورپین کمیشن کی صدر نے اس سال ستمبر میں اپنے سالانہ "سٹیٹ آف یونین" خطاب میں کہا تھا کہ "ہمیں معیاری انفراسٹرکچر جس سے سفر اور مال کی ترسیل میں آسانی ہو بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کی ضرورت ہے۔" تاہم گلوبل گیٹ وے منصوبے کی چودہ صفاحت پر مشتمل ابتدائی دستاویز میں یہ نہیں کہا گیا کہ یہ چین کی حکمت عملی کا مقابلہ کرنے کیلئے ترتیب دیا گیا ہے۔ کمیشن اس منصوبے کے بارے میں بار بار پوچھے جانے کے باوجود چین کا نام لینے سے دانستہ طور پر گریز کیا۔ جرمن مارشل فنڈ کے بحر اوقیانوس کے خطے کے ماہر اینڈریو سمال کا کہنا ہے کہ اس کے پس منظر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر چین کی طرف سے بیلٹ اینڈ روڈ منصوبہ شروع نہ کیا جاتا تو گلوبل گیٹ وے کا خیال بھی نہ آتا۔ ان کے مطابق یہ منصوبہ یورپ کی طرف سے پہلی سنجیدہ کوشش ہے کہ ایسے پیکج مرتب کیے جائیں اور سرمایہ کاری کا نظام ترتیب دیا جائے تاکہ جو ممالک چین سے قرضے حاصل کر رہے ہیں ان کو متبادل ذرائع بھی دستیاب ہوں۔

بیلٹ اینڈ روڈ چین کی خارجہ پالیسی کا اہم جذبہ ہے جس کے تحت تجارتی روابط استوار کرنے کیلئے سڑکیں، بندرگاہیں، ریلوے لائینیں اور پل بنانے کے منصوبے میں پیسہ لگایا جا رہا ہے۔ یہ حکمت عملی مشرق بعید اور جنوبی مشرقی ایشیا سے ہوتی ہوئی افریقا اور یورپی یونین کے بلقان کے مغربی ہمسایہ ملکوں تک پہنچ گئی ہے۔ چین کی اس حکمت عملی پر شدید تنقید کی جاتی ہے اور اسے مختلف ملکوں کو "پھانسنے کے قرضے" اور "قرضوں کے جال کی سفارتی کاری" کا نام دیا جاتا ہے لیکن کچھ لوگوں کی رائے میں یہ اتنا سیدھا معاملہ نہیں ہے اور اس میں بہت پیچیدگیاں ہیں کیونکہ بڑے بڑے قرضوں کا حصول کبھی بھی خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ چین نے ایک ایسا خلا پر کیا ہے جو دوسرے نہیں کر سکے۔ مغرب کی چین سے بڑھتی ہوئی کشمکش کے دوران چین کا اقتصادی، سیاسی اور دفاعی اثر ورسوخ بڑھتا جا رہا ہے۔

اینڈریو سمال کا کہنا ہے کہ اب جبکہ یورپی یونین اپنے اثر ورسوخ اور وسائل میں اضافہ کرنے کی کوشش میں ہے، یہ اس کیلئے ایک بڑا امتحان ثابت ہو سکتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یورپی یونین اس عالمی سیاست میں موثر کردار ادا کر سکتی ہے یا یہ اپنے اندرونی بیوروکریٹک جھگڑوں میں اس قدر الجھی ہوئی ہے کہ یہ کردار ادا نہ کر سکے۔ اگر یہ ناکام ہو گئی تو یہ ایک بڑا موقع کھو دے گی۔ ایک سفارتکار کے مطابق یہ ایک اچھا شگون ہے کہ آخر کار یورپ نے اس علاقے میں اپنا اثر ورسوخ استعمال کرنا شروع کیا ہے۔ یہ مشترکہ مفاد کا معاملہ ہے اور جس میں یورپی یونین کے بحر اوقیانوس کے اتحادی امریکا اور برطانیہ شامل ہیں۔

سینٹر فار گلوبل ڈویلپمنٹ کے ماہر سکاٹ مورس کا کہنا ہے کہ مشترکہ مفادات سے باہمی مسابقت کی فضا بھی جنم لیتی ہے۔امریکا نے گزشتہ جون میں جی سیون کے ملکوں کے اجلاس کے موقعے پر اس طرز کے اپنے منصوبے "بلڈ بیک بیٹر ورلڈ" شروع کرنے کا اعلان کیا تھا۔بہت شور مچ رہا ہے اور مختلف برانڈ آپس میں ٹکرا رہے ہیں لیکن وہ گلوبل گیٹ وے منصوبے کی کامیابی کے بارے میں پر امید تھے۔انہوں نے کہا کہ چین کے مقابلے سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ یورپ ترقی پذیر ملکوں کیلئے سرمایہ کاری حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بن جائے۔

یورپی یونین کے اس منصوبے کے کمشنروں کے اجلاس میں بدھ کو منظوری کے بعد اسے یورپی کمیشن کی صدر کے سامنے پیش کیا جائے گا۔یورپی یونین نے اس بات پر زور دیا ہے کہ وہ ایک شفاف اور اقدار پر مبنی نظام ترتیب دینا چاہتا ہے جس سے دوسرے ملکوں سے تعلقات بن سکیں نہ کہ انہیں دستِ نگر بنایا جائے۔یاد رہے کہ "بیلٹ اینڈ روڈ انیشیٹیو" یعنی بی آر آئی جسے "ون بیلٹ ون روڈ" کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، چین کی طرف سے رواں صدی کا سب سے بڑا ترقیاتی منصوبہ ہے جس کے تحت 66 سے زائد ممالک کو تجارتی سطح پر جوڑا جا رہا ہے۔ورلڈ بینک کی رپورٹ کے مطابق یہ منصوبہ دنیا کی دو تہائی آبادی کو ملائے گا جس میں کم از کم ایک تہائی مجموعی ملکی پیداوار بھی شامل ہے۔پہلی مرتبہ 27 اپریل 2019ء کو بیجنگ میں دنیا بھر سے کئی ممالک کے لیڈر، تھنک ٹینکس اور اداروں کے سربراہان نے روڈ اینڈ بیلٹ منصوبے پر غور وخوض کیا جبکہ اس وقت بھی اس منصوبے کو تنقید کا سامنا تھا۔اس وقت بھی ایسا لگ رہا تھا کہ چینی قیادت بیلٹ اینڈ روڈ فورم کے ذریعے انہی بین الاقوامی خدشات کو دور کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

صدر شی جن پنگ نے 2013 میں اس وسیع منصوبے کا اعلان کیا جو کہ زمانہِ قدیم کی شاہراہ ریشم کے نقشِ قدم پر بنایا گیا ہے۔اس کے زمینی راستے کو "سلک روڈ اکنامک بیلٹ" کا نام دیا گیا ہے جو کہ چین کو سڑک اور ریل کی مختلف راہداریوں کے ذریعے ایشیا کے تقریباً تمام ممالک سے ملاتے ہوئے یورپ تک جاتا ہے۔ان راہداریوں کا ایک اہم حصہ چین پاکستان اقتصادی راہداری ہے جو کہ گوادر سے خنجراب کے راستے 62 ارب امریکی ڈالر کی مالیت پر مشتمل ہے۔اس کا دوسرا پہلو "میری ٹائم سلک روڈ" ہے جو کہ بحری راستہ اپناتا ہوا افریقا اور جنوب مشرقی ایشیا سمیت پوری دنیا میں بکھر جاتا ہے۔

پہلے بیلٹ اینڈ روڈ فورم کا انعقاد 2017 میں بیجینگ میں ہوا تھا جس میں دنیا بھر سے مختلف ممالک کے سربراہان سمیت اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل بھی آئے تھے۔بیلٹ اینڈ روڈ 2019 کے اس تین روزہ فورم میں بھی دنیا کے 122 ممالک اور 49 عالمی تنظیموں کے علاوہ پاکستان، ملائیشیا کے وزرائے اعظم اور روس کے صدر پوتن کے علاوہ 37 سربراہان بیجنگ میں موجود تھے۔فورم کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اس منصوبے کی نہ صرف دنیا بھر میں تشہیر کی جائے بلکہ سب کو اس سے متعلق آگاہی دیکر اس میں شامل کیا جائے۔بہت بہت سے ماہرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ان اقتصادی راہداریوں میں توانائی، سرمایہ کاری، ثقافتی تجارت، نقل وحمل، تبادلہ اور دیگر بنیادی معاشی ڈھانچے شامل ہیں۔

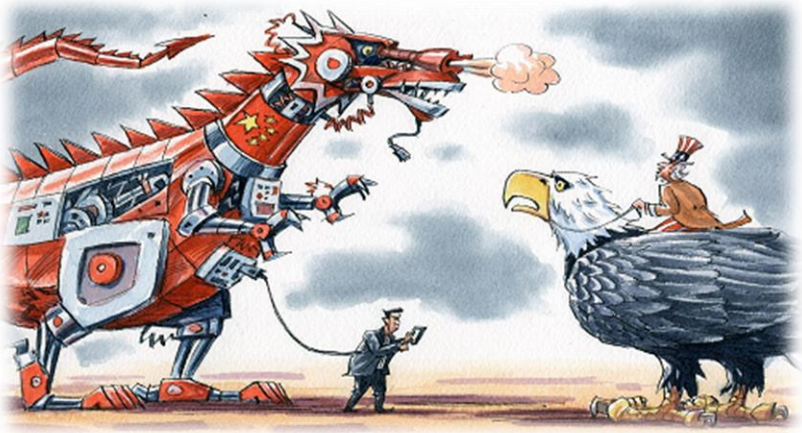

چین کی معیشت اس وقت امریکا کے بعد دنیا کی دوسری بڑی معیشت ہے لیکن اگر قوت خرید کے حساب سے تولا جائے تو سب سے بڑی ہے۔جن ممالک کو چین بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے میں شامل کر رہا ہے ان میں اکثریت ترقی پذیر ممالک

کی ہے جو اس منصوبے کو مقامی معیشت میں ترقی کیلئے نہایت اہم موقع کے طور پر دیکھتے ہیں۔ تاحال اس بارے میں ایسے مستند اعداد و شمار نہیں ہیں جو یہ ثابت کر سکیں کہ چین کے اس منصوبے سے ان ممالک میں توقعات کے مطابق اہداف کا حصول ہو رہا ہے یا نہیں، مگر دنیا کے کئی دیگر ممالک میں منصوبے پر تحفظات بھی پائے جاتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ بیجنگ میں جاری دوسرے بیلٹ اینڈ روڈ فورم سے خطاب میں چینی صدر نے انہی خدشات اور تحفظات کو دور کرنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کے ممالک کو اس منصوبے میں شامل کرنے کیلئے جہاں قائل کیا وہاں منصوبے میں شامل ممالک کے ساتھ مزید تعلقات مضبوط کرنا بھی مقصود تھا۔

عالمی طور پر بڑی طاقتیں تو بیلٹ اینڈ روڈ انیشیئیٹو یعنی بی آر آئی کی مخالفت کر رہی ہیں، البتہ اس میں شامل ممالک اس کی حمایت کرتے ہیں اور اس کی مخالفت کی ایک وجہ چین کی عالمی سطح پر اپنا اثر ورسوخ قائم کرنے کی کوشش ہے۔ چین کے بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے سے متعلق یہ تنقید بھی کی جاتی ہے کہ وہ اس منصوبے کو اپنی سیاسی، اقتصادی اور عسکری قوت پھیلانے کیلئے استعمال کر رہا ہے اور اس سے ترقی پذیر ممالک اس کے قرضے تلے دب جائیں گے ۔اس تنقید کی وجہ سے ہی چین نے اس منصوبے کیلئے "ون بیلٹ ون روڈ" کی جگہ 'بیلٹ اینڈ روڈ' کا نام استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ ماہرین کے مطابق اس منصوبے کا مقصد اس میں شامل مختلف انفراسٹرکچر کے منصوبوں کے ذریعے عالمی تجارتی رابطے پیدا کرنا ہے۔ اسی لیے اس کے تحت کئی ممالک میں قرضوں کی صورت میں ٹرینوں، سڑکوں اور بندرگاہوں کا جال بچھایا جا رہا ہے تاکہ وہاں سرمایہ کاری کے راستے کھلیں۔

امریکہ کھل کر چین کی اقتصادی پالیسیوں اور منصوبہ بندیوں پر تنقید کرتا ہے اور اس منصوبہ کو بھی "قلیل مدتی فوائد اور چین پر طویل مدتی انحصار" کا باعث قرار دیتا ہے۔ امریکا بیلٹ اینڈ روڈ کے اس منصوبے کو "قرضوں پر منحصر سفارتکاری" یا 'ڈیٹ ڈپلومیسی' کا نام بھی دیتا ہے۔ کئی ممالک جو اس منصوبے کا حصہ بھی ہیں، اب کچھ احتیاط سے کام لے رہے ہیں اور اس سلسلے میں سری لنکا کی مثال دی جاتی ہے۔ جب اسے 2017 میں اپنی ایک بندرگاہ کا کنٹرول مکمل طور پر چین کے ہاتھ دینا پڑا کیونکہ سری لنکا بیرونی قرضہ وقت پر نہیں لوٹا سکا تھا۔ یہ رائے عالمی سطح پر کچھ ممالک میں ضرور پائی جاتی ہے کہ "چین قرضے دیتا ہے، اس سے اپنا اثر ورسوخ بڑھاتا ہے اور پھر ان کے اثاثوں پر قبضہ کرتا ہے جیسا کہ سری لنکا کے معاملے میں ہوا، اور امریکا کو یہ شہ ملی کہ وہ قرضوں کا الزام لگا سکے۔ اس لیے یہ رکن ممالک پر منحصر ہے کہ وہ قرضہ کن شرائط پر لے رہے ہیں۔"

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ امریکا اپنے مفادات کا تحفظ چاہتا ہے لیکن کئی معاشی ماہرین امریکا کی اس "ڈیٹ ڈپلومیسی" کے بیانیے سے متفق نہیں کیونکہ حقائق کی بات کریں تو سری لنکا پر قرضوں میں چین کا قرضہ دو فیصد سے بھی کم تھا اور یورپ کا دس فیصد سے بھی زیادہ۔ ابھی تو یہ منصوبہ اپنی تکمیل کے مراحل میں ہے، اور آنے والے کچھ سالوں تک جب تک اس کے ثمرات سامنے نہیں آجاتے تو بغیر ڈیٹا کے ایسی بات کرنا درست نہیں، یہاں تک کہ پاکستان میں بھی چینی قرضہ تو صرف دو سے تین فیصد ہے، اگر ہم اپنی معیشت کو درست انداز میں چلائیں تو یہ قرض باآسانی واپس ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ملائشیا نے وہ قرضے نہیں لیے جو انہوں نے سمجھا کہ وہ واپس نہیں کر سکیں گے اور اسی طرح پاکستان نے بھی تاحال ان معاہدوں پر دستخط نہیں کیے جہاں اسے اطمینان نہیں۔

تاہم چین اس فورم کے ذریعے عالمی برادری کو یہ یقین دلا رہا ہے کہ بیلٹ اینڈ روڈ ایک جامع منصوبہ ہے اور اس میں شریک غریب ممالک میں قرضوں کی واپسی کے حوالے سے لچک کا مظاہرہ کرنے کا امکان بھی رد نہیں کیا جا سکتا۔ چینی صدر نے بیجنگ میں ہونے والے بیلٹ اینڈ روڈ فورم کے اجلاس میں مزید

سرمایہ لگانے کی بجائے "مشترکہ ترقی" پر بات کی اور اس ملٹی بلین ڈالر منصوبے پر کی جانے والی تنقید اور شکوک وشبہات کو دُور کرنے پر توجہ مرکوز رکھی ۔ چینی صدر نے اپنے خطاب میں اگرچہ امریکا یا یورپ کا نام نہیں لیا لیکن ان کا اشارہ انہی ممالک کی جانب ہونے کا تاثر ضرور ملا ہے۔ اپنی تقریر میں انہوں نے کہا کہ چین کرنسی کی قدر میں کمی نہیں لانے دے گا اور اس کا استحکام یقینی بنائے گا اور یہ کہ چین "ہمسائے کو بھکاری بناؤ" جیسی پالیسی پر یقین نہیں کرتا اور یہ چین کی پالیسی ہرگز نہیں۔

امریکا سمیت کئی ممالک یہ سمجھتے ہیں کہ چین کے اس اقتصادی پیکج کا فائدہ صرف چین کو ہی ہوگا جبکہ اس فورم میں چین نے اس تاثر کو رد کرنے کی کوشش کی ہے۔ صدر شی جن پنگ نے امریکا کے ساتھ ہونے والی "تجارتی جنگ" کا ذکر نہ کرتے ہوئے صاف الفاظ میں کہا کہ یہ منصوبہ صرف چین کیلئے نہیں ہے اور بیلٹ اینڈ روڈ کوئی امتیازی کلب نہیں ہے۔ اس میں صرف چین کا مفاد نہیں بلکہ اس کے تمام شرکا کا فائدہ ہوگا کیونکہ چین اپنے ساتھیوں کے ساتھ مسلسل مشاورت، ہم آہنگی اور شفافیت میں یقین رکھتا ہے۔ تاہم بیلٹ اینڈ روڈ فورم میں خطاب کے دوران چین نے یہ واضح تاثر دیا ہے کہ وہ درآمد بھی کرنا چاہتا ہے اور یہ ان کی کمزوری نہیں، یہ ان کی سفارتکاری کا حصہ ہے۔ چین کی خارجہ پالیسی کا حصہ ہے کہ وہ درآمدات کو بھی گنجائش دے رہے ہیں۔

کچھ ممالک اس منصوبے کو چین کی جانب سے جیوپولیٹیکل اثر ورسوخ قائم کرنے کی ایک کوشش بھی قرار دیتے ہیں۔ اس تاثر کو بھی اس فورم میں رد کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی۔ ایک یہ دلیل بھی پیش کی جاتی ہے کہ چین پیچیدہ جیوپولیٹیکل مسائل کو پیسے کے ذریعے حل کر سکتا ہے جبکہ چین اسے جیوسٹریٹجک منصوبہ نہیں کہتا، چین کے مطابق یہ "ان کوششوں کا حصہ ہے جن کا مقصد ایسی برادری کی تشکیل ہے جو دنیا میں ان ممالک پر مشتمل ہے جو تمام انسانیت کے مستقبل کی ضامن ہوں۔ امن وخوشحالی کے مشترکہ مقصد کے حصول کیلئے اقتصادی تعاون اور آزاد تجارتی معاہدوں کی ضرورت ہے جبکہ "بیلٹ اینڈ روڈ" فورم تمام ملکوں کو یکساں مواقع فراہم کرتا ہے۔ ان خدشات کے بیچ کہ چین اصلاحات کے دعوے پورے نہیں کر پایا، صدر شی نے یقین دہانی کروائی کہ چین اپنے وعدوں اور ذمہ داریوں کو نہایت اہم گردانتا ہے۔ چین تجارتی توازن قائم کرنے کیلئے بیرون ملک سے مزید زرعی مصنوعات اور سروسز درآمد کرنے پر تیار ہے جبکہ چین دیگر پارٹیوں کے ساتھ کیے گئے دوطرفہ اور کثیر الاطرافی تجارتی اور اقتصادی معاہدات پر عملدر آمد پر خصوصی توجہ دیتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس فورم میں انڈیا نے شرکت نہیں کی، اگرچہ انڈیا اور چین کے درمیان تجارت کا حجم خاصا بڑا ہے

لیکن ماہرین کے مطابق بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے، جس سے خاص طور پر خطے میں چین اور پاکستان مضبوط ہوگا، پانیوں پر پاکستان اور چین کی پوزیشن میں مزید استحکام آئے گا اور ان کا فلیگ شپ منصوبہ یعنی سی پیک، وہ عناصر ہیں جن پر انڈیا کے تحفظات ہیں۔ اس کے باوجود انڈیا چین کی منڈیوں تک ترجیحی بنیادوں پر رسائی اور مراعات کا خواہشمند بھی ہے۔ اس میں شمولیت کو مشروط کرنا چاہتا ہے۔ انڈیا کی چین کے ساتھ تجارت کا حجم 80 ارب ڈالر سالانہ کی حد پار کر چکا ہے جس میں بھی چین کا پلڑا خاصا بھاری ہے۔ انڈیا اس معاملے میں کچھ مراعات چاہتا ہے کہ اس کی مصنوعات اور کمپنیاں چینی منڈیوں تک پہنچیں۔ اس کے علاوہ ساؤتھ چائنہ پانیوں میں چین کی مضبوطی اور چین کا جنوبی ایشیا میں بڑی طاقت ہونا بھی انڈیا کو اپنے مفاد کے خلاف لگتا ہے۔ دوسرا انڈیا نے پاکستان کا معاملہ بھی سامنے رکھا ہوا ہے کہ پاکستان کی جغرافیائی حیثیت کی وجہ سے سی پیک خطے کا مزید مضبوط ملک بن کر ابھرے گا۔ اس کے علاوہ مودی کی غلط پالیسیوں کی بناء پر انڈیا بری طرح الجھا ہوا ہے۔ حالیہ افغانستان میں امریکی انخلاء کے بعد مودی خارجہ پالیسی کی شدید ناکامی اور کسانوں کی سال بھر کی تحریک نے بھی مودی سیاست کا بھرکس نکال دیا ہے۔ ان تمام شواہد کی بناء پر یقین کیا جاسکتا ہے کہ مستقبل میں چین کی تجارتی ناکہ بندی کیلئے کسی بڑے تصادم کی وجہ بن سکتی ہے۔

اور تضحیک کیا ہے؟

میں ایک مرتبہ پھر دہائی دینے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ کوئی تاریخ پڑھانے والے اس نوجوان استاد پروفیسر حسین کو روکے کہ یہ میرا اس قدر جذباتی محاسبہ کرنا چھوڑ دے۔ کل سے جس عنوان پر بات کرنے کیلئے میرا تعاقب کر رہا تھا، میں اس تضحیک سے بچنے کیلئے موزوں جواب تلاش کر رہا تھا کہ آج صبح فون پر بات کرنے کی بجائے پھوٹ پھوٹ کر سسکیوں میں بڑے ہی جذباتی انداز میں رو رہا تھا اور بولنے کیلئے الفاظ اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ گزشتہ برس سقوط ڈھاکہ پر میرا مضمون "پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی" نے اس کا یہ حال کر دیا تھا اور اس کا مطالبہ نہیں بلکہ پرزور اصرار ہے کہ ہم نے اپنی غلطیوں سے کچھ نہیں سیکھا اور ہمارے ملک میں ایک مرتبہ پھر ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے ہیں جن کو بیان کرتے ہوئے بھی خوف آ رہا ہے۔ اسے میری تحریروں میں اب مایوسی نظر آ رہی ہے کہ میں ہمت ہار بیٹھا ہوں اور مجھے اپنے قلم کو دوبارہ اسی پرانے عزم کے ساتھ حرکت دینی ہو گی۔ اس مطالبے کی تائید میں اور بھی بہت سے نوجوانوں کا صرار شامل ہے اور یقین کریں کہ میں خود بھی محسوس کر رہا ہوں کہ میری تحریر میں ایک بیزاری اور لاتعلقی جگہ بنا رہی ہے۔ وہ تلخی، وہ آگ اور وہ سلگتا ہوا درد ختم ہوتا جا رہا ہے جو میرے قلم کی پہچان تھی حالانکہ میری ہمیشہ سے کوشش رہی ہے کہ اپنے رب کی بتائی ہوئی قلم کی تحریم کا خیال رکھتے ہوئے اسے ہمیشہ اپنی عقبیٰ اور آخرت کی نجات کا وسیلہ بنا سکوں۔

ہر بار میں خود کو یہی جواب دیتا ہوں، کوئی نیا موضوع نہیں کوئی نیا ایشو نہیں اور یہی جواز حسین کے سامنے بھی پیش کیا۔ اب مہنگائی پر اور کتنے کالم لکھے جا سکتے ہیں، بیروزگاری جہالت اور بیماری پر کوئی کہاں تک لکھ سکتا ہے؟ بدامنی، لوٹ کھسوٹ، کرپشن، دفتری تاخیر، سرخ فیتہ اور سیاسی کروفریب پر کتنے ٹن مضامین چھاپے جا سکتے ہیں؟ آکر انسانی دماغ کی بھی ایک حد ہوتی ہے، آپ دہائی سیاپا بھی ایک حد تک کر سکتے ہیں۔ بچہ ماں کو کتنا پیارا ہوتا ہے، بچہ مر جائے تو ماں بین کرتی ہے، روتی چلاتی ہے لیکن کتنی دیر تک؟ ایک گھنٹہ، ایک دن، ایک ہفتہ، آخر بین چیخوں، چیخیں سسکیوں اور آہوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں، دل مضطرب کو چین آ جاتا ہے، ایک ہلکی سی کسک درد کی ایک آہٹ میں تبدیل ہو کر باقی رہ جاتی ہے۔

لکھاریوں کی تحریریں ایک بین، ایک چیخ ہوتے ہیں۔ یہ چیخ یہ بین بتاتے ہیں کہ لوگو! تمہارے ساتھ ظلم ہو گیا، تم لٹ گئے، تم برباد ہو گئے۔ اس چیخ، اس بین پر لوگ متوجہ ہو جائیں اور ظالم ٹھٹک کر رک جائے تو لکھاری کا فرض پورا ہو گیا لیکن اگر ظالم ان چیخوں، ان بینوں کے باوجود ظلم کرتا رہے، ایک لمحے کیلئے اس کا ہاتھ نہ رکے، اس کے ماتھے پر شرمندگی کا پسینہ تک نہ آئے، تو وہ چیخ، وہ بین ایک فضائی آلودگی کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ لوگ بھی اگر اس چیخ معمولی سمجھیں اور ایک روٹین کا درجہ دے دیں تو بھی یہ چیخیں یہ بین آوازوں کے جنگل میں ایک سوکھی سڑی جھاڑی اور ایک کچلی گھاس اور اس بین کو سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ چوکیدار کے "جاگتے رہو" کے اعلان سے اگر چور گھبرائیں اور نہ ہی اہلِ محلہ کی آنکھ کھلے تو چوکیدار کیا کرے گا؟ اس کی پتلیوں میں بھی نیند ہچکولے لے گی، اس کا ضمیر بھی جمائیاں لینے لگے گا۔

یقین کیجئے میں جب لکھنے بیٹھتا ہوں تو خود سے سوال کرتا ہوں، کس کیلئے لکھ رہا ہوں؟ ان لوگوں کیلئے جو غلامی سہنے کی عادت، زیادتیاں برداشت کرنے کی خو جن کی نس نس میں بس چکی ہے، جو اپنے اوپر ہونے والے ظلم کی داستان کو بھی ایک افسانہ سمجھ کر پڑھتے ہیں، جو اپنے قتل کے گواہ پر ہنستے ہیں یا اس حکومت کیلئے جو خدا ترسی کی اپیل کو پاگل اور قنوطیوں کا "واویلا" سمجھتی ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچ چکا ہوں آپ بیل کو لیکچر کے ذریعے چیتا نہیں بنا سکتے۔

بھیڑیئے کے دل میں بھیڑ کیلئے ہمدردی بھی نہیں جگا سکتے، لہٰذا میرے انتہائی عزیز حسین! سچی بات ہے کہ اعتراف کرتا ہوں کہ سیاپے کی یہ نائین (پیغام دینے والی مائی) تھک چکی ہے۔ آخر قبرستانوں میں اذان دینے کی ایک حد ہوتی ہے!

انسانوں نے بھوک وافلاس، غربت وبیروزگاری سے تنگ آکر چوریاں وڈاکے ڈالے ہیں، خودکشیاں کی ہیں، جرم کی دنیا کا راستہ اختیار کیا ہے اور کچھ نہیں بن سکا تو اس علاقے سے ہجرت اختیار کرلی ہے لیکن جس معاملے کو انہوں نے ایک لمحے کیلئے، ذرا سے توقف کیلئے بھی برداشت نہیں کیا وہ تضحیک تھی، کیونکہ عزت نفس ایک ایسی متاع ہے کہ جس کے لٹ جانے کے رنج پر انسان وہ بپھرا ہوا شیر بن جاتا ہے کہ اس کے پنجے واپس نہیں مڑتے کہ جب تک انتقام نہ لے لیں۔ ول ڈیورانٹ نے اس تاریخی مائلے کو اپنی مشہور زمانہ کتاب "ہیروز آف دی ہسٹری" میں اس طرح تحریر کیا ہے کہ، تاریخ میں انقلاب معاشی حالات اور مجبوریاں نہیں لاتیں بلکہ تاریخ کے بگڑے ہوئے بچے لوگوں کی تضحیک اور تمسخر سے وہ لمحہ قریب کرلیتے ہیں جہاں لوگ خونخوار بھیڑیوں کی طرح ایوانوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔

اس کی ایک ادنی سی مثال اور جھلک انقلاب فرانس میں بھی تلاش کی جاسکتی ہے۔ والٹیئر ایک معمولی ڈرامہ نویس تھا جس کے ڈرامے معاشرے کی محرومیوں پر ایک بھرپور طنز ہوا کرتے تھے، جن کو دیکھ کر فرانس کے لوگوں کو اپنی ہی زندگی کے کردار نظر آتے تھے اور وہ اپنا سارا غم وغصہ بھول کر چین کی نیند سو جاتے تھے۔ ان ڈراموں کی مقبولیت دیکھ کر شاہ فرانس کا ایک منہ چڑا مشیر روہان حسد سے جلنے لگا اور بادشاہ کے کان بھرنے شروع کر دیئے جس کی بناء پر والٹیئر ایک سال کیلئے پیرس بدر کردیا گیا۔ والٹیئر اپنی پیرس بدری کے بعد جب واپس آیا تو اس کے قلم نے کسی بھی انتقامی کاروائی سے اجتناب کیا۔ پیرس واپسی پر اس نے دوبارہ لوگوں کی محرومیوں پر لکھنا شروع کردیا لیکن اس دفعہ روہان نے والٹیئر کو اپنے بھرے دربار میں طلب کر کے اس کی شدید بے عزتی اور تضحیک کی جس کا بالآخر والٹیئر نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ لوگوں نے بیچ بچاؤ کر کے معاملہ رفع دفع تو کروادیا لیکن ایک عورت جو والٹیئر کی بے حد مداح تھی اس سارے معاملے کو دیکھ کر بیہوش ہوگئی لیکن روہان نے والٹیئر کے گھر اپنے چند غنڈوں کو بھیج کر والٹیئر کو اس کے گھر سے نکال کر سب لوگوں کے سامنے بری طرح مارا پیٹا اور خود وہاں پاس کھڑا مسکراتا رہا۔

والٹیئر جب اپنی توہین وتضحیک، کھلم کھلا مار پیٹ اور تمسخر کی شکائت کرنے بادشاہ کے محل میں چند لمحوں کی بھیک مانگنے گیا تو محل کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ یہ وہ لمحات تھے جس نے والٹیئر کو ڈرامہ نگار سے ایک کالم نویس اور فلسفی بنادیا۔ اس کے قلم نے لوگوں کی سوچوں کا دھارا تبدیل کردیا۔ لوگوں کو والٹیئر کی تحریروں کا شدت سے انتظار رہتا تھا۔ والٹیئر کی مقبولیت دن بدن بڑھ رہی تھی اور لوگوں نے اس کو اپنا مسیحا سمجھنا شروع کردیا۔ ادھر روہان اور اس کے حواری بادشاہ کو والٹیئر کی مقبولیت سے ڈرا کر اس کی تحریروں اور کتابوں پر پابندی لگواتے رہے۔ والٹیئر کی کتاب نیچرل لاء پر پابندی لگا کر اس کی تمام کاپیوں کو سرعام بازار میں آگ لگادی گئی۔ اب والٹیئر کی کتابیں خفیہ طور پر چھپتی رہیں اور لوگوں میں تقسیم ہوتی رہیں۔ والٹیئر کے تحریر کردہ کالم اور پمفلٹ متوسط درجہ کے لوگوں کی دل کی آواز بن کر ابھرے۔ بالآخر بادشاہ نے والٹیئر کو ملک بدر کر کے برطانیہ بھجوادیا مگر والٹیئر کی تحریروں میں مزید شدت آگئی۔

والٹیئر کے الفاظ دہکتے انگاروں کی مانند بادشاہ اور اس کے حواریوں پر برسنے لگے اور بالآخر وہ وقت آن پہنچا جب فرانس کے لوگوں نے بادشاہ لوئی اور اس کے حواریوں کو ایک بڑے چھرے یعنی گلیوٹین کے نیچے رکھ

تضحیک اور توہین ہر معاشرے میں کرذبح کر دیا۔اس نے اپنی موت سے پہلے اس بات کا قرار کیا کہ انقلاب فرانس والٹیئر اور روسو کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ایک والٹیئر کو جنم دیتی ہے اور انجام بھی بادشاہ لوئی سے مختلف نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات تو اس سے بھی زیادہ خوفناک پاکستانی قوم کی تضحیک اور توہین کا سلسلہ تو اس دن شروع ہو گیا تھا جب ہم نے اپنے ایک شہری ایمل کانسی کو خود اپنے ہاتھوں سے پکڑ کر قصر سفید کے فرعون کے حوالے کیا تھا۔ ہم اگر اس وقت یہ مطالبہ کرتے کہ جناب! آپ اپنا وکیل لائیں اور ساری دنیا کے میڈیا کے سامنے ہم ایمل کانسی کا ٹرائل کریں گے لیکن مقدمہ ہماری عدالت میں چلے گا لیکن اس کے برعکس ہم نے پاکستان کی کسی بھی عدالت کو بتائے بغیر ایمل کانسی کو قصر سفید کے فرعونی مذبح خانے کے حوالے کر دیا اور اس کے بدلے میں بخوشی ڈالروں کا بھرا تھیلا ہمارے حکمرانوں کے ہاتھوں میں تھما دیا گیا۔اسی لئے امریکی اٹارنی جنرل نے برملا عدالت میں کہا کہ پاکستانی تو صرف بیس ہزار ڈالروں کے عوض اپنی ماں کو بھی فروخت کر دیتے ہیں اور امریکی اٹارنی جنرل کے اس فقرہ کو دنیا کے سارے میڈیا نے نشر کیا۔ یہ انتہائی غلط اور تضحیک آمیز رسم ہماری سول حکومت کے دور اقتدار میں انجام پائی اور اس کے کچھ عرصہ بعد کمانڈو پرویز مشرف نے اپنے پیشرؤں کو بھی مات کر دیا۔امریکیوں نے باجوڑ میں ایک مدرسہ پر گائیڈڈ میزائل داغ کر معصوم اور بے گناہ 80 سے زائد بچے اور جوان شہید کر دیئے۔ ہمارے کمانڈو نے نہ صرف سیکورٹی کونسل سے رجوع نہیں کیا بلکہ تابعدار خوشامدیوں کی طرح فوراً اس کی ذمہ داری خود قبول کر لی کہ یہ میزائل ہم نے مارا ہے۔اس سے اگلے ہی دن امریکیوں نے طمانچہ رسید کرتے بیان دے دیا کہ یہ میزائل حملہ انہوں نے کیا ہے اور آئندہ بھی اپنے اہداف پر ایسے حملے جاری رکھیں گے۔

فاسق کمانڈو بڑے فخر سے اپنی سوانح حیات کے صفحہ 237 پر اعتراف کرتا ہے کہ اگر کوئی عادتاً الزام تراشی کرتے ہوئے ہم سے یہ کہتا ہے کہ ہم نے "وار آن ٹیرر" کے حوالے سے کچھ نہیں کیا تو وہ صرف سی آئی اے سے یہ پوچھ لے کہ انہوں نے کتنی رقم انعام کے طور پر پاکستان کو ان خدمات کے صلے میں دی ہے۔اسی صفحے میں مزید لکھا کہ ہم نے 689 افراد گرفتار کر کے ان میں سے 369 افراد امریکا کے حوالے کر کے ملینز آف ڈالر کمائے!!! نجانے ہماری مظلوم بیٹی عافیہ صدیقی، ہمارے بے گناہ بھائی مسعود جنجوعہ، سیف اللہ پراچہ، ڈاکٹر عتیق الرحمان، ڈاکٹر عابد شریف، فیصل فراز، ماجد خان اور دوسرے قیمتی پاکستانیوں کی کتنی قیمت ان خونخوار درندوں نے وصول کی ہو گی۔600 سے زائد کی فہرست تو بیکس و مجبور بہن آمنہ جنجوعہ نے ترتیب دے رکھی ہے جس کو تھامے برسوں وہ جمہوری حکومت کے ایوانوں کے سامنے ہر جگہ دہائی دیتی رہی کہ ہمارے پیاروں کو ہمارے حوالے کر دو، ہم تم کو امریکا سے زیادہ تاوان دینے کو تیار ہیں۔ ہماری توہین اور تضحیک کا یہ سلسلہ اب بند کرو کہ دکھی ماؤں بہنوں اور بچوں میں مزید انتظار کا حوصلہ باقی نہیں رہا۔ افسوس کا مقام یہ ہے ہمارے حکمرانوں نے اپنے پیشرووں کی طرح اپنی بزدلی اور بے حمیتی کے سبب امریکیوں کے ساتھ ایک ایسا رشتہ استوار کر رکھا ہے جس میں وہ آقا ہیں اور ہم ان کے غلام۔

اسی رویہ کو دیکھتے ہوئے بھارتی بنئے نے امریکی آقاؤں کی حمائت سے پاکستان کو ڈرانے اور خوفزدہ کرنے کی وہ سب آزمودہ تراکیب استعمال کرنا شروع کر دی ہیں۔ بھارتی مطالبے سے پہلے ہی ہم نے اپنے ملک کی چند بڑی فلاحی اور رفاہی تنظیموں پر پابندی لگا کر اپنے افراد کو گرفتار کر کے گویا اعتراف جرم کر لیا ۔سلامتی کونسل میں اپنے پرانے دیرینہ مخلص دوست چین کو بھارت کی چال کے خلاف ویٹو استعمال کرنے سے منع کر دیا۔اس خبر کے عام ہونے پر وطن عزیز میں ایک بوکھلاہٹ کا سماں پیدا ہو گیا اور قوم ابھی اس صدمے سے سنبھلی نہیں تھی کہ دو بھارتی طیاروں نے دن دیہاڑے پاکستان کی فضائی خلاف ورزی کر کے اپنے ناپاک ارادوں کی تکمیل کی جسارت کر ڈالی، یہ تو اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے شاہین فوراً ان کی طرف لپکے اور وہ ناکام و نامراد لوٹے لیکن ہمارے حکمرانوں نے اسے تکنیکی غلطی قرار دیتے ہوئے بھارت کی صفائی دینی شروع کر دی جبکہ پاکستان کو بھارت کے اس عالمی جرم سے سلامتی کونسل کو

آگاہ کرنا بہت ضروری تھا لیکن ہم نے ایک اور تضحیک کا بوجھ اٹھالیا۔

ہم رحمٰن ملک کے میڈیا کے سامنے اس بیہودہ اعترافی بیان کو کیسے بھول جائیں جب اس نے اجمل قصاب کو بھارت کی ایک جیل میں پھانسی دینے سے چند دن قبل ممبئی حملوں کے بارے میں بھارت کو جماعت الدعوہ کے امیر حافظ سعید صاحب اور دیگر پاکستانی افراد کے صوتی نمونے فراہم کرنے کا اعلان کیا تھا ۔ ہماری تضحیک کی آئے دنوں اس لئے جرأت ہو رہی ہے کہ 16 دسمبر پاکستان کو دولخت کرنے کے تاریخ سے نہ ہی حکمرانوں نے اور نہ ہی عوام نے کچھ سیکھا اور امریکا نے ہماری فوجی اکیڈمی کے پہلو میں اپنے جنگی ہیلی کاپٹروں میں اپنے درندوں کے ہاتھوں ہماری سرزمین پر اسامہ کو ہلاک کرکے ہمارے سارے بیانئے پر کالک پھیر کر ہمیں بدنامی اور تضحیک کے سمندر کے عین بیچ میں غرق کر دیا ہے۔

ہمیں اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ بھارت نے پہلے دن سے پاکستان کو دل سے تسلیم نہیں کیا۔ اکھنڈ مہابھارت کا خواب وہ اب بھی اپنی آنکھوں میں سجائے بیٹھا ہے۔ بھارتی انتہا پسندوں کو شروع دن سے یہ خطرہ ہے کہ پاکستان اگر اس خطے میں طاقتور ہو گیا تو اس کے تین ایسے بڑے نقصان ہوں گے جن کی وجہ سے ان کے مستقبل کے سارے سہانے خواب چکنا چور ہو جائیں گے۔ پہلا ان کے اکھنڈ مہابھارت کی تکمیل کا خواب ادھورا رہ جائے گا اور دوسرا ان کا کشمیر پر یہ دیرینہ اٹوٹ انگ کا راگ بے سرا ہو کر رہ جائے گا اور تیسرا ان کے توسیع پسندانہ عزائم کہ بحر ہند کے تمام ساحلوں پر بسنے والے ممالک پر بھارت کی اجارہ داری ہو، ایسا مضبوط پاکستان کی موجودگی میں ممکن نہیں ہو گا۔ انہی خطرات کی بنیاد پر اسرائیل بھی پاکستان کو اپنا پہلا اور سب سے بڑا دشمن گردانتا ہے کہ ایٹمی صلاحیت کے حامل پاکستان کی موجودگی میں اسرائیل اپنی سرحدوں کو مزید وسعت دینے سے قاصر رہے گا۔ ہنود اور یہود اس بات پر متفق ہیں کہ اب جنگ کی صورت میں پاکستان کو مٹانا آسان نہیں رہا اس لئے سازشوں کے ذریعے پاکستان کے اندر خلفشار برپا کرکے اس کو اندرونی طور پر اس قدر کمزور کر دیا جائے کہ ان کے ناپاک مقاصد بغیر جنگ کے پورے ہو جائیں جس کیلئے انتہاء پسندی سے بہتر انہیں کوئی اور معاون نہیں مل سکتا۔

میرے عزیز پروفیسر حسین! یقین کریں، ہمارے قبرستان ان لوگوں سے بھرے پڑے ہیں جو اپنے حق کیلئے نہیں لڑے کہ کہیں مارے نہ جائیں۔ آپ بطور استاد اپنے طالب علموں میں حق کہنے کا جذبہ اجاگر کر دیں تو میں یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے آنسو ہمارے ملک کی عاقبت سنوار دیں گے۔

اس نقش پا کے بوسے نے یاں تک کیا ذلیل
میں کوچہ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

بروز جمعرات 12 جمادی الاوّل 1443ھ 16 دسمبر 2021ء

آزادی یا غلامی؟ فیصلہ ترے ہاتھ میں!

آزادی کوئی ایسی شے نہیں ہے جسے ناپا یا تولا جا سکے اس لئے اسے سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ انسان غلامی کا مفہوم سمجھ جائے آزادی کا مطلب از خود اس کی سمجھ میں آجائے گا۔ قرآن میں حضرت موسیٰؑ کا قصہ بڑی تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ اس جلیل القدر نبی کی بعثت اس وقت ہوئی جبکہ ان کی قوم بنی اسرائیل کو فرعون نے غلام بنا رکھا تھا۔ سورۂ شعراء میں اس واقعہ کا بیان کچھ یوں ہے:

وَإِذْنَادَىٰ رَبُّكَ مُوسَىٰ أَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ قَوْمَ فِرْعَوْنَ أَلَا يَتَّقُونَ "اور (وہ واقعہ یاد کیجئے) جب آپ کے رب نے موسیٰ (علیہ السلام) کو ندا دی کہ تم ظالموں کی قوم کے پاس جاؤ (یعنی) قومِ فرعون کے پاس، کیا وہ (اللہ سے) نہیں ڈرتے"۔

یہ حکم حضرت موسیٰؑ کو ایک ایسے وقت میں دیا گیا جب وہ ایک طویل جلاوطنی کی زندگی گزار کر اپنے اہل خانہ کے ساتھ بے یار و مددگار مدین سے واپس لوٹ رہے تھے۔ حضرت موسیٰؑ نے بارگاہِ خداوندی میں اپنی مجبوری و ناسپاسی کا اظہار اس طرح کیا کہ:

قَالَ رَبِّ إِنِّي أَخَافُ أَن يُكَذِّبُونِ وَيَضِيقُ صَدْرِي وَلَايَنطَلِقُ لِسَانِي فَأَرْسِلْ إِلَىٰ هَارُونَ لَهُمْ عَلَيَّ ذَنبٌ فَأَخَافُ أَن يَقْتُلُونِ "اے رب! میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلا دیں گے، اور (ایسے ناسازگار ماحول میں) میرا سینہ تنگ ہو جاتا ہے اور میری زبان (روانی سے) نہیں چلتی سو ہارون (علیہ السلام) کی طرف (بھی جبرائیل علیہ السلام کو وحی کے ساتھ) بھیج دے (تاکہ وہ میرا معاون بن جائے) اور ان کا میرے اوپر (قبطی کو مار ڈالنے کا) ایک الزام بھی ہے سو میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر ڈالیں گے۔

موسیٰ کلیم اللہؑ کی دلگداز عرضداشت کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے: قَالَ كَلَّا فَاذْهَبَا بِآيَاتِنَا إِنَّا مَعَكُم مُّسْتَمِعُونَ أْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُولَا إِنَّا رَسُولُ رَبِّ الْعَالَمِينَ أَنْ أَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ "ہر گز نہیں، پس تم دونوں ہماری نشانیاں لیکر جاؤ بیشک ہم تمہارے ساتھ (ہر بات) سننے والے ہیں، پس تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اور کہو: ہم سارے جہانوں کے پروردگار کے (بھیجے ہوئے) رسول ہیں، (ہمارا مدعا یہ ہے) کہ تو بنی اسرائیل کو (آزادی دے کر) ہمارے ساتھ بھیج دے"۔ بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ لیجانے کا مطالبہ دراصل ان کی آزادی کا تازیانہ تھا۔ اس کے جواب میں فرعون نے ایک تو یہ کیا کہ پہلے اپنے احسان گنائے اور پھر احساسِ جرم کا شکار کر کے ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی۔ آج بھی عوام کو اپنا غلام بنانے کیلئے یہی دو حربے آزمائے جاتے ہیں۔

بھارتی انتخابات کے دوران کیا ہوتا ہے؟ عوام کو احسانات یاد دلائے جاتے ہیں۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ ہم نے انگریزی سامراج سے جنگ کی۔ ہم نے تمہیں آزادی دلائی۔ ہم نے تمہیں تحفظ فراہم کیا۔ ہمارے دم سے تم امن و سلامتی کی زندگی گزار رہے ہو۔ تمہاری ساری خوشحالی کا سبب ہماری عنایات ہیں وغیرہ وغیرہ لیکن محض ان غیر حقیقی احسانات کے اعادہ پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ اسی کے ساتھ کبھی اپنے آپ سے تو کبھی مخالفین سے بلواسطہ اور بلاواسطہ خوفزدہ بھی کیا جاتا ہے۔ پس پردہ سازش کر کے فرقہ وارانہ فسادات کروائے جاتے ہیں اور پھر مظلوموں کے آنسو پونچھے جانے کا ناٹک کیا جاتا ہے۔ صدر اقلیتوں کے زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کرتا ہے، وزیر اعظم وجوہات کا پتہ لگانے کی یقین دہانی کراتا ہے۔ اس قدر عظیم سانحہ جس میں 77 لوگ جان بحق ہو جائیں اور 4 لاکھ بے گھر کی وجوہات کا تک اگر وزیر اعظم کو ایک ماہ بعد تک پتہ نہ ہو تو اسے لال قلعہ پر یوم آزادی کے پرچم کشائی اور بلند باگ دعووں کا کوئی حق نہیں۔ مودی حکومت کے ذریعہ ایک طرف کسانوں کو خودکشی پر مجبور کرنے والے سودی نظام کو فروغ دیا جاتا ہے اور پھر ان کی باز

آباد کاری کیلئے سرکاری خزانہ سے امداد کا اعلان کیا جاتا ہے۔اس منافقت کے علاوہ وعدوں کا ایک لا متناہی سلسلہ بھی ہند تو اانتخابی سیاست کی اہم ترین شناخت ہے جنہیں اب کوئی سنجیدگی سے نہیں لیتا اس لئے کہ وعدہ کرنے والے سیاسی رہنما اور رائے دہندگان دونوں جانتے ہیں کہ یہ سب جھوٹ اور ووٹ لینے کا بہانہ ہے اور ان کو شاذ و نادر ہی پورا کیا جائے گا۔

ہمارے ہاں بھی معاملہ کچھ اس سے مختلف نہیں بلکہ اقتدار حاصل کرنے کیلئے بعض معاملات میں ہم مودی سرکار سے بھی کئی ہاتھ آگے ہیں۔ پچھلی حکومتوں کی بداعمالیوں اور ملک لوٹنے کے جتنے الزامات لگا کر جو اقتدار حاصل کیا، پہلے چند مہینوں میں بڑے دھڑلے سے یوٹرن لیتے ہوئے اسے سیاسی بالغ نظری قرار دیکر بڑے تفاخر سے اپنی حکومت کی کامیابی کے جھنڈے لہرائے جارہے ہیں۔ قوم جب اپنی بے بسی ولاچاری کے ہاتھوں چیخ وپکار کرتے ہیں تو ان کو "گھبرانا نہیں "کا لالی پاپ دیکر خاموش کروانے کی کوشش ناتمام کی جارہی ہے۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ اپنی اس ناکام کارکردگی کے بعد نئی قانون سازی کے بل پاس کرکے اپنے اگلے انتخابات جیتنے کیلئے راہیں ہموار کرنے کیلئے عالمی طور پر ناکام ہونے والا انتخابی نظام نافذ کرنے کیلئے اس غریب ومفلوک الحال قوم کا 80/ارب روپے کی کثیر رقم اس پر خرچ کی جارہی ہے۔

فرعون نے حضرت موسیٰؑ کو یوں مخاطب کرکے کہا تھا:قَالَ أَلَمْ نُرَبِّكَ فِينَا وَلِيدًا وَلَبِثْتَ فِينَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِينَ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِي فَعَلْتَ وَأَنتَ مِنَ الْكَافِرِينَ "کیا ہم نے تمہیں اپنے یہاں بچپن کی حالت میں پالا نہیں تھا اور تم نے اپنی عمر کے کتنے ہی سال ہمارے اندر بسر کئے تھے،اور (پھر) تم نے اپنا وہ کام کر ڈالا جو تم نے کیا تھا (یعنی ایک قبطی کو قتل کر دیا) اور تم ناشکر گزاروں میں سے ہو (ہماری پرورش اور احسانات کو بھول گئے ہو)"

اس طرح کی صورتحال میں ایک حریت پسند رہنما کو کیا موقف اختیار کرنا چاہئے اور کس جرأتمندی کے ساتھ اس کا اظہار کرنا چاہئے اس کی مثال حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے جواب میں ہے،انہوں نے فرمایا:قَالَ فَعَلْتُهَا إِذًا وَأَنَا مِنَ الضَّالِّينَ فَفَرَرْتُ مِنكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِي رَبِّي حُكْمًا وَجَعَلَنِي مِنَ الْمُرْسَلِينَ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدتَّ بَنِي إِسْرَائِيلَ "جب میں نے وہ کام کیا میں بے خبر تھا (کہ کیا ایک گھونسے سے اس کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے) پھر میں (اس وقت) تمہارے (دائرہ اختیار) سے نکل گیا جب میں تمہارے (ارادوں) سے خوفزدہ ہوا پھر میرے رب نے مجھے حکم (نبوت) بخشا اور (بالآخر) مجھے رسولوں میں شامل فرما دیا،اور کیا وہ (کوئی) بھلائی ہے جس کا تو مجھ پر احسان جتا رہا ہے (اس کا سبب بھی یہ تھا) کہ تو نے (میری پوری قوم) بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا"۔

حضرت موسیٰؑ نے بات کا رخ پھر آزادی وغلامی کی جانب موڑ دیا اور ببانگ دہل فرعون کے سامنے اعلان کیا کہ تمہارے دربار میں میری پرورش یہ کوئی پسندیدہ فیصلہ نہیں تھا بلکہ مجبوری تھی۔ اگر بنی اسرائیل کو غلام نہ بنایا گیا ہوتا اور ان کے لڑکوں کو قتل کرنے کا سلسلہ جاری نہ ہوتا تو کیوں میری ماں مجھے ایک ٹوکری میں رکھ کر دریائے نیل میں بہاتی؟ گویا اس پرورش کیلئے فرعون کا جبر اور بنی اسرائیل کی غلامی سزاوار ہے نیز قبطی قتل کیلئے موسیٰؑ کو ذمہ دار

ٹھہرانا ایسا ہی ہے جیسے تقسیم ہند کیلئے مسلمانوں کو قصوروار کہنا۔ کوئی ان وجوہات کو جاننے کی کوشش نہیں کرتا جن میں جناح جیسے رہنما نے الگ ہونے کا فیصلہ کیا اور اگر جسونت سنگھ اپنی کتاب میں سچ لکھتا ہے تو تمام متعصب ہندو اور اپنے پرائے سب دشمن بن جاتے ہیں۔ قبطی کا قتل اس لئے ہوا وہ کہ وہ بنی اسرائیل کے ایک شخص پر وہ ظلم وزیادتی کر رہا تھا جن کو زمین میں فرعون کے حکم سے غلام بنا کر رکھا گیا تھا۔ ان کو مساوات وعدل جیسے بنیادی حقوق سے محروم کر دیا گیا تھا۔ ان کے اوپر مظالم کرنے والے قبطیوں کی کوئی سرزنش حکومت یا عدالت کی جانب سے نہیں ہوتی تھی۔ قرآنِ عظیم میں اس کی تصدیق اس انداز میں کی گئی ہے کہ :

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ "بیشک فرعون نے زمین میں غلبہ پایا تھا اور اس کے لوگوں کو اپنا تابع بنایا ان میں ایک گروہ کو کمزور دیکھتا، ان کے بیٹوں کو ذبح کرتا اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھتا، بیشک وہ فسادی تھا"۔

اہل ایمان کے ساتھ دنیا کی مختلف نام نہاد جمہوریتوں مثلاً امریکا، فرانس، اسرائیل، ہندوستان اور برما میں یہ سلسلہ اب بھی جاری وساری ہے۔ غلامی کا کوئی لیبل نہیں ہوتا کہ غلام قوم پر چسپاں کر دیا جائے بلکہ حکمرانوں کا کسی ایک طبقہ کے تئیں اختیار کیا جانے والا ایک خاص رویہ مثلاً بنیادی حقوق سے محرومی یا امتیازی سلوک ہوتا ہے۔ جس سے تمام لوگوں کو پتہ چل جاتا ہے کہ کون غلام ہے اور کون آقا؟ انگریز اپنے سامراج کے اندر رہنے بسنے والے آزاد لوگوں کو برطانوی شہری اور غلام قوم کے باشندوں کو سبجیکٹ بائی برتھ یعنی پیدائشی ماتحت یا غلام لکھتے تھے جس سے اسے پتہ چل جاتا تھا کہ وہ کون ہیں اور ان کی حیثیت کیا ہے؟ وہ اپنے خاص باغوں بلکہ ریل گاڑی کے فرسٹ کلاس میں تختی لگا دیتے تھے کہ ہندوستانیوں اور کتوں کا داخلہ ممنوع ہے۔

آج کل کسی کے پاسپورٹ پر لکھا تو نہیں جاتا لیکن غلامانہ سلوک بہر حال کیا جاتا ہے اسی لئے جیل کی چہار دیواری کے قتیل صدیقی کو جو دہشتگرد ہلاک کر دیتے ہیں ان پر کوئی کاروائی نہیں ہوتی بلکہ اسی شہر پونے میں ہونے والے دھماکوں کیلئے قتیل کے قاتلوں کے بجائے قتیل کے رشتہ داروں پر شک کیا جاتا ہے۔ دیانند پاٹل جس کے ہاتھوں میں بم پھٹ گیا اس کے سیکڑوں ہندو دوستوں کو چھوڑ کر دو مسلم دوستوں کی تلاش میں پولس سیکڑوں میل کا سفر کر کے اس کے آبائی وطن پہنچ جاتی ہے۔ ممبئی میں مسلمانوں کے جلوس پر گولی چلانے کے بعد پولس مرنے والوں کے قتل کا الزام مظاہرین پر جڑ دیتی ہے۔ تیسری دنیا کے ملک ہندوستان ہی میں سب ہوتا ہے، ایسا نہیں ہے بلکہ اپنے آپ کو انسانی حقوق کا سرخیل کہنے والے امریکا میں ایک ایرانی خاتون شہرزاد کو محض اس لئے گرفتار کر لیا جاتا ہے کہ اس کے سابق شوہر محمد سیف نے اندھیرے میں استعمال کئے جانے والی عینک آسٹریا سے ایران برآمد کئے تھے۔ جڑواں بچوں کی یہ ماں 5 سال جیل میں گزارنے کے بعد ابھی حال میں رہا ہوئی ہے۔ اسے کہتے ہیں غلامی کا سلوک جو دنیا کی سب بڑی جمہوریت میں روا رکھا جاتا ہے مگر ظلم کی یہ چکی ہمیشہ نہیں چلتی جب مشیت کا فیصلہ نافذ ہوتا ہے تو بازی الٹ جاتی ہے اور جن لوگوں کو زمین میں کمزور بنا کر رکھا گیا تھا انہیں رہنمائی کے منصب پر فائز کر دیا جاتا ہے جیسا کہ بنی اسرائیل کی بابت ارشاد ربانی ہے: وَنُرِيْدُاَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِى الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ "اور ہم یہ ارادہ رکھتے تھے کہ مہربانی کریں ان لوگوں پر جو زمین میں ذلیل کر کے رکھے گئے تھے اور انہیں پیشوا بنا دیں اور انہی کو وارث بنائیں۔

حقیقی اسلامی آزادی کا اگر مصنوعی جمہوری آزادی سے موازنہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ مؤخر الذکر عوام کو بولنے کا حق تو دیتی ہے لیکن حکمران کیلئے ان کی بات ان سنی کر دینے کا حق بھی بحال رکھتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فصیح محمود کے اہل خانہ دربدر ٹھوکریں کھاتے تھک جاتے ہیں مگر نہ حکومت کی

کان پر جوں رینگتی ہے اور نہ عدالت فریاد رسی کرتی ہے۔ انا ٹیم چیختے چیختے تھک ہار کر بیٹھ جاتی ہے لیکن کوئی اس کے مطالبے پر کان نہیں دھرتا۔ بابا رام دیو کو ایک حد تک چیخنے چلاّنے کی اجازت دی جاتی ہے اور پھر انہیں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس اسلام کی آزادی میں خلیفۂ وقت عمر بن خطابؓ لوگوں سے پوچھتے ہیں کہ اگر میں غلطی کروں تو تم کیا کرو گے۔ ایک بدو بھرے مجمع میں جواب دیتا ہے کہ ہم تمہیں اس تلوار سے درست کر دیں گے اس پر وہ اللہ رب العزت کا شکر ادا کرتے ہوئے کہتے ہیں جب تک اس جیسے لوگ ہمارے بیچ ہوں گے ہم راہِ راست پر رہیں گے اور یہ صرف کہنے سننے کی بات نہیں ہوتی بلکہ جب ایک بڑھیا مہر کی تحدید کے مسئلہ میں علی الاعلان یہ اعتراض کرتی ہے کہ اے عمرؓ جس چیز کو اللہ نے حرام نہیں کیا اس پر پابندی لگانے والے تم کون ہوتے ہو؟ تو سب کے سامنے حضرت عمرؓ اپنی رائے سے رجوع فرماتے ہوئے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا خلافت کے منصب کو سنبھالتے ہی اعلان فرمانا کہ اگر تم مجھے کسی معاملے میں خلافِ شریعت پاؤ تو میری اطاعت نہ کرنا، اسی حقیقی آزادی کا مظہر ہے جس میں صاحبِ اقتدار عوام کو اپنی اتباع کا پابند نہیں بناتا بلکہ اس کے برخلاف اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرنے کی تلقین کرتا۔ اسلامی تصور آزادی میں معیارِ حق حکمران کی مرضی نہیں بلکہ کتاب و سنت ہے اور عام آدمی کی طرح صاحبِ اقتدار بھی اس کا پابند ہوتا ہے۔ غیر اسلامی نظامہائے سیاست میں حکمراں مختلف قسم کا جواز فراہم کر کے اپنی مرضی کو معیارِ حق بنا کر عوام پر اسے چلانے لگتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے ایسا کرنے کا مجھے موروثی حق ہے، کوئی اپنی نسلی برتری کو قائم رکھنے کیلئے اسے جائز قرار دیتا ہے، کسی کے نزدیک ایسا کرنا قومی و ملکی مفاد میں ہوتا ہے تو کوئی اپنے آپ کو جمہور کا نمائندہ بنا کر اس حق کو حاصل کر لیتا ہے اور اپنی من مانی کرتا ہے لیکن صرف اور صرف اسلامی نظام ایسے ہر جواز سے مبرّا ہے جس سے حکمرانوں کی مرضی معیار حق بن جائے اور یہی حقیقی آزادی کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔

یہی وہ جذبۂ حریت ہے جو محمد مرسی سے عہدۂ صدارت سنبھالنے کے بعد یہ اعلان کرواتا ہے کہ ویسے تو سبھی کے حقوق برابر ہیں لیکن مجھ پر تو ذمہ داریاں ہی ذمہ داریاں ہیں یعنی تم تو میری بات سے صرفِ نظر کرنے کا حق رکھتے ہو لیکن میں سربراہ کی حیثیت سے ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ اسلام کی نظر میں حکمران قوم کا خادم ہوتا ہے، وہ نہ صرف اپنے بلکہ اپنی رعایا کیلئے جوابدہ ہوتا ہے اور یہی حقیقی آزادی کا وہ سرچشمہ ہے جس سے مصنوعی آزادی کے سارے نظریات یکسر محروم ہیں۔ بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دیگر نظامہائے سیاست میں حکمراں طاقتور اور رعایا کو کمزور بنا دیا گیا اس کے برعکس اسلام میں قائد کو کمزور کر دیا گیا ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ اسلام میں چونکہ الوہیت اور ملوکیت اللہ رب العزت کیلئے ہے اس لئے اس کے آگے سب کے سب بے بس ہیں لیکن آپس میں وہ ایک دوسرے کے برابر ہیں۔ سب مل کر اسی ایک خالق و مالک کی اطاعت کرتے ہیں اسی کی بندگی بجالاتے ہیں اسی کی خوشنودی چاہتے ہیں اور باہم ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں۔ سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ خالق اپنی تخلیق کے چلانے کیلئے کوئی نظام وضع نہ کرتا۔ دنیا کو چلانے کیلئے خالق نے قرآن حکیم میں یہ سارا نظام ہمارے سامنے رکھ دیا ہے اور اب فیصلہ ہمارے ہاتھ میں ہے کہ ہم نے مغربی جمہوری نظام کے دھوکے میں آکر غلامی کا طوق قبول کرنا ہے جس نے بندوں کو بندوں کا غلام بنا کر رکھ دیا ہے یا ہم نے اللہ کی غلامی قبول کر کے دنیا و آخرت کی سرفرازی کی طرف لوٹنا ہے۔

بروز ہفتہ 14 جمادی الاوّل 1443ھ 18 دسمبر 2021ء

آخری تنبیہ

میں بہت بولتا ہوں۔ سب لوگ میرا منہ تکتے رہتے ہیں۔ میں کسی کو موقع ہی نہیں دیتا کہ وہ بھی کوئی بات کرے۔ لوگوں کو گرفت میں لینے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ میں یہ بھی نہیں دیکھتا کہ میرا مخالف کون ہے۔ بڑا ہے، چھوٹا ہے، مرد ہے، عورت ہے، بچے ہیں، بس بلا تکان بولتا رہتا ہوں۔ ہاں میں نے بہت مرتبہ پڑھا ہے "جو خاموش رہا وہ نجات پا گیا" لیکن میں نے اس پر کبھی عمل نہیں کیا۔ شاید کر ہی نہیں سکتا۔ خود پسندی اور اپنی فوں فاں میں مگن، اپنے خیالات کا اسیر اور اپنی چرب زبانی پر نازاں۔

ایک دن بابے نے مجھ سے ایک عجیب سی بات کی "دیکھ پگلے تو بہت بولتا ہے۔ محفل کو دیکھ کر بات کیا کر۔ جس نے دیکھا نہیں اُسے کیا دکھانا۔ ہنسا کر، ہنسایا کر لیکن ہر بات ہر ایک سے نہیں کرنی۔ دیکھ تو آنکھیں، کان کھلے اور اپنی زبان بند رکھ۔ تنہائی سے بات کر، محفل میں خاموش رہ، اکیلے میں محفل سجا اور محفل میں تنہا ہو جا۔"

"واہ، واہ کیا بیکار سی بات کی آپ نے، اچھا، کوئی کام کی بات بتایا کریں۔ خوامخواہ کی بات" میں نے انہیں خاموش کر دیا۔

"او پگلے، تیرا اچھا بھی راہ پر آئے گا۔"

کتنی بد نصیبی ہے، میں اب تک گمراہ ہوں۔ کتنی عجیب سی بات ہے، میں کچھ نہیں جانتا اور جاننے کا دعوے دار ہوں۔ میں اپنے جہل کو علم کہتا ہوں، چرب زبانی کو ذہانت، مکاری کو اخلاص، ہوس کو محبت، چالاکی کو ہنر، دھوکے کو کمال، کراہت کو جمال، اداکاری کو ہتھیار سمجھتا ہوں۔ میں ڈرا ہوا ہوں، سہما ہوا ہوں، خوفزدہ ہوں لیکن خود کو بہت بہادر سمجھتا ہوں۔ میری نیت کچھ اور ہے اور عمل کچھ اور۔ میں صرف اپنی محبت میں گرفتار ہوں اور خود کو آزاد سمجھتا ہوں۔ میں اپنے نفس کی پیروی کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ میں رب کا بندہ ہوں۔

میں رب سے محبت کا دعویٰ کرتا اور بیچ "چوراہا" مخلوق کیلئے آزار بنا رہتا ہوں۔ میرا رونا مکر کا رونا ہے۔ میرے آنسو فریب ہیں۔ میری ہمدردی دکھاوا ہے۔ میرا ایثار تجارتی ہے۔ میرا خلوص بازاری ہے۔ میں مجسم فنکار ہوں۔ تاجر اور نرا تاجر، جو جمع تفریق کرتا رہتا ہے، مکر و فریب کی دنیا کا باسی، ہوس نفس کا پجاری۔ میں کسی کے کام نہیں آتا اور توقع رکھتا ہوں کہ لوگ میرے حضور دست بستہ کھڑے رہیں۔ میں سب کے حقوق غضب کر کے بھی اپنے حقوق کا طلبگار ہوں۔ میں دوسروں کو ان کے فرائض یاد دلاتا رہتا ہوں اور اپنے فرائض کو بھول گیا ہوں۔

میں نے نصیحت کرنے کا آسان کام اپنے لئے منتخب کر لیا ہے اور اس پر عمل کرنے کا مشکل کام مخلوق کیلئے رکھ چھوڑا ہے۔ میں کالم اس لئے نہیں لکھتا کہ اس سے خلق خدا روشنی پائے۔ میں یہ اس لئے لکھتا ہوں کہ مجھے اس سے شہرت مل جائے، اور ناموری کا مجھے چسکا لگ گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ لوگ میری بات سنیں چاہے میں ان کی کوئی بات بھی نہ سنوں۔ میں اوروں کو آئینہ دکھاتا رہتا ہوں اور کوئی مجھے آئینہ دکھائے تو منہ سے جھاگ اڑانے لگتا ہوں۔ اب تو الیکٹرانک میڈیا میں بھی میری شکار گاہ قائم ہو چکی ہے جہاں میری بے مہار گفتار کی بندوق بلا تامل مخالفین کے سروں کا نشانہ لیکر چیتھڑے اڑانے میں ایک لذت محسوس کرتی ہے۔ اینکر خاتون کو پروگرام شروع کرنے میں چند منٹ دیر کیا ہوئی کہ اول فول بکنا شروع کر دیا اور یہ سارا معاملہ آن ائیر چلا گیا لیکن مجال ہے کہ شرمندگی کا شائبہ تک بھی میری جبین ناز پر آیا ہو، اس کے باوجود میں اس عوام سے توقع رکھتا ہوں کہ مجھے راست گو دانشور سمجھتے ہوئے

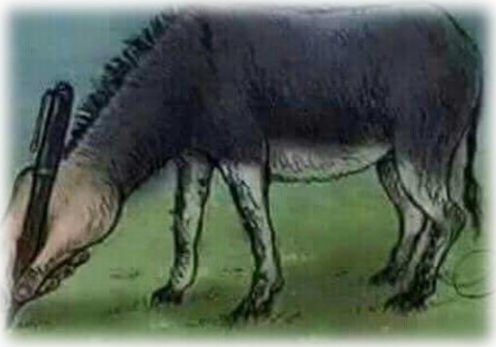

مجھے اپنی محفلوں میں مہمان خصوصی کے طور مدعو کریں جہاں میں لوگوں کو یہ درس دیتا ہوں کہ تم کو اس ملک نے کیا دیا جبکہ میں نے تو اپنا حق اس ملک اور معاشرے سے بزور طاقت چھینا ہے۔ ہے ناں عجیب سی بات!

میں خود کو بہت باعلم اور لوگوں کو مجسم جہل سمجھتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب میں کسی تقریب میں جاؤں تو سب لوگ میرے احترام میں کھڑے ہو جائیں اور اگر کوئی میرے پاس اپنا دکھ بیان کرنے آئے تو میں مصروفیت کو خود پر اوڑھ کر اسے چلتا کر دوں۔ معصوم و مظلوم انسانوں کے چہروں پر اداسی ناچ رہی ہو، بھوک نے انہیں بنجر بنا دیا ہو، وہ در بدر خاک بسر ہوں مگر میں اپنی دانش وری کا کمال دکھا رہا ہوں اور پھر بھی انسانیت کے دکھوں کا پرچارک بنا ہوا ہوں۔ وہ رت جگے کر رہے ہوں اور میں چین سے سوتا رہوں۔ وہ اپنے جائز کاموں کیلئے خوار ہو رہے ہوں اور میرے ایک فون پر سارے کام ہو جائیں۔ وہ دھوپ میں لائن لگا کر کھڑے ہوں اور میں اندر جا کر افسر سے چائے پی کر اپنا کام کروالوں۔ عجیب سی بات ہے ناں!

میں سیمینار پر سیمینار سجائے چلا جا رہا ہوں۔ منرل واٹر پیتا ہوں۔ یخ بستہ پنج و ہفت ستارہ ہوٹلوں میں بعام و قیام کرتا ہوں۔ لگژری گاڑی میں سفر کرتا ہوں اور رونا روتا ہوں مفلوک الحالوں کا۔ میں نے آج تک فاقہ نہیں کیا اور فاقہ زدوں کا دکھ لکھتا ہوں۔ میں خود تو ہر ناجائز کے سہارے امیر بن گیا لیکن اب غریبوں کا ہمدرد بنا پھرتا ہوں۔ جمہوریت کے نام پر پریس کی آزادی کا خوب فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے بخئے ادھیڑ کر اس معصوم عوام کے دلوں میں ہمدردی کی جوت جگاتا ہوں لیکن در پردہ اپنی جبینِ نیاز انہی کے حضور جھکا کر اپنے سارے کام کرواتا ہوں۔ حکومت وقت کے خلاف میرے الفاظ نرے لفظ ہیں، بے روح لفظ، میں لایعنی تحقیق میں لگا رہتا ہوں۔ میں زندہ مسائل کو نظر انداز کر کے اپنے قاری کو فضول مباحث میں الجھائے رکھتا ہوں۔ اس لئے کہ کہیں اصل مسائل کی طرف اس کی توجہ نہ چلی جائے اور وہ اس انسان کش نظام کے خلاف اٹھ کھڑا نہ ہو۔ عجیب ہوں ناں میں!

میں خود دوغلا ہوں اور، اوروں کو منافق کہتا ہوں۔ میں نے اپنے ضمیر کا سودا کر لیا ہے، میرے اندر سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے ہیں اور میں اوپر سے خوشبو لگائے پھرتا ہوں۔ میں اپنے اندر کے انسان کو سولی دے چکا ہوں۔ میں خوبصورت لباس میں درندہ ہوں۔ میں صرف خود جینا چاہتا ہوں۔ مجھے لوگوں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ مجھے اپنا پیٹ بھرنا ہے، مجھے بھوکوں، ننگوں، ناداروں، مفلسوں سے کیا لینا دینا۔ میں تو اپنی سگی اولاد کو پہچاننے سے انکار کر دیتا ہوں میں زرداروں کے آگے بچھا جاتا ہوں اور کوئی نادار سلام کرے تو مجھے ناگوار گزرتا ہے۔ میں سماجی بہبود کے کام اس لئے نہیں کرتا کہ مجھے یہی کرنا چاہئے بلکہ اس لئے کرتا ہوں کہ میری واہ واہ ہو۔ میں اپنی تعریف سن کر نہال ہوتا رہتا ہوں۔ میں نے بھی سوچ لیا ہے کہ جس ملک نے مجھے یہ ساری راحتیں اور نعمتیں عطا کی ہیں، اب ایک قدم اور آگے بڑھ کر میں بھی ان انقلابیوں کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑا ہو کر رونمائی کا شرف حاصل کروں۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنی زبان و قلم کے توسط سے ان کے گلے کا ہار بنوں جو اس عوام کو آزادی کے نام پر انقلاب کی نوید سنا رہے ہیں۔

لیکن میں یہ بھول گیا ہوں کہ اصل کو بقا ہے۔ جعل سازی کبھی پنپ نہیں سکتی۔ بار آور نہیں ہو سکتی۔ کوئی انقلاب نہیں لا سکتی لیکن میں ان کا خوشامدی ہوں جنہوں نے سفر کیلئے جیٹ طیارہ، سینکڑوں کنال کا گھر، لاکھوں روپے کے یومیہ اخراجات، گھر کے دالان میں کروڑوں روپے کی گاڑیوں کا ایک

اسکواڈ ہر وقت تیار، درجنوں اسلحہ بردار محافظوں کی قطار رکھی ہوئی ہے، ان حالات میں گلے سڑے نظام کی پیوند کاری کب تک کی جاسکتی ہے؟ مجھے آخری تنبیہ مل چکی ہے کہ آخر اس انسان کش نظام کو فنا ہو جانا ہے، مجھے بھی اور ان انقلاب کے داعیوں نے بھی۔ سب اپنی اپنی قبر کا پیٹ بھریں گے۔ موت ہمارے تعاقب میں ہے اور ہم جینے کیلئے منصوبے بنا رہے ہیں۔ میں بندۂ رب نہیں بندۂ نفس ہوں۔

عجیب ہیں ناں ہم سب!

کچھ بھی تو نہیں رہے گا یارو۔ بس نام رہے گا اللہ کا۔

اجل سے خوفزدہ، زیست سے ڈرے ہوئے لوگ
کہ جی رہے ہیں میرے شہر میں مرے ہوئے لوگ
یہ عجزِ خلق ہے یا قاتلوں کی دہشت ہے
رواں دواں ہیں ہتھیلی پہ سر دھرے ہوئے لوگ

بروز سوموار 16 جمادی الاوّل 1443ھ 20 دسمبر 2021ء

موت سے بھاری قیامت

13 جون 2002ء کو ربِّ کائنات کی وسعتوں سے بھرے خلاء سے ایک سیارہ لہراتا ہوا نکلا اور سیدھا زمین کی طرف دوڑ پڑا۔ زمین کے قریب پہنچ کر ٹھٹکا ،رکا، سیکنڈ کے ہزارویں میں کچھ سوچا، اپنے زاویئے میں ''پوائنٹ '' کا لاکھواں حصہ تبدیلی کی، شاں شاں کرتا ہوا زمین کے قریب سے گزر کر کائنات کے کسی اندھے غار میں گم ہو گیا۔ مگر امریکا جو خود کو ناسا کے بل بوتے پر عقل کل سمجھتا ہے، کو بھی خبر 16 جون 2002ء کو ہوئی جب سیارہ کو گزرے ہوئے تین دن گزر چکے تھے۔ ناسا کے حساس آلات نے پہلی بار اس قیامت کی نشاندہی کی، خلائی تحقیق کے ماہرین کی ٹانگیں برف ہو گئیں، کچھ دیر کیلئے ناسا کا سربراہ آنکھیں جھپکنا بھول گیا، دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام کر اس رپورٹ کو پڑھ رہا تھا تو اس کی پسینے سے شرابور ناک کے اوپر رکھی عینک اس کی گود میں آن گری۔ ایسا ہونا بھی چاہئے تھا کیونکہ دنیا کی تاریخ میں زمین سے انتہائی قریب سے گزرنے والا یہ پہلا سیارہ تھا۔ یہ زمین سے ایک لاکھ تیس ہزار کلو میٹر کے فاصلے سے گزرا تھا۔ خلاء میں اس فاصلے کو بال برابر دوری سمجھا جاتا ہے۔

سیارہ کی لمبائی 130 کلو میٹر تھی جبکہ اس کی رفتار 23 ہزار کلو میٹر فی گھنٹہ تھی، اگر یہ سیارہ اپنے روٹ سے سنٹی میٹر کا لاکھواں حصہ دائیں بائیں ہو جاتا تو سیدھا زمین سے آ ٹکراتا جس سے ہیروشیما کے ایٹم بم سے ہزار گنا بڑا دھماکہ ہوتا، مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک آگ لگ جاتی، گھاس کی جڑوں سے چیڑ کی بلند ٹہنیوں تک ہر چیز خاکستر ہو جاتی، سارے سمندروں کا پانی بھاپ بن جاتا، زمین کا درجہ حرارت وہاں پہنچ جاتا جہاں پتھر موم ہو جاتے ہیں۔ زمین کے اندر چھپے لاوے باہر نکلتے اور نیویارک کا آزادی کا مجسمہ بھی منہ کے بل اس زور سے گرتا کہ اس کی تمکنت اور تکبر کا نام و نشان باقی نہ رہتا۔ ہمالیہ کی آخری چوٹی تک ہر چیز، ہر زندہ، نیم زندہ اور مردہ شئے پگھل کر سیال مادہ بن جاتی۔ یہ سیال مادہ آگے بڑھتا تو روس کے 10240، امریکا کے 8420، فرانس کے 450، چین کے 400، برطانیہ کے 260، اسرائیل کے ایک 160، بھارت کے 140 اور پاکستان کے 97 ایٹم بم پھٹ جاتے۔

اس ایٹمی تباہی کے فوری بعد زمین کا درجہ حرارت دس ہزار سنٹی گریڈ سے ایک کروڑ چالیس لاکھ سنٹی گریڈ تک پہنچ جاتا، زمین سورج بن جاتی۔ یہ تباہی اور اس کے اثرات چار لاکھ سال تک قائم رہتے۔ ساڑھے چار لاکھ سال کے بعد زمین پر آکسیجن پیدا ہوتی، جلی سڑی بلندیوں کے نشیب میں پانی بلورے لیتا ،زمین کی تہوں سے کوئی ایک بیج باہر نکلتا، بیج سے ایک آدھ کونپل پھوٹتی اور پھر اس کونپل سے زندگی کا ایک نیا سفر شروع ہوتا۔ یہ سفر زمین پر پہلے انسان کی صورت میں پڑاؤ ڈالتا۔ وہ ننگ دھڑنگ انسان زندہ جانوروں کا خون پیتا، کچا گوشت کھاتا، اپنی بقاء کیلئے پہاڑوں، وادیوں، صحراؤں اور غاروں میں بھاگتا پھرتا۔ اسے ٹھوکریں لگتیں، وہ گرتا تو لوہے کے چند راڈ، چند بھدی سی ''پتریاں'' کچھ کیل کچھ قبضے اس کے ہاتھ آ لگتے۔ وہ انہیں اٹھا کر بڑی حیرت سے دیکھتا، گمان کرتا لیکن اس کا گمان تھک کر بے بس ہو جاتا۔

اس چار لاکھ باون ہزار تین سو سال بعد کا انسان سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ یہ چند راڈ جنہیں وہ حیرت سے دیکھ رہا ہے کبھی امریکا کے مجسمہ آزادی کے ہاتھ میں پکڑی مشعل تھی۔ یہ "پتریاں" کیپ کینیورل کے خلائی اسٹیشن پر کھڑی چاند گاڑیاں تھیں جن کی مدد سے انسان خلا کا سفر کرتا تھا۔ یہ کیل قبضے وائٹ ہاؤس، پینٹاگون، 10 ڈاؤننگ سٹریٹ، فرنچ پریذیڈنسی، جرمن چانسلری اور راشٹر پتی بھون کے ہیں۔ وہ حیرت سے زمین پر پڑی ہڈیاں دیکھتا، کھوپڑیاں اٹھا کر سونگھتا اور پریشان ہو کر انہیں پرے ٹھوکر دے مارتا اور بھاگ کھڑا ہوتا کیونکہ وہ قصر سفید کے فراعین ٹرمپ، بش، اوباما، ٹونی بلئیر، کمانڈو جنرل پرویز مشرف، مودی، عمران اور اسامہ بن لادن کی کھوپڑیوں میں کوئی تفریق نہ کر سکتا۔ تفریق تو خیر دور رہی اسے تو یہ تک معلوم نہ ہوتا کہ اسامہ کون تھا

اور یہ خدائی کے دعوے کرنے والے کون تھے اور یہ بن لادن سے کیوں ناراض تھے؟

اسے غار کھودتے ہوئے ایک نوکیلی چیز ملتی، وہ دو تین نسلوں تک اس نوکیلی چیز سے کمر پر خارش کرتا رہتا یا کان صاف کرتا رہتا، اسے معلوم ہی نہ ہوتا کہ یہ تاریخی قلم کہ یہ وہ تاریخی قلم ہے جس سے قصرِ سفید کے فرعون نے ''دہشتگردوں'' کو اس صفحہ ہستی سے مٹانے کا حکم دیا تھا، اسے تین کھوپڑیاں قریب قریب پڑی ملتیں، وہ انہیں دیر تک حیرت سے دیکھتا رہتا اور سوچتا رہتا کہ ''یہ کون تھے؟'' لیکن دنیا میں اسے انسانی شکار کے دلدادہ خونخوار شیرون، مودی اور نیتن یاہو کے بارے میں بتانے والا کوئی نہ ہوتا۔ اسے لوہے کا گھٹنا ملتا، وہ اسے لئے لئے پھرتا لیکن اسے کوئی جو بائیڈن کے بارے میں نہ بتاتا، اسے ایک سیاہ رنگ کی سخت قسم کی ہڈی ملتی لیکن وہ یہ معلوم کرنے سے قاصر رہتا کہ اس زمین پر ایک متکبر، سفاک اور درندہ صفت انسان مودی کی تنی گردن کی ہڈی ہے جس نے کشمیر کو ایک جیل میں تبدیل کر دیا تھا۔

وہ یہ کھوپڑیاں، یہ گھٹنے اور یہ ہڈیاں لیکر گھومتا رہتا، ایک کے بعد دوسری نسل، دوسری کے بعد تیسری اور تیسری کے بعد ہزارویں، دو ہزارویں، تین ہزارویں نسل آتی، انسان غاروں سے میدانوں، میدانوں سے بستیوں میں آتے، بستیاں شہر بنتیں، شہر نیویارک، واشنگٹن، شکاگو، لندن، پیرس، فرینکفرٹ، ٹوکیو، بیجنگ اور ماسکو بنتے، بڑی بڑی لیبارٹریاں، تجربہ گاہیں، لائبریریاں اور تحقیقاتی سنٹر بنتے اور سفید کوٹ پہن کر آئن اسٹائن قسم کے لوگ ان کھوپڑیوں، ان کیل قبضوں، پتریوں راڈوں کا مطالعہ کرتے، زمین پر ملی دھاتوں، انسانی جلد، پگھلے لوہے اور تابکار مادوں کے مغلوبوں کا تجزیہ کرتے تو معلوم ہوتا کہ زمین پر کبھی ایک بش، اوباما، ٹونی بلیئر اور ٹرمپ ہوا کرتے تھے۔ اس ملک کا دفاعی بجٹ 687 بلین ڈالر سے کہیں زیادہ ہوا کرتا تھا، اس نے اور اس کے حواریوں نے مہلک ترین ہتھیاروں کے انبار لگا رکھے تھے۔ یہ لوگ صرف بیس کروڑ لوگوں کو انسان سمجھتے تھے، ان لوگوں کی ساری ترقی، ان لوگوں کی ساری سائنس، ٹیکنالوجی ان بیس کروڑ لوگوں کی بقاء اور باقی پانچ ارب نوے کروڑ شودروں کی فنا کے گرد گھومتی تھی۔ جو بائیڈن، نیتن یاہو اور مودی نے اپنی رہائش گاہوں کے نیچے ایٹمی پناہ گاہیں بھی بنا رکھی تھیں، وہ خطرے کی اطلاع ملتے ہی چوہوں کی طرح ان پناہ گاہوں میں جا چھپتے تھے۔ ان کے پاس انتہائی تیز طیارے، پچاس ہزار کلو میٹر تک مار کرنے والے میزائل اور زمین کے دوسرے کنارے کی اطلاع لانے والے سیارے تھے۔ وہ اور اس کے آلات وزیرستان کے پانچ لاکھ انسانوں میں سے القاعدہ کے 16 دہشتگرد تلاش کر لیتے تھے۔ وہ خون کا ایک قطرہ دیکھ کر بتا دیتے تھے اس شخص کی دسویں نسل کا چوتھا بچہ دہشتگرد ہوگا۔ زمین، سمندر، ہوا، فضا ہر جگہ اس کی حکمرانی تھی۔

4 لاکھ 56 ہزار 4 سو 19 سال بعد کے آئن اسٹائن چند صاف ستھری نفیس کھوپڑیاں میز پر سجا کر ایک دوسرے سے پوچھتے ''پھر یہ لوگ مر کیوں گئے؟ "وہ سوچتے" جب زمین پر موت اتری تو پانچ ارب اسی کروڑ شودروں کے ساتھ وہ بیس کروڑ لوگ بھی کیوں مارے گئے جن کے پاس اپنی بقاء کیلئے سائنسی ہتھیار موجود تھے"۔ ہو سکتا ہے اس وقت کے آئن اسٹائن کی رجمنٹ کا کوئی منہ پھٹ آئن اسٹائن چمکتی آنکھوں کے ساتھ ہاتھ اٹھائے، مسکرائے، سب کو اپنی طرف متوجہ کرے اور کندھے اچکا کر کہے "حاضرین! وہ لوگ دہشتگردوں کا اندازہ تو لگا سکتے تھے لیکن زمین کی طرف بڑھتے سیاروں کا تخمینہ نہیں کر سکتے تھے، وہ فضا کی ٹیکنالوجی کو بقاء کا ہتھیار سمجھتے تھے، وہ خود کو بہت ذہین، بہت شاطر خیال کرتے تھے، ان کا کہنا تھا وہ موت سے بھاگ جائیں گے۔

ہو سکتا ہے وہ بھاگ بھی جاتے لیکن قیامت موت سے کروڑوں گنا بھاری، کروڑوں گنا تیز اور کروڑوں گنا شاطر ہوتی ہے۔ وہ جب آتی ہے تو ناسا کے آلات جواب دے جاتے ہیں، سب فنا ہو جاتے ہیں"۔

ہر چیز جو اس زمین پر ہے، فنا ہو جانے والی ہے اور صرف تیرے رب کی جلیل و کریم ذات ہی باقی رہنے والی ہے۔ تم اپنے رب کے کن کن کمالات کو جھٹلاؤ گے!!!

بروز منگل 17 جمادی الاوّل 1443ھ 21 دسمبر 2021ء

لیزر، بحری اور سائبر جنگ کی تیاری

پاکستان نے جب بھی ایف 16 طیارے خریدنے چاہے تو بھارت نے امریکا سے احتجاج کیا، اِن طیاروں پر بھارت کا احتجاج اس وجہ سے بھی ہے کہ یہ رات میں بھی دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اس کا نشانہ بھی غضب کا ہے اس لئے بھارت کی پاکستان میں لگائی گئی بارودی سرنگ اور انسانی اثاثے اِس طیارے کی زد میں آسکتے ہیں لیکن اب بھارت کو اپنے اثاثہ جات کی حفاظت کیلئے زیادہ اخراجات کرنا ہوں گے اور اُس کی پاکستان کو نقصان پہنچانے کی صلاحیت کو بُری طرح متاثر ہونے کا اندیشہ ہے۔ جہاں تک امریکا کا معاملہ ہے وہ بینون منصوبے کے تحت مشرق وسطیٰ کی سرحدیں تبدیل کرے گا، اس نے اب تک عراق کو عملاً تین حصوں میں بانٹ دیا اور اب شام کو مسلکی بنیاد پر تقسیم کرنے کے درپے ہے۔ اصل منصوبے میں شام کو توڑ کر دو ممالک بنانے ہیں تاکہ اسرائیل کے خلاف کوئی ملک آبادی اور رقبہ کے لحاظ سے بڑا نہ ہو۔

اگر ہم اسلحے کے معاملے پر غور کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ بھارت اسلحے کے انبار لگا رہا ہے۔ اُس کے پاس براہموس کروز میزائل ہے جو روس اور بھارت نے مل کر بنایا ہے اور اس کا نام دریائے برہم پترا اور روسی دریائے ماسکو کے نام سے منسوب ہے۔ اس میزائل کو بھارت ویت نام اور منگولیا کو بھی فروخت کر چکا ہے تاکہ یہ چین کے خلاف استعمال ہو۔ یہ کم فاصلے کا میزائل ہے جو آبدوز، بحری جہاز، لڑاکا طیارہ یا زمین سے مار کر سکتا ہے اور بھارت اور روس مشترکہ طور پر بنا رہے ہیں اور 2006ء سے بھارتی بری، بحری اور فضائی افواج کے پاس ہے، اِس کے علاوہ اُس کے پاس دھانوش میزائل ہے جو زمین سے زمین، بحری جہاز اور ایٹمی اسلحہ بھی لے جا سکتا ہے، یہ بیلسٹک میزائل ہے۔ اس کے علاوہ اُس کے پاس "اگنی پانچ" میزائل 5 ہزار کلو میٹر مار کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، اُس کے پاس 700 کلو میٹر تک ہدف کا نشانہ بنانے والا ساگر نیکا" کے 15 "میزائل ہے اور ایٹمی ہتھیار بھی اس کے ذریعے استعمال ہو سکتے ہیں۔ مزید براں بھارت کے پاس "کے 4" اور "کے 5" جو آبدوزوں کے استعمال میں ہیں۔

پاکستان کے پاس زمین سے زمین پر مار کرنے والے شاہین، غوری، رعد، حتف میزائل ہیں جبکہ رعد میزائل لڑاکا طیارے سے لانچ کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان کے بنائے گئے یہ میزائل ہدف کو سو فیصد درستگی کے ساتھ تباہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، جس کو "پن پوائنٹ" کہتے ہیں۔ پاکستان کے یہ میزائل ایٹمی وار ہیڈ لے جا سکتے ہیں "کروز میزائل "رعد" ریڈار پر نہیں دیکھا جا سکتا اور یہ 2007ء سے فضائیہ اور بری و بحری فوج کے پاس ہے۔ پاکستان کے کروز میزائل بھارت کے ہر حصے کو نشانہ بنا سکتے ہیں، یہاں تک کہ جزائر انڈومان اور نکوبار تک اِس سے محفوظ نہیں ہیں، جب سے شاہین 3 بنا ہے پاکستان نے بھارت کے دوسرے ایٹمی حملے کی صلاحیت کو مکمل طور پر ختم کر دیا ہے۔ تاہم ساری دُنیا نے یہ تسلیم کیا ہے کہ اگرچہ پورے ایشیا میں اسلحہ کی دوڑ ہے مگر اس دوڑ میں انڈیا اور چین سب سے آگے ہیں، وہ اس وقت بحری قوت کے حصول میں زیادہ کوشاں نظر آتے ہیں۔ فریگیٹ بحری پٹرول کشتیاں، بوٹ کرافٹ پلیٹ فارم وغیرہ خرید رہے ہیں، بھارت اور چین کے بعد جنوبی کوریا، فلپائن، آسٹریلیا اور ویت نام بھی اپنی سی کاوشیں کر رہے ہیں۔

آبدوزیں بنانے کا سلسلہ بھی زور و شور کے ساتھ جاری ہے۔ بھارت 12 بلین ڈالرز کی چھ آبدوزیں خرید رہا ہے یا خود بنا رہا ہے اور ایٹمی آبدوزوں میں تبدیل کرنے کا پروگرام بھی بنائے بیٹھا ہے۔ پاکستان بھی چین سے آٹھ ڈیزل سے چلنے والی آبدوزیں خرید رہا ہے، جو چین سے اب تک کا سب سے بڑا اسلحے کی سپلائی کا معاہدہ ہے، اِس صورتحال میں بحری حدود اور سمندری معاملات پر توجہ کی اہمیت میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ کئی اور ایشیائی ممالک سمندری گشت کی کشتیاں خرید رہے ہیں اور ساتھ ساتھ انٹیلی جنس اور دیکھ بھال کے نظام کو خریدنے میں بھی دلچسپی لے رہے ہیں۔ گوادر کی

بندر گاہ اور چین پاکستان اقتصادی راہداری کی اہمیت کی وجہ سے پاکستان کو اس طرف توجہ دینا پڑ رہی ہے، اس وقت گوادر کی حفاظت کی ذمہ داری پاکستانی بحریہ کر رہی ہے، وہ نہ صرف بحری حدود بلکہ خود گوادر میں بھی حفاظتی نظام کا جال بچھانے کیلئے مستعد نظر آتی ہے۔

طیاروں کے حوالے سے دیکھا جائے تو بھارت 36 رافیل طیارے فرانس سے حاصل کر چکا ہے۔ اس کے علاوہ پرانے طیاروں کو ضرورت کے مطابق ڈھالنے کے پروگرام پر عملدرآمد کیا جارہا ہے جبکہ اُس کو 126 طیاروں کی ضرورت ہے۔ میرے خیال میں وہ کچھ طیارے روس اور کچھ امریکا سے خریدے گا۔ دونوں "ایف 35" یا "ایس یو 35" نسل کے ہو سکتے ہیں، جو بہت جدید طیارے ہیں۔

پاکستانی فضائیہ "ایف 16" اور "جے ایف 17" تھنڈر طیاروں سے لیس ہے۔ یہ طیارے اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک ہیں، پاکستان نے اپنے پرانے طیاروں کو 2015 میں "جے ایف 17" تھنڈر طیاروں سے تبدیل کر کے بھارت پر مقامی برتری حاصل کر لی تھی، دوسری طرف بھارت نے 2015ء میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ گیاری سیکٹر میں لیزر سے گلیشئر کاٹ کر پاکستان کے فوجیوں پر گرا کر ثابت کیا ہے کہ بھارت لیزر ٹیکنالوجی میں کافی آگے بڑھ چکا ہے لیکن اس بات میں کوئی سچائی نہیں لیکن پھر بھی اِس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ پاکستان لیزر ٹیکنالوجی میں مہارت حاصل کرے۔ نہ صرف یہ بلکہ بھارت سائبر کے معاملات پر بہت اخراجات کر رہا ہے، وہ ایسے نظام پر کام کر رہا ہے جو ہمارے ہیکل اساسی کے نظام میں مداخلت کر سکے۔ اس نے 2005ء میں آرمی سائبر سیکورٹی اسٹیبلشمنٹ کے ادارے کو منظم کیا تھا اور اب اُس کو ایک کمانڈ سسٹم میں تبدیل کر چکا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ پاکستان کو سائبر جنگ کیلئے اپنے آپ کو تیار کرنا چاہئے جو جارحیت کا ایک اور انداز ہے۔

پاکستان نے اپنے آپ کو اس طرح منظم کیا ہے کہ وہ ہر جارحیت کا دفاع کر سکے۔ وہ بھارت کی ایٹمی جنگ کے خطرے سے اپنے آپ کو تیار کر چکا ہے۔ پاکستان نے انسداد دہشتگردی پر بہت کام کیا ہے اور اس میدان میں اپنا لوہا منوایا ہے۔ ہماری بحریہ اگرچہ ایک چھوٹی بحریہ ہے مگر اپنے دفاع کی صلاحیت سے آراستہ ہے تاہم بھارت کی بڑھتی ہوئی بحری صلاحیت کے پیش نظر پاکستان نے بحریہ کو مزید توجہ دینا شروع کر دی ہے۔

لندن کی انٹرنیشنل انسٹیٹیوٹ برائے اسٹراٹیجک سیکورٹی کے مطابق "پاکستان کا اسٹرٹیجک پلانز ڈویژن ایس پی ڈی جو پاکستان کے نیشنل کمانڈ اتھارٹی کو جنم دیتا ہے اور پاکستان کی تمام دفاعی ضروریات کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، اور اپنے اثاثہ جات کی حفاظت کیلئے 25 ہزار مضبوط فورس رکھتا ہے، اور اسٹرٹیجک پلانز ڈویژن ملک کی دفاعی ضروریات پورا کرنے کیلئے نہ صرف مستعد اور ناقابل شکست ہے بلکہ بھارت کے عزائم کو خاک میں ملانے اور ناقابل تلافی نقصان پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہے"۔

بروز بدھ 18 جمادی الاوّل 1443ھ 22 دسمبر 2021ء

آخر کب تک؟

انسانی نفسیات اور مزاج کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ وہ اکثر دورانِ گفتگو یا جوشِ خطابت میں جھوٹ بول جاتا ہے۔ کبھی اس عمل کے پسِ پشت محض زبان کا چٹخارہ ہوتا ہے کبھی جھوٹی معلومات کے بل بوتے پر اپنا قد بڑھایا جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ اپنے مذموم ارادوں کی تکمیل میں اپنے مخالفین کے بارے میں ڈس انفارمیشن کو اسٹریٹجک طریقۂ کار سمجھ لیا جاتا ہے۔ ایسے روّیے شکست خوردگی کے احساس کی غمازی کرتے ہیں۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ جھوٹ، خود بولنے والے کے زاویہ نظر سے راست نسبت رکھتا ہے۔ اس ذہنی کج روی کی گواہی قرآن ان الفاظ میں دیتا ہے کہ "ص، وَالْقُرْآنِ ذِي الذِّكْرِ ۔بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي عِزَّةٍ وَشِقَاقٍ" ص قسم ہے نصیحت بھرے قرآن کی، بلکہ یہی لوگ ہیں جنہوں نے ماننے سے انکار کیا ہے، سخت تکبّر اور ضد میں مبتلا ہیں۔ (سورۃ ص 1۔2)

ایسے لوگ جو کچھ دیکھتے اور جو سنتے ہیں، اس کی تشریح اپنے نقطۂ نگاہ کے مطابق کرتے رہتے ہیں۔ دل کی تنگی اور فہم و فراست کی پستی اس سطح پر آجاتی ہے کہ عقل و فہم کے حوالے سے وہ خود کو اس بلندی کا اہل ماننے لگتے ہیں کہ سمجھ کے پیمانے کو کل کی انتہاء ثابت کرنے پر بضد رہیں اور اس انتہاء تک جا پہنچتے ہیں کہ ہدائتِ ربانی میں بھی کھوٹ نکالنا سوجھ بوجھ کی علامت گردانتے ہیں۔ اس بزعمِ خود غلط سوچ کے حامل انسانوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔

اپنی فطرت کے مطابق انسان نیک ہے۔ اپنے منفی نفسِ ذات کے تحت کوئی فرد نیکی کرنے سے گریز کرتا ہو، تب بھی اس کی طبیعت نیکی سے نفرت پر مائل نہیں ہوتی، نتیجے میں نیکی کے بجائے نیکی کرنے والے کے خلاف اس کے دل میں منفی جذبات پیدا ہو جائیں۔ اس کی یہ دلی خواہش ہو جائے کہ نیکی کرنے والا بھی اس کے چلن پر چل نکلے۔ قرآنِ اس نفسیاتی کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ "وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا" اگرچہ حق (عقلی طور پر قابلِ قبول طریقۂ زندگی (ان پر ظاہر ہو چکا ہے مگر اپنے نفس کے حسد کی بناء پر) یعنی منفی نفسِ ذات کے دباؤ میں (تمہارے لئے ان کی یہ خواہش ہے) کہ تم بھی ایمان کی روش کو کفر سے بدل لو (سورۃ البقرہ: 109) اس کے جواب میں نیک خو کو لازم ہے کہ اپنے خلاف حسد کے اظہار میں وہ اپنی متعین کردہ حدود سے تجاوز نہ کرے۔ بحث میں الجھنے اور خود اپنے دل میں منفی خیالات کو جگہ دینے کی بجائے اس حکمت کو اختیار کرے جس کی قرآنِ نے اس بیان میں نشاندہی کی ہے۔ "فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ" تم عفو و درگزر سے کام لو، یہاں تک کہ اللہ خود ہی اپنا فیصلہ نافذ کر دے۔ مطمئن رہو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ (سورۃ البقرہ۔109)

وہ لوگ جو اپنی برتری یا جوشِ خطابت میں جھوٹ پر اڑے رہتے ہیں، اس پہلو پر توجہ نہیں دیتے کہ کہی گئی بات عقل کے کسی پیمانے پر درست نہیں بیٹھتی ہے۔ تھک ہار کر الٹا وہ مخالف پر الزامات لگانے سے بھی نہیں چوکتے۔ سچائی سے چشم پوشی کے اس جرم پر قرآنِ کا بیان ہے "إِذْ تَلَقَّوْنَهُ بِأَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُولُونَ بِأَفْوَاهِكُم مَّا لَيْسَ لَكُم بِهِ عِلْمٌ وَتَحْسَبُونَهُ هَيِّنًا وَهُوَ عِندَ اللَّهِ عَظِيمٌ (غور کرو کہ تمہارا یہ روّیہ کتنی بڑی غلطی کے مترادف ہے کہ تم اکیلے ہی اپنے کہے کے دعوے دار ہو، تمہاری ایک زبان سے دوسری زبان (بلا تحقیق بات کو آگے بڑھانے والے) اس جھوٹ کو لیتی جا رہی تھی اور تم اپنے منہ سے وہ کچھ کہے جا رہے تھے، جس کے متعلق تمہیں کوئی علم نہیں تھا، تم اسے ایک معمولی بات سمجھتے رہے، حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑی بات تھی۔" (سورۃ النور: 15)

اخلاقی تقاضوں کا ایک رخ تو یہ ہے کہ غلط بات کہی نہ جائے اور اگر بے خیالی اور لاپرواہی میں کہی جا چکی ہے تو خود اس کی تردید کرنی چاہئے۔ دل میں بسی منافقت پر پردہ ڈالنے اور اپنے غلط کو درست ثابت کرنے کی کوشش میں الزامات لگانے کی رِوش کوئی نئی نہیں ہے۔

مملکتِ مدینہ کے قیام کے ساتھ ہی مختلف واقعات کے تناظر میں خطے کی سیاست میں انقلابی تبدیلی کی علامات ظاہر ہونے لگیں۔ اپنی انتہا پر "صلح حدیبیہ" متعارف ہوئی، جس کو اللہ نے "کھلی فتح" کا نام دیا۔ اس واقعے کے تسلسل میں یہ واضح ہو گیا کہ اب جزیرہ نما عرب کی بیش تر بستیاں مملکتِ مدینہ کی پاسبانی کے بغیر اپنا وجود کھو بیٹھیں گی۔ اللہ کے وعدے کے مطابق پاسبانی کی خواہاں ان بستیوں کو فتح کرنا اب آسان تھا۔ اس مرحلے پر ایسے لوگ جو گزشتہ مراحل پر جنگ میں شرکت سے جی چراتے تھے، اب مالِ غنیمت کی لالچ میں اور خطرات نہ ہونے کے سبب اپنی نام نہاد سرفروشی کے اظہار میں پیش پیش ہو گئے۔ سابقہ عدمِ شرکت پر انہوں نے یہ جھوٹا جواز گھڑ لیا تھا کہ ان کی کلیدی پوزیشن سے حسد کے سبب ان کو شرکت کی دعوت ہی نہیں دی جاتی تھی۔ ان کے رویوں کو قرآنِ نے ان الفاظ میں رد کیا ہے "فَسَيَقُولُونَ بَلْ تَحْسُدُونَنَا بَلْ كَانُوا لَا يَفْقَهُونَ إِلَّا قَلِيلًا نہیں، بلکہ تم لوگ ہم سے حسد کر رہے ہو (حالانکہ بات حسد کی نہیں تھی) بلکہ یہ لوگ صحیح بات کو کم ہی سمجھتے ہیں" (سورۃ الفتح۔15)

انسانیت کی فلاح و بہبود کیلئے ہدایاتِ ربّانی پر عمل کرنے کے برعکس ہر دور میں مادیت پرستوں نے مالی، معاشرتی اور سیاسی میدان میں حصولِ مفاد کیلئے دروغ گوئی کو سائنسٹفک ذریعہ سمجھا ہے۔ ایک ایسی سیڑھی، جس کے استعمال پر ان کو کبھی شرمندگی نہیں ہوتی۔ سچائی یہی ہے کہ جھوٹ کے پسِ پشت ، جوشِ خطابت ہو، محض زبان کا چٹخارہ ہو، جھوٹی معلومات کے بل پر اپنا قد بڑھانا ہو یا مخالفین کی ڈس انفارمیشن ہو، نفسیاتی پیمانے پر ایسے تمام رویّے شکست خوردگی کے احساس کی غمازی کرتے ہیں۔ ایسی زندگی انسان کو کامیابی سے دور کر دے گی۔ وہ جاہ و حشم جو کسی دروغ گو کو ملا نظر آتا ہے، ایک دھوکا اور سراب ہے۔ اس کی اصل وہی ہے جو قرآنِ میں اس انداز میں بیان ہوئی ہے "رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ" ان میں سے کوئی تو ایسا ہے، جو کہتا ہے کہ اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں سب کچھ دیدے (دیکھو اس کے مانگنے پر اس کو دے تو دیا جاتا ہے لیکن) ایسے شخص کیلئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں (سورۃ البقرہ۔200)

عقل و خرد کا تقاضہ ہے کہ وقتی تسکین اور خواہشات کی بجائے ہمیشگی پر نظر رہے، صداقت اور راست گوئی کو اپنا لازمی شعار بنا لیا جائے، یہی نجات اور فلاح کی راہ ہے۔ ارشادِ نبوی کے بہ موجب "سچائی انسان کو نجات دلاتی ہے اور جھوٹ اسے ہلاک کر دیتا ہے"۔

آخر کب تک آپ اس قوم سے جھوٹ بولتے رہیں گے۔ اب بھی موقع ہے کہ اقتدار کیلئے ایک دوسرے پر الزامات لگانے کی لعنت سے گریز کریں اور غیروں کی غلامی کے طوق سے بہتر ہے کہ ایک اللہ کی غلامی میں آجائیں۔ ہر آنے والا دن پریشانیوں کو بوجھ بڑھاتا جا رہا ہے اور وطن عزیز قرضوں کی لعنت میں دھنس چکا ہے۔ آپ کے پڑوس میں افغان جو اس وقت دنیا کے بدترین معاشی استحصال کا شکار ہیں اور جن کی نصف سے زیادہ آبادی خوراک کی کمی کی

بناء پر فاقوں میں مبتلا ہو گئی ہے، بچوں کی کثیر تعداد مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو چکی ہے، ایسے ماحول میں چین نے مدد کرنے کیلئے خاص رقم مختص کی لیکن اس مدد کے ساتھ "سروسز" کے نام پر شرائط عائد کر دیں جو کہ سود کے زمرے میں آتی تھیں۔ طالبان حکومت نے اسے قبول کرنے کی بجائے بھوکا مرنے کو ترجیح دی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرا رب انہیں اس آزمائش میں بھی کامیاب فرمائے گا لیکن ہم نے تو اس معجزاتی ریاست کیلئے اپنے رب سے "اوفو بالعہد" کیا تھا کہ ہم اس خداداد ریاست میں مکمل قرآن کو نافذ کریں گے لیکن مدینہ ریاست بنانے کیلئے ہم نے مدینہ ریاست کے سربراہ سے تین ارب ڈالر کا قرضہ چار فیصد سود سالانہ پر حاصل کر کے سودی نظام میں خود کو جکڑ لیا ہے تو پھر خود ہی سوچیں کہ آخر کب تک آپ اس ذلت کے عذاب سے بچ سکیں گے۔

بروز جمعرات 19 جمادی الاوّل 1443ھ 23 دسمبر 2021ء

قائد کی بالغ نظری اور ہم!

قوم ہر سال یومِ پاکستان بڑے جوش و جذبے اور عقیدت و احترام سے مناتی ہے۔ میڈیا میں اس دن کے حوالے سے بہت سیر حاصل معلومات پڑھنے اور سننے کو ملتی ہیں اور اسی حوالے سے اسلامیانِ برصغیر کے متفقہ، جرأت مند اور بے داغ کردار کے مالک قائدِ اعظم نے قیامِ پاکستان کی صورت میں جو عظیم اور تاریخی کارنامہ انجام دیا اس پر خراجِ تحسین پیش کرنے کیلئے تقریبات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ بی بی سی کے زیرِ اہتمام ایک عالمی سروے میں قائدِ اعظم کو جنوبی ایشیا کا عظیم ترین رہنما تسلیم کیا گیا ہے۔ ان کی عظمت کے کئی پہلو ہیں جن کا اعتراف دنیا کے تمام انصاف پسند حلقوں نے کیا ہے حتیٰ کہ منصف مزاج ہندو مصنفین اور دانشوروں نے بھی ان کی جرأت و استقامت، بالغ نظری، دور اندیشی، جمہوریت و قانون پسندی اور دیانت و امانت کو خراجِ تحسین پیش کیا اور بعض ہندو رہنماؤں نے یہ تک کہا کہ کانگرس میں ایک جناح ہوتا تو برصغیر کی تقسیم نہ ہوتی۔

قائدِ اعظم نے علیحدہ وطن کا مطالبہ اس وقت کیا جب سفیرِ اتحاد کی حیثیت سے برصغیر کی دونوں قوموں کو اکٹھا رکھنے اور ہندو اکثریت کو مسلم اقلیت کے سیاسی و اقتصادی حقوق جمہوری اصولوں کے مطابق تسلیم کرنے کی کوششیں ناکام ہو گئیں اور انتہا پسند، تنگ نظر اور مسلم دشمن کانگریسی قیادت نے ثابت کر دیا کہ وہ متحدہ ہندوستان میں ماضی کی حکمران مسلمان قوم کا وجود برداشت کرنے اور آزادی کے بعد اسے عزت و احترام کے ساتھ اپنے ساتھ رکھنے پر آمادہ نہیں۔ قائدِ اعظم نے ایک گولی چلائے بغیر اپنی پر عزم قیادت اور اسلامیانِ برصغیر کی جمہوری جدوجہد کے ذریعے آزاد خود مختار ریاست حاصل کی جس کے بارے میں وہ بار بار یقین دلا چکے تھے کہ نئی ریاست اسلام کا قلعہ ہو گی اور اس کے سنہری اصولوں کا احیاء کرے گی، جمہوری پارلیمانی نظام کے تحت کام کرے گی اور جدید تقاضوں کے مطابق صحیح معنوں میں اسلامی فلاحی ریاست ہو گی۔

اقبال نے دو قومی نظریہ کے تحت ایک آزاد مسلم ریاست کو جو تصور پیش کیا اور جسے قائدِ اعظم نے حاصل کرنے کیلئے مردانہ وار جدوجہد کی، اس کے بارے میں بانی پاکستان نے بار بار واضح کیا کہ وہ مسلمانوں کے معاش اور روزگار کا مسئلہ حل کرے گی۔ ایک موقع پر انہوں نے کھل کر یہ کہا کہ مجھے ایسے پاکستان میں کوئی دلچسپی نہیں جو جاگیرداروں وڈیروں اور سرمایہ داروں کے حقوق کا محافظ ہو۔ قائدِ اعظم نے اپنی زندگی میں پاکستان کیلئے اسلامی جمہوری پارلیمانی نظام پسند کیا، آئین کے بارے میں واضح طور پر کہا کہ اسلام کے جمہوری اصولوں کے مطابق مدوّن ہو گا۔ نئی ریاست میں اقلیتوں کو مکمل حقوق حاصل ہوں گے جو اسلام نے انہیں عطا کئے ہیں اور فوج کا کردار منتخب جمہوری حکومت کے ایک ماتحت ادارے کا ہو گا۔

یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ قائدِ اعظم کی زندگی ہی میں فوج کے انگریز کمانڈر انچیف نے حکم عدولی کی اور قائدِ اعظم کے احکامات کے تحت پاکستان کی شہ رگ کشمیر میں فوجی دستے بھیجنے سے انکار کیا جبکہ بھارت کے فوجی کمانڈر انچیف نے جواہر لال نہرو کے احکام کی مکمل اطاعت کی اور سرینگر ائیر پورٹ پر قبضہ کر کے مجاہدین کے بڑھتے ہوئے قدم روک دیئے۔

قائدِ اعظم کی وفات کے صرف دس سال بعد جنرل ایوب خان نے جمہوری نظام کی بساط لپیٹ کر ملک میں فوج کی حکمرانی کا اصول متعارف کرایا جو بعد ازاں کسی نہ کسی شکل میں مروّج رہا جس کی وجہ سے یہ ملک اقبال اور قائدِ اعظم کی تعلیمات کے مطابق نہ تو جدید جمہوری پارلیمانی ریاست بن سکا اور نہ اسلامی فلاحی معاشرے کی تشکیل ممکن ہو سکی البتہ سیاسی غلط حکمت عملی کے نتیجے میں پاکستان کا اکثریتی حصہ جدا ہو گیا اور باقی ماندہ ملک میں لسانی، نسلی

فرقہ واریت، صوبائی تعصبات اور اس خطے میں شیطانی مثلث نے ملک کو ایسے خطرات سے دوچار کر رکھا ہے کہ ملک کی سلامتی کی ہر وقت فکر رہتی ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ نوجوان نسل کو تاریخ کے حوالے سے بتایا جائے کہ کن مشکل حالات میں پاکستان کو حاصل کیا گیا اس کا اندازہ ہمیں قائد اعظم کے اس خط سے ہوتا ہے جو انہوں نے 25 ستمبر 1944ء کو یعنی ملاقاتوں کے آخری دنوں میں گاندھی جی کو لکھا۔ قائداعظم لکھتے ہیں "آپ پہلے ہی قرارداد لاہور کے بنیادی اصولوں کو مسترد کر چکے ہیں، آپ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ مسلمان ایک قوم ہیں، آپ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ مسلمانوں کو حقِ خود اختیاری ہے اور وہی اسے استعمال کر سکتے ہیں، آپ یہ نہیں مانتے کہ پاکستان دو خطوں اور چھ صوبوں پر مشتمل ہے..... آپ سے خط و کتابت اور بحث کے بعد میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ انڈیا کی پاکستان اور ہندوستان میں تقسیم کی آواز صرف آپ کے لبوں پر ہے، یہ آپ کے دل کی آواز نہیں۔" گاندھی کے اس رویے سے ناکامی اس بات چیت کا مقدر بن گئی۔

29 ستمبر 1944ء کو ویول نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ "مجھے (اس گفت و شنید سے) بہتر نتیجے کی توقع تھی۔ اس سے ایک لیڈر کے طور پر گاندھی کی شہرت کو شدید دھچکا لگا ہے۔ جناح کا کام بہت آسان تھا انہیں گاندھی سے صرف یہ کہتے رہنا تھا کہ تم بکواس کر رہے ہو اور یہ بات ٹھیک بھی تھی لیکن انہوں نے یہ بات گستاخانہ انداز میں کی..... میرے خیال میں اس سے اپنے پیروکاروں میں جناح کی عزت تو شائد بڑھ گئی ہو لیکن معقول آدمیوں کے درمیان ان کی شہرت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔" ویول اور دیگر انگریز حکمرانوں کی نظر میں معقول آدمی وہ ہے جو ان ہی کے دماغ سے سوچے اور اس پر عمل کرے ۔ان کی معقولیت کی ڈکشنری میں آزادانہ فکر و عمل کی کوئی گنجائش نہیں!

مذاکرات کی ناکامی کے بعد قائداعظم نے 4/اکتوبر 1944ء کو ایک پریس کانفرنس میں اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کی۔ ایک اخباری نمائندہ نے ان سے پوچھا کہ کیا مستقبل قریب میں گاندھی جی سے آپ کی ملاقات کا کوئی امکان ہے؟ قائداعظم نے مزاحاً کہا کہ مسٹر گاندھی جی کہتے ہیں کہ اس کا انحصار ان کے دل کی آواز پر ہے چونکہ میری وہاں تک رسائی نہیں، اس لئے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ گاندھی جی کی نیت معاملات کو طے کرنے کی تھی ہی نہیں۔ قائداعظم سے گفت و شنید کے دوران ہی انہوں نے راج گوپال اچاریہ سے کہا تھا کہ اس بات چیت سے میرا اصل مقصد جناح کے منہ سے یہ کہلوانا ہے کہ پاکستان کا تصور ہی غلط اور لغو ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ گاندھی کو قائداعظم کی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ نہیں تھا اس لئے ان کی تمام تدابیر غیر مؤثر رہیں۔

1945ء میں قائداعظم کو نظر آرہا تھا کہ اب برطانوی حکومت کو ہندوستان میں الیکشن کرانے ہی پڑیں گے چنانچہ انہوں نے اپنی مہم کا آغاز کرتے ہوئے

16/اگست 1945ء کو بمبئی سے ایک بیان میں کہا "مسٹر گاندھی جب مناسب سمجھیں وہ کسی کے بھی نمائندے نہیں ہوتے، وہ ذاتی حیثیت میں بات کرتے ہیں، وہ کانگرس کے چار آنے کے بھی رکن نہیں، وہ اپنے آپ کو صفر کر لیتے ہیں اور اپنی اندرونی آواز سے مشورہ کرتے ہیں تاہم جب ضرورت پڑے تو وہ کانگرس کے سپریم آمر بن جاتے ہیں اور اپنے آپ کو سارے ہندوستان کا نمائندہ سمجھتے ہیں۔ مسٹر گاندھی ایک معمہ ہیں.. مسلمانوں اور مسلم لیگ کے خلاف کانگرس میں اتنا زہر اور تلخی ہے

کہ انہیں نیچا دکھانے کیلئے وہ ہر سطح سے نیچے گر سکتی ہے اور تمام اصولوں کو ترک کر سکتی ہے"۔

10/اکتوبر 1945ء کو کوئٹہ مسلم لیگ کے زیرِ اہتمام ایک جلسہ عام میں انہوں نے گاندھی جی کی سیاست کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا "لیڈری حاصل کرنا، پولیس لاٹھی چارج کے موقع پر بکری کی طرح بیٹھ جانا پھر جیل چلے جانا پھر وزن کم ہونے کی شکائت کرنا اور پھر اس طرح رہائی حاصل کر لینا، میں اس قسم کی جدوجہد پر یقین نہیں رکھتا لیکن جب آزمائش کا وقت آئے تو سب سے پہلے میں اپنے سینے پر گولی کھاؤں گا"۔ 21 نومبر 1945ء کو پشاور میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ کانگرس کو پاکستان کا مطالبہ تسلیم کرنا ہو گا یا مسلمانوں کو کچلنا ہو گا لیکن اب کوئی طاقت دس کروڑ مسلمانوں کو کچل نہیں سکتی"۔
24 نومبر کو انہوں نے اسی شہر میں کہا "جب تک میں زندہ ہوں مسلمانوں کے خون کا ایک قطرہ بھی بے فائدہ نہیں بہنے دوں گا، میں مسلمانوں کو کبھی بھی ہندوؤں کا غلام نہیں بننے دوں گا..... انگریز اور ہندو دونوں مسلمانوں کے دوست نہیں ہیں۔ ہمارے ذہنوں میں یہ بالکل واضح ہے کہ ہمیں ان دونوں سے لڑنا ہے..... ہم ان کی متحدہ طاقت سے لڑیں گے اور انشاءاللہ کامیاب ہوں گے"۔

3 دسمبر 1945ء کو گاندھی جی کی بنگال کے گورنر "کیسی" سے ملاقات ہوئی تو گاندھی جی نے ان سے کہا "جناح ایک جاہ پسند آدمی ہیں اور ان کی سوچ یہ ہے کہ وہ ہندوستان، مشرقِ وسطیٰ اور دیگر ممالک کے مسلمانوں کے درمیان رابطہ قائم کریں، میں نہیں سمجھتا کہ جناح اپنے ان خوابوں سے باہر آ سکتے ہیں"۔ دراصل گاندھی جی کو الیکشن کے نتائج اور اس کے متوقع اثرات کا اندازہ ہو رہا تھا اس لئے قیامِ پاکستان سے پہلے ہی انہیں اسلامی یکجہتی کی فکر پریشان کر رہی تھی، واضح رہے کہ یہ وہی گاندھی جی ہیں جو مسلمانوں میں بھی اپنی لیڈر شپ قائم کرنے کیلئے تحریکِ خلافت کی قیادت سنبھالے ہوئے تھے، اب وہ بنگال کے پاکستان مخالف گورنر کے ذہن کو مزید زہر آلود کرنے کیلئے اپنے ترکش کے سارے تیر استعمال کر رہے تھے۔

23 مارچ 1946ء کو کیبنٹ مشن ہندوستان آیا۔ 3/اپریل 1946ء کو گاندھی جی کی مشن سے گفتگو ہوئی، انہوں نے صرف ایک دھوتی باندھی ہوئی تھی اور بہت صحت مند دکھائی دے رہے تھے۔ گاندھی جی نے مشن سے کہا "جناح کو ملک کی پہلی (عبوری) حکومت بنانے دیں، وزراء ملک کے منتخب نمائندوں میں سے ہوں، جناح جس کو چاہیں لیں لیکن وزراء کو اپنی اپنی اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ لینا پڑے گا۔ اگر جناح حکومت بنانے سے انکار کر دیں تو پھر کانگرس کو یہی پیشکش کی جائے"۔ آپ نے گاندھی جی کا انداز دیکھا کہ وزیرِ اعظم جناح صرف ان لوگوں کو چن سکیں گے جن پر ان کی اسمبلیاں اعتماد کا اظہار کریں۔ اپنی آبادی کی وجہ سے مسلم اقلیتی صوبوں کی اسمبلیوں میں ہندوؤں کی بڑی بھاری اکثریت تھی، ادھر عوام میں انتہائی مقبولیت کے باوجود مسلم اکثریتی صوبوں کی اسمبلیوں میں مسلمانوں کو آبادی کے لحاظ سے نشستیں نہ ملنے پر مسلم لیگ کو قطعی اکثریت حاصل نہ تھی اس لئے مجبوراً اسے تقریباً سارے کے سارے کانگریسی ہندو یا غیر لیگی مسلمان وزیر رکھنے پڑتے، ایسی پیشکش کو قائدِ اعظم کیوں قبول کرتے اور اس کے بعد حکومت خود بخود کانگرس کے پاس چلی جاتی۔ یہ تھی گاندھی جی کی پیشکش قائدِ اعظم کیلئے!

بروایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

پیتھک لارنس نے گاندھی جی سے کہا کہ اس طرح تو جناح کے زیادہ تر وزراء غیر لیگی ہی ہوں گے، گاندھی جی نے کہا کہ اس سے تو گریز نہیں، ایسی بات کو کون آگے بڑھاتا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے متحدہ ہندوستان کے آخری وائسرائے کے طور پر 24 مارچ کو حلف اٹھایا اور فوراً سیاسی لیڈروں سے ملاقاتیں

شروع کر دیں۔ گاندھی جی نے 31 مارچ سے 14/اپریل 1947ء تک ہر روز لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کی۔ یکم اپریل کی ملاقات میں گاندھی جی نے تجویز کیا کہ مسٹر جناح کو متحدہ ہندوستان کا وزیر اعظم بنا دیا جائے.....اور جب تک وہ ہندوستانی عوام کے مفاد میں کام کرتے رہیں گے، کانگرس ان کے ساتھ پورے خلوص کے ساتھ تعاون کرے گی.....اس بات کا فیصلہ کہ وہ عوام کے مفاد میں کام کر رہے ہیں یا نہیں، صرف اور صرف لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہی کریں گے، اگر جناح یہ تجویز نہ مانیں تو پھر کانگرس کو یہی پیشکش کی جائے۔ ماؤنٹ بیٹن تسلیم کرتے ہیں کہ میں گاندھی کی یہ تجویز سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ انہوں نے گاندھی جی سے پوچھا کہ اس تجویز کے بارے میں مسٹر جناح کا کیا تاثر ہو گا؟ گاندھی جی نے جواب دیا اگر آپ انہیں یہ کہیں گے کہ یہ تجویز گاندھی کی طرف سے آئی ہے تو جناح کہیں گے "مکار گاندھی"۔ ماؤنٹ بیٹن نے مزے لے لے کر پوچھا "غالباً یہ بات درست ہو گی۔" اس پر گاندھی جی نے بڑے جوش سے کہا "نہیں نہیں میں یہ تجویز پورے خلوص سے پیش کر رہا ہوں۔"

قائدِ اعظم سے بات کرنے سے پہلے ماؤنٹ بیٹن نے اسی دن یہ بات نہرو کو بتائی تو یہ سن کر ان کے مہاتما (گاندھی) ان کی جگہ قائدِ اعظم کو وزیر اعظم بنانے کی پیشکش کر رہے ہیں، نہرو کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ نہرو نے ماؤنٹ بیٹن سے کہا کہ گزشتہ برس گاندھی جی نے کیبنٹ مشن کے سامنے بھی ایسی ہی تجویز پیش کی تھی لیکن یہ مسئلے کا ایک غیر حقیقی حل ہے۔ گاندھی جی کو دہلی میں چند دن اور رہنا چاہئے کیونکہ چار مہینے تک مرکز سے دور رہنے کی وجہ سے وہ تیزی سے معاملات سے بے خبر ہوتے جا رہے ہیں۔ نہرو کی رائے سننے کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے قائدِ اعظم سے بات کرنا مناسب نہ سمجھا اور اگر ماؤنٹ بیٹن قائدِ اعظم سے یہ بات کر بھی لیتے کیا ہوتا؟ وہ اپنی ذات کیلئے قوم کو داؤ پر لگانے والے ہرگز نہیں تھے، اس قسم کی پیشکش کو وہ بغیر کسی تامل کے ٹھکرا دیتے۔

ان چند واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ گاندھی جی کی نیت اور طریقِ کار کو قائدِ اعظم خوب سمجھتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ان کا ہر لحاظ سے مناسب جواب دیا! کاش آج ہمارے حکمران اور سیاستدان قائدِ اعظم کی بالغ نظری سے ہی کچھ سیکھ لیں۔

بروز جمعۃ المبارک 20 جمادی الاوّل 1443ھ 24 دسمبر 2021ء

کانپ اٹھتا ہوں

پامسٹری میں ہاتھ کی لکیروں سے قسمت کے حال بتائے جاتے ہیں لیکن زیادہ تر اس میں انسان کے کردار اس کی خوبیاں، کمزوریاں اور اس کے ذہنی رجحانات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی لئے پامسٹ بھی اکثر تمہید باندھتے ہوئے پہلے کسی شخص کو اس کے مزاج، ضدی پن، کنجوسی، بے احتیاطی، واضح بیماری کے بارے میں بتائے گا کیونکہ ان کی علامت ہاتھ پر ایسے ہی واضح ہوتی ہیں جیسے ماتھا چھونے سے بخار کا پتہ چلتا ہے اور نبض دیکھنے سے دل کی دھڑکن کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ سب بتانے کے بعد وہ اندازے لگانا شروع کرتا ہے لیکن ان پیشین گوئیوں میں بھی اس کی بنیاد اس استعداد یا اس رویے کی بنیاد پر ہوتی ہے جو پامسٹ کسی شخص میں پڑھ لیتا ہے۔ مثلاً ایک انتہائی غیر حساس اور بے صلاحیت لکیروں والے ہاتھ کے بارے میں وہ کبھی یہ نہیں کہے گا کہ یہ مستقبل میں پینٹر، شاعر یا ادیب بن جائے گا۔

اسی طرح وہ حساس لائینوں اور نرم مزاجی کی علامتیں رکھنے والے کو قاتل، ڈکٹیٹر یا ظالم نہیں بتائے گا۔ یہ فن صدیوں سے انسان کی جستجو اور مشاہدے کی پیداوار ہے جیسے ہمارا علم قیافہ یعنی وہ کوئی ایک تبصرہ کسی دوسرے کے بارے میں ضرور کرتا ہے۔ یہ شکل سے شریف آدمی لگتا ہے یا شکل سے غنڈہ ہے۔ پامسٹری بھی ہاتھ دیکھ کر یہ بتاتی ہے کہ یہ ہاتھ سے کیسا لگتا ہے۔ ہاتھ کی ان لکیروں میں ایک علامت ایسی ہے کہ پامسٹ اگر اسے دیکھ لے تو فوراً یہ فیصلہ صادر فرما دیتا ہے کہ تمہیں اکثر محبت میں مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ علامت دل کی لکیر سے ایک شاخ کا دماغ کی لکیر کی طرف مشتری کے ابھار سے نیچے جھکنا ہے۔ ایسا فیصلہ صادر ہونے کے بعد وہ شخص اکثر یہ سوال کرتا ہے کہ مجھے مایوسی کیوں ہوتی ہے تو پامسٹ اکثر یہی کہتا ہے کہ تم میں ایک بہت بری عادت ہے، تم لوگوں سے توقعات بہت زیادہ وابستہ کر لیتے ہو اور جب توقعات پوری نہیں ہوتی تو پھر تمہیں شدید مایوسی ہوتی ہے **اور یہ تمہارے ہاتھ سے ظاہر ہے** اس لئے اوّل تو محبت کرو نہیں اور اگر کرو تو توقعات نہ لگاؤ تاکہ مایوسی نہ ہو۔

یوں لگتا ہے اس مملکت خداداد پاکستان کے 22 کروڑ عوام میں سے اکثریت کے ہاتھوں پر دل کی لکیر سے دماغ کی لکیر تک جھکنے والی ایک شاخ موجود ہے اور اگر اس ساری قوم کو ایک بہت بڑے سٹیڈیم میں کھڑا کر دیا جائے اور ہاتھ بلند کرنے کو کہا جائے تو پامسٹ ان کے ہاتھ دیکھ کر کہیں گے جاؤ اپنے گھروں میں آرام کی نیند سو جاؤ، تمہارے مقدر میں ہمیشہ محبت میں مایوسی لکھی ہوئی ہے۔ مجمع سوال کرے گا کہ ایسا کیوں تو پامسٹ اپنے اندازے سے یہ بتائے گا، تم خوش فہم ہو، خوابوں کی دنیا میں رہتے ہو۔ ہر کسی سے توقعات وابستہ کر لیتے ہو اور پھر جب وہ پوری نہیں ہوتیں تو تمہارا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ تمہارے کئی سال آنسو بہانے اور چھپ چھپ کر رونے میں گزرتے ہیں اور پھر جب تم سنبھلنے لگتے ہو، ذرا اس صدمے سے جاگتے ہو تو تمہارے سامنے ایک اور محبوب کھڑا ہو جاتا ہے۔

ہم اس بدنصیب، خوش فہم اور جذباتی قوم سے تعلق رکھتے ہیں جن کے مقدر میں ازل سے شاید یہ لکھ دیا گیا ہے کہ وہ جس کے گلے میں ہار پہنائے گی، جس کی گاڑیاں چومے گی، جس کے راستے پر اپنا دل اور آنکھیں بچھائے گی جس کی لگن میں پیٹ پر لاٹھیاں کھائے گی، سینے گولیوں سے چھلنی کروائے گی وہی اسے مایوس کرے گا۔ یہ وہی قوم تھی جس نے دس لاکھ لوگوں کا خوف اس سرحد پر نذرانے کے طور پر پیش کیا تھا اور خواب دیکھا تھا ایک ایسے ملک کا جس میں انصاف، امن اور خوشحالی ہو گی۔ یہ خواب پورا تو نہ ہوا لیکن اس ملک کے باسیوں کی آنکھوں میں ابھی تک امید باقی ہے۔

وہ ہر چند سال بعد اپنی آنکھوں میں امید کے دیئے روشن کر لیتے ہیں۔ حیرت ہے ان 74 سالوں میں اس قوم نے محبت کرنے میں کبھی کسی کو مایوس نہیں کیا۔ جوان کو اپنی امیدوں کا مرکز نظر آیا اس کیلئے مجنوں کی طرح کوڑے بھی کھائے، سسی کی طرح دھوپ میں بھی جلے اور منصور کی طرح موت کو بھی گلے لگایا۔ سب نے اس قوم سے وعدے کئے، دعوے کئے اور ان سے محبت کی اس کٹھن راہ میں جانوں کی بھینٹ لی۔ لوگوں نے اپنے جوان بچوں کے لاشے اٹھائے لیکن ہمیشہ آنسوؤں اور امیدوں میں یہی فقرہ بولا: بس اب ہماری قربانی رائیگاں نہیں جائے گی۔ اب حالات بدل جائیں گے اب انصاف ہوگا، امن ہوگا، خوشحالی ہوگی۔ وہ لوگ تو جان دیکر سرخرو ہو گئے لیکن ہمارے ہاں آج پھر ایسی جمہوریت کے شادیانے بجائے جارہے ہیں جہاں ہمارے اربابِ اقتدار نے جمہوریت کے نام پر قوم کو جی بھر کر لوٹا اور اپنے اقتدار کے آخری دن ایسی لوٹ مار میں مصروف رہی گویا کائنات کا یہ آخری دن ہو حتی کہ اپنے مفادات کی تکمیل کیلئے اپنے ہی محکمے کے سیکرٹری کو زدو کوب کر کے ایسی جمہوریت پر مہر ثبت کر دی۔ آج بھی دھڑلے سے وزارت کے عہدے پر فائز اور کبھی ہماری منتخب قومی اسمبلی کی اسپیکر فہمیدہ مرزا نے اراکین اسمبلی پر محض اس لئے انعامات کی بارش کر دی تھی کہ اس کی آڑ میں وہ اپنے لئے تاحیات مراعات حاصل کر سکیں۔ وفاق نے چھٹی کے دن تمام ملکی بینکوں اور دوسرے تمام حکومتی اداروں کو کھلا رکھنے کا حکم دیا گیا اور کھلے عام دن دیہاڑے ملکی افراد کے تبادلے اور دیگر تمام مراعات کی لوٹ سیل لگا دی گئی گویا کوئی پوچھنے والا ہی نہیں خزانے سے اربوں روپے منتقل کرنے کے علاوہ من پسند تھا لیکن نیب سب جانتے ہوئے موت کی نیند سویا ہوا ہے۔

میں کبھی کبھی ایک منظر سوچ کر کانپ اٹھتا ہوں۔ وہ منظر جس میں کسی ظلم، بے انصافی، زیادتی، دھوکے پر ایک ایسی عدالت میں سزا سنائی جائے گی جو سب سے بڑی عدالت ہے۔ اس محشر کے میدان کی تپتی زمین پر اگر ان جان دینے والوں نے میرے رب کے روبرو ان لوگوں کا گریبان تھام لیا جن کے دعوؤں، وعدوں اور نعروں پر اس نے جان دی تھی اور اللہ کے حضور مقدمہ دائر کر دیا کہ میں نے جان دی تھی کہ لوگوں کو روٹی کپڑا مکان ملے گا، کوئی گریبان میں ہاتھ ڈال کر کہے گا میں نے نظام مصطفیٰ ﷺ کیلئے جان دی تھی، میں نے نئے پاکستن کیلئے جان دی تھی، عدل وانصاف کیلئے جان دی اور پھر سوال کرے گا، اے عادل ومنصف رب میں نے جان دی تاکہ یہ شخص سرفراز ہو، اس قابل ہو کر میرے جیسے اور جان دینے والوں کے خواب پورے کر سکے۔ اسے اختیار ملا، طاقت ملی۔ اب فیصلہ تیرے ہاتھ میں ہے۔

اس کائنات کی سب سے بڑی عدالت میں کوئی مصلحت کام نہیں آئے گی۔ وہاں اس اختیار کا سب کو جواب دینا پڑے گا جس کی بنیاد میں بے گناہوں کا لہو ہوتا ہے۔ وہاں کیس تکنیکی وجوہات کی بنا پر خارج نہیں ہوگا اور وہاں پر گریبان پکڑنے والے کی اپیل قابل سماعت ہے اور سزا کیلئے صرف ایک خون ہی کافی ہے۔

بروز اتوار 22 جمادی الاوّل 1443ھ 26 دسمبر 2021ء

تمہارا درد بڑا ہے یا میرا غم، بولو

سب جگ سے پیاری اور من موہنی پیاری ماں جی

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

اللہ سے دعا گو ہوں کہ آپ کو دونوں جہانوں کی تمام نعمتوں سے سرفراز فرمائے ثم آمین

جناب محترم افضل صاحب کے رحمتِ حق سے جا ملنے کے حادثہ کی اطلاع عزیزم سجاد کے وائس میسیج پر جب ملی تو میں بالکل سکتے کی حالت میں چلا گیا جبکہ ایک دن پہلے ان کے فون پر لمبی گفتگو کا ایک ایک لفظ لائن بنا کر میرے سامنے مجھے شرمندہ کرنے کیلئے میرا منہ چڑا رہے تھے۔ خود کو سنبھالا اور فوری طور پر اپنے آپ کو تیار کرنا شروع کر دیا اور ان کے تمام الفاظ پر غور کرنا کرنا شروع کر دیا کہ کس قدر سچی باتیں ان کے منہ سے نکل گئیں جو بعد میں حقیقت کا روپ دھار گئیں۔

آپ کو فون کرنے کی تین مرتبہ کوشش کی لیکن خود ہی اپنے ہاتھوں کال کو منقطع کر دیتا تھا کہ ان قیامت کی گھڑیوں کا کس منہ سے ذکر کروں۔ بالآخر ہمت کر کے سوچا کہ آپ کی دلجوئی و غم گساری کیلئے آپ سے فون پر دوبارہ رابطہ کر کے آپ کے دائمی غم کو ہلکا کرنے کی کوشش کروں۔ اب کئی دنوں سے سوچ رہا ہوں کہ اپنے انتہائی عزیز خاموش طبع۔ سادہ اور منکسر مزاج شخص کیلئے کچھ تحریر کروں لیکن جب بھی لکھنے بیٹھتا تو آپ سب کے اور بالخصوص ان کی اکلوتی بیٹی کے جذبات کے سامنے گنگ ہو جاتا ہوں اور الفاظ میرا ساتھ چھوڑ دیتے۔ پھر یہ خیال میرے رگ وپے میں گونجنے لگتا کہ تم جواب تک 45 کتابوں کے علاوہ سینکڑوں مقالات لکھنے کے باوجود اس معاملے میں خود کو اس قدر بے بس محسوس کر رہے ہو تو پھر ایک ہمدرد و مخلص اہلیہ اور اکلوتی بیٹی کے علاوہ ان کے بیٹوں کے جذبات کو دلاسہ دینے کیلئے سمونے کیلئے الفاظ کہاں سے مستعار لو گے۔ میں اس سے واقف ہوں کیونکہ خود مجھ پر جدائی کا صدمہ کچھ ایسا طاری ہوتا ہے کہ میں پچھلے چار سالوں سے اپنی اہلیہ کیلئے ایک لفظ سپرد قلم نہیں کر سکا حالانکہ لکھنے سے پہلے الفاظ کے کئی بحر قلزم اپنی طوفانی جولانیوں کے سبب سینے میں ٹھاٹھیں مار رہے ہوتے ہیں۔

میں چشم تصور میں آپ کا اور اہل خانہ کا بالخصوص اکلوتی بیٹی کا حزن وملال سے ڈوبا ہوا چہرہ دیکھ رہا ہوں اور یوں محسوس کر رہا ہوں کہ ان سب کے معصومانہ چہرے پر لکھی ہوئی دائمی فراق کی داستان کو چرا کر اپنے سینے میں جذب کر لوں اور اس صدمے کی حالت میں اپنا کندھا اور سینہ پیش کر کے اُس صبر کی تلقین کروں جو بعض اوقات روٹھ کر مجھے بھی از حد بے چین کر دیتا ہے۔ آج بھی اسی محاسبے اور کچوکے لگانے والے لمحات یہ تحریر معرضِ وجود میں آگئی جو ممکن ہے آپ کے صدمہ کو وقتی طور پر ڈھارس کا کام دے سکے اور آپ کو پرسہ دینے میں میرے لئے بھی آخرت کیلئے کوئی زادِ راہ جمع ہونے کی کوئی سبیل نکل آئے۔ آپ کیلئے اپنی عزیز ترین ہستی کا راہِ حق سے ملنے کی اندوہناک اور دلخراش داستان برداشت کرنا کچھ اس قدر آسان بھی نہیں لیکن میری اپنی قلبی کیفیت جو پہلے ہی اہلیہ کی اس دارِ فانی سے رخصت ہونے کی وجہ سے ضعف کی طرف مائل ہے اس کی غیر متوازن دھڑکن کئی مرتبہ اپنے رب کی طرف متوجہ بھی کرتی رہتی ہے لیکن رب کے نیک بندوں کا اس دنیا سے کوچ کر جانے کی خبریں ایک تلاطم پیدا کر دیتیں ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے

يَـٰٓأَيَّتُهَا ٱلنَّفْسُ ٱلْمُطْمَئِنَّةُ ٱرْجِعِىٓ إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَٱدْخُلِى فِى عِبَـٰدِى وَٱدْخُلِى جَنَّتِى---

اے اطمینان والی روح، اپنے راب کی طرف لوٹ چل، تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی، پس میرے بندوں میں شامل ہو اور پس میرے بندوں میں شامل ہو جا۔ الفجر۔ 27۔30

اور شدت سے نبی کریم ﷺ کا فرمان مبارک یاد آتا ہے کہ "دنیا ایک جیل ہے"۔

پہلے میں نے آج صبح سوچا کہ پہلے آپ کو ٹیلیفون پر دوبارہ پرسہ دوں پھر خیال آیا کیوں نہ پہلے تحریری طور پر کچھ باتیں کرلی جائیں جو آپ کے دل کے لئے کسی حد تک باعث سکون بن سکیں بس اسی خیال کی وجہ سے اس جانکاہ حادثہ کی تعزیت کیلئے فوراً یہ تحریر قلم کی نوک پر آگئی ہے کہ شاید اس تحریر سے میرا اور آپ کے غم کا بوجھ کچھ ہلکا ہو سکے۔

پیاری ماں! اس صدمے نے آپ کے قلب و ذہن پر یقیناً ایک بہت گہرا اثر چھوڑا ہے لیکن موت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے ہم سب لاپرواہ ہیں۔ دراصل موت سے زیادہ خوفناک شے موت کا ڈر ہے، جیسے جیسے زندگی کا شعور بڑھتا ہے زندگی کی محبت بڑھتی ہے، پھر موت کا خوف بھی بڑھنے لگتا ہے ۔ جس کو زندگی سے محبت نہ ہو اسے بھلا موت کا کیا خوف! جب انسان کے دل میں موت کا خوف پیدا ہو جائے تو اس کی حالت عجیب ہوتی ہے ایسے جیسے کوئی انسان رات کے اندھیرے سے بھاگ جانا چاہے یا دن کو سورج سے بھاگ جانا لیکن بھاگ نہیں سکتا۔

کہتے ہیں کہ ایک آدمی کو موت کا خطرہ اور خوف لاحق ہو گیا وہ بھاگنے لگا تیز بہت تیز، اسے آواز آئی "پگلے موت تیرے پیچھے نہیں بلکہ تیرے آگے ہے" وہ آدمی فوراً الٹی سمت بھاگنے لگا پھر آواز آئی "نادان موت تیرے پیچھے نہیں بلکہ تیرے آگے ہے" آدمی بولا "عجیب بات ہے پیچھے کو بھاگتا ہوں تو پھر بھی موت آگے ہے، آگے کو دوڑتا ہوں تو پھر بھی موت آگے ہے" آواز آئی "موت تیرے ساتھ ہے، تیرے اندر ہے، ٹھہر جا، تم بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ جو علاقہ زندگی کا ہے وہ سارا علاقہ موت کا ہے" اس آدمی نے کہا "اب کیا کروں؟" جواب ملا "صرف انتظار کرو موت اس وقت خود ہی آجائے گی جب زندگی ختم ہو جائے گی اور زندگی ضرور ختم ہو گی کیونکہ زندگی موت کی امانت ہے اور کسی کی جرأت نہیں کہ اس میں خیانت کر سکے۔ زندگی کا ایک نام موت ہے، زندگی اپنا عمل ترک کر دے تو اسے موت کہتے ہیں یا زندگی کا انجام!" اس آدمی نے پھر سوال کیا "مجھے زندگی کی بہت تمنّا ہے لیکن تو مجھے موت کی شکل دکھادے تاکہ میں اسے پہچان لوں" آواز آئی "آئینہ دیکھو موت کا چہرہ تیرا اپنا چہرہ ہے، اسی نے میّت بننا ہے، اسی نے مردہ کہلانا ہے، موت سے بچنا ممکن نہیں"۔

موت کے خوف کا کیا علاج! لاعلاج کا بھی بھلا کوئی علاج ہے۔ لاعلاج مہلک مرض صرف زندگی کا عارضہ ہے جس کا انجام صرف موت ہے۔ زندگی ایک طویل مرض ہے جس کا خاتمہ موت کہلاتا ہے۔ روزِ اوّل سے زندگی کا یہ سلسلہ چلا آرہا ہے کہ زندگی کا آخری مرحلہ موت ہے اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، یہ تو زندگی کا حصّہ ہے، بس اس کی تیّاری کی فکر ہونا ضروری ہے۔ ہم کشاں کشاں اس کی طرف سفر کرتے ہیں، ہم خود ہی اس کے پاس چل کر آتے ہیں۔ زندگی کے امکانات تلاش کرتے کرتے ہم اس بند گلی تک آجاتے ہیں جہاں سے مڑنا ناممکن ہوتا ہے۔ آگے راستہ بند ہوتا ہے، ہم گھبرا جاتے ہیں اور پھر شور مچاتے ہیں، خوب شور مچاتے مچاتے بالآخر ہمیشہ کیلئے خاموش ہو جاتے ہیں۔

موت نہ ہو تو شاید زندگی ایک المیہ بن جائے، ایک طویل دورانئے کا بے ربط ڈرامہ کہ ٹی وی پر چلتا رہے اور لوگ بور ہو کر سو جانا پسند کریں۔ ایک یونانی کہاوت کے مطابق لافانی دیوی کو ایک خوبرو لیکن فانی انسان سے محبت ہو گئی۔ اس نے غلطی کو محسوس کیا کہ یہ فانی انسان ہے، مر جائے گا۔ وہ دیوتاؤں کی ایک عظیم سردار کے پاس روتی ہوئی گئی کہ اے عظیم دیوتا! میرے محبوب کو لافانی بنادو۔ دیوتا نے بڑی محبت سے سمجھایا کہ یہ ناممکن ہے، انسان کو موت کا حق دار بنایا جا چکا ہے۔ دیوی نے گریہ وزاری کے ساتھ اصرار کیا تو فیصلہ دیوی کی خواہش کے مطابق کر دیا گیا کہ اسے موت نہیں آئے گی۔ دیوی من کی مراد پانے پر خوش ہو گئی۔ وقت گزرتا گیا، بڑھاپا آیا، خوبصورت چہرے پر جھریوں نے ڈیرہ ڈال دیا، توانائی کمزوری میں تبدیل ہو گئی، وقت کے ساتھ بینائی بھی رخصت ہو گئی، یادداشت نے ساتھ چھوڑ دیا۔ "مضمحل ہو گئے قویٰ سارے،" وہ انسان چلایا "اے دیوی خدا کیلئے مجھے نجات دلاؤ میں اس عذاب کو برداشت نہیں کر سکتا۔" دیوی نے اپنی دوسری غلطی کو بھی محسوس کیا، پھر دیوتاؤں کے سردار کے پاس حاضر ہوئی کہ اے دیوتاؤں کے بادشاہ میرے

محبوب کو موت عطا کر، انسان کو انسان کا انجام دے دو۔ بس یہی راز ہے کہ انسان کو انسان کا انجام ہی راس آتا ہے۔ بات سمجھنے کی ہے، گھبرانے کی نہیں، مقام غور کا ہے خوف کا نہیں۔ زندگی صرف عمل ہی نہیں عرصہ بھی ہے۔ اگر صرف عمل ہوتا تو کوئی ہرج نہ تھا، اس عمل کیلئے ایک وقت بھی مقرر ہو چکا ہے۔ اس وقت کے اندر اندر ہی سب کچھ ہونا ہے کیونکہ اس وقت کے بعد کچھ نہیں ہوتا۔ ہمارا ہونا صرف نہ ہونے تک ہے۔ اگر ہم زندگی کو دینے والے کا عمل مان لیں تو اس کے ختم ہونے کا اندیشہ نہ رہے۔ دینے والا ہی زندگی لینے والا ہے۔ ڈر کی کیا بات ہے، دن بنانے والے نے ہی رات بنائی ہے اور رات بنانے والا ہی دن طلوع کرتا ہے۔ پہاڑ بنانے والا دریا و سمندر بناتا ہے، صحرا بنانے والا نخلستان پیدا فرماتا ہے۔ زندگی تخلیق کرنے والا موت کو پیدا فرماتا ہے ، یہ اس کے اپنے اعمال ہیں، ہم صرف اس کے عطا کیے ہوئے حال پر زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ اس نے زندگی اور موت کو اس لیے پیدا کیا کہ دیکھا جائے کہ کون کیا عمل کرتا ہے۔ اس کائنات میں کوئی بھی ایسا نہیں آیا جو گیا نہ ہو۔ کوئی پیدائش موت سے بچ نہیں سکتی، جو کچھ بھی ہے نہ ہو گا۔ ہر شے لاشے ہو جائے گی مگر صرف میرے رب کی ذات ہے جو ہمیشہ ہمیشہ رہے گی۔ باقی سب فنا ہے۔

بے مصرّف زندگی کی سزا موت کا خوف ہی ہے، بامقصد حیات موت سے بے نیاز، موت کے خوف سے آزاد، اپنے مقصد کے حصول میں مصروف رہتی ہے۔ عظیم انسان بھی مرتے ہیں لیکن ان کی موت ان کی عظمت میں اضافہ بھی کرتی ہے اوروں کیلئے باعث صد رشک بھی۔ موت انسان سے اس کی بلند نگاہی، بلند خیالی اور بلند ہمّتی نہیں چھین سکتی۔ وہ لوگ موت کے سائے میں زندگی کے ترانے گاتے ہیں، زندگی کا نغمہ الاپتے ہیں، زندگی کے اس مختصر عرصے میں جو اں ہمّت تو آسمانوں کو چھو آئے۔۔ عالی مرتبت عرش کی بلندیاں سر کر آئے اور کم حوصلہ اپنے اندیشوں کے خول سے باہر نہ نکلے۔ موت فانی زندگی کو دائمی حیات میں بدل دیتی ہے۔ فناء سے بقاء کا سفر گھوڑے کی پشت پر ہوتا ہے۔ موت کیلئے تیار رہو، موت کا خوف نہ کرو، بس یہی موت کا پیام ہے۔

موت کا غم اس لیے ہوتا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے عزیزوں اور پیاروں سے جدا ہو جائیں گے۔ عزیزوں کو تو ہم اپنی زندگی میں ہی جدا کر دیتے ہیں۔ بیٹیوں کی رخصتی کیلئے کتنی دعائیں کرتے ہیں، کس قدر مناجات اور گڑگڑا کر جلد رخصتی کی تمنّا دل میں رکھتے ہیں۔ ہم صاحب تاثیر اسی بزرگ کو کہتے ہیں جو ہماری بیٹیوں کو جلد رخصت کروادے اور آج کچھ صاحب تاثیر ہیں کہ اپنی جدائی کیلئے دعاؤں میں نہ صرف بخل کرتے ہیں بلکہ اس کے تصوّر سے بھی کانپ اٹھتے ہیں۔ جدائی تو ایک دن ہو ہی جانی ہے۔

ایک آدمی کا باپ فوت ہو گیا، وہ بڑا رویا، بڑا پریشان ہوا! موت نے بڑا ظلم کیا، اسے چین نہ آیا۔ آخر کار اس نے ایک بزرگ استاد سے رجوع کیا۔ اس نے جواب دیا "تم اتنے پریشان کیوں ہوتے ہو؟ کچھ دنوں کی ہی تو بات ہے تم بھی اپنے باپ کے پاس پہنچا دیئے جاؤ گے۔" بس یہی ہے موت کا راز یا زندگی کا راز۔ ہم کچھ عرصہ اپنی اولاد کے پاس رہتے ہیں اور پھر اپنے ماں باپ سے جا ملتے ہیں۔ بس یہ الگ بات ہے کہ بعض اچانک اور جلد اس سفر کو طے کر لیتے ہیں بلکہ ایک ہی جست میں ساری مسافت پھلانگ کر منزل پر جا پہنچتے ہیں اور بعض اپنے مولا کے احکام کی بجاآوری میں مصروف رہتے ہیں۔ بس! یہی موت اور زندگی کا فلسفہ ہے بلکہ ہر موت اپنے لواحقین کیلئے یہ پیغام چھوڑ جاتی ہے کہ جلد یا بدیر آپ نے بھی مجھے وہاں آ کر ملنا ہے۔ جہاں ہم سب بے بس اپنے مولا کی مغفرت کے منتظر ہوں گے۔

ذرا اس حقیقت پر بھی غور کریں کہ کتابِ زندگی کے ورق برابر الٹ رہے ہیں ہر آنے والی صبح ایک نیا ورق الٹ دیتی ہے یہ الٹے ہوئے ورق بڑھ رہے ہیں اور باقی ماندہ ورق کم ہو رہے ہیں اور ایک دن وہ ہو گا جب ہم اپنی زندگی کا آخری ورق الٹ رہے ہوں گے، جونہی آنکھیں بند ہوں گی یہ کتاب بھی بند ہو جائے گی اور ہماری یہ تصنیف محفوظ کر دی جائے گی... کبھی غور کیا اس کتاب میں ہم کیا درج کر رہے ہیں، روزانہ کیا کچھ لکھ کر ہم اس کا ورق الٹ

دیتے ہیں ہمیں شعور ہو یا نہ ہو ہماری یہ تصنیف تیار ہو رہی ہے اور ہم اس کی ترتیب و تکمیل میں اپنی ساری قوتوں کے ساتھ لگے ہوئے ہیں اس میں ہم وہ سب کچھ لکھ رہے ہیں جو ہم سوچتے ہیں دیکھتے ہیں سنتے ہیں اور سناتے ہیں اس میں صرف وہی کچھ نوٹ ہو رہا ہے جو ہم نوٹ کر رہے ہیں، اس کتاب کے مصنف ہم خود ہیں۔ ذرا سوچیں... غور کریں کہ ہم اپنی کتابِ زندگی میں کیا درج کر رہے ہیں جبکہ میرے آقا کے ایک فرمان کے مطابق ملک الموت ہر روز ہر ذی نفس کے گھر کر دروازے پر تین مرتبہ یہ منادی کرتا ہے کہ "میں تمہارے گھر میں بار بار آتا رہوں گا، یہاں تک کہ تم میں سے کسی کو بھی باقی نہ چھوڑوں گا۔"

یہ الفاظ اس کے ہیں جو ہر گھر، ہر عالیشان محفل اور ہر اس جگہ آتا ہے جہاں کوئی متنفس رہتا ہے۔ دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں جس کے پاس ملک الموت نے نہیں آنا۔ ہر ایک کے پاس آنا ہے، شاہ و گدا کے پاس بھی، امیر و غریب کے پاس بھی، صحت مند اور بیمار کے پاس بھی، نبی اور ولی کے پاس بھی، کوئی حاجب و دربان، کوئی چوکیدار اور پہرے دار اور کوئی تالہ و دروازہ اسے اندر جانے سے نہیں روک سکتا۔

حافظ ابن ابی الدنیا نے نقل کیا ہے کہ سیدنا حسن بصری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ملک الموت ہر گھر میں تین مرتبہ روزانہ چکر لگا کر دیکھتے ہیں کہ کس کا رزق پورا ہو گیا، کس کی مدت عمر پوری ہو گئی۔ جس کا رزق پورا ہو جاتا ہے۔ اس کی روح قبض کر لیتے ہیں اور جب اس کے گھر والے اس کی موت پر روتے ہیں تو ملک الموت دروازے کی چوکھٹ پر کھڑے ہو کر کہتے ہیں۔ "میرا کوئی گناہ نہیں۔ مجھے تو اسی کا حکم دیا گیا ہے۔ واللہ! میں نے نہ تو اس کا رزق کھایا اور نہ اس کی عمر گھٹائی، نہ اس کی مدت عمر سے کچھ حصّہ کم کیا۔ میں تمہارے گھروں میں بار بار آتا رہوں گا یہاں تک کہ تم میں سے کسی کو بھی باقی نہیں چھوڑوں گا۔" سیدنا حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اگر میت کے گھر والے ملک الموت کا کھڑا ہونا دیکھ لیں اور اس کا کلام سن لیں تو اپنی میت کو بالکل بھول جائیں اور اپنے اوپر رونا شروع کر دیں۔

محترم و مرحوم افضل صاحب اس فانی دنیا سے دار بقاء کی طرف تشریف لے گئے ہیں۔ اس عارضی زندگی کی بہاروں اور گلوں کی خوشبو سے منہ موڑ کر دائمی بہار، سدا خوشبوؤں و مہک کے گلستانوں میں براجمان ہو گئے ہیں۔ اپنے ہر تعلّق رکھنے والوں کو چھوڑ کر اپنے مولا کے ساتھ مضبوط تعلق ورشتہ جوڑ چکے ہیں اور پھر موت تو کوئی نئی چیز نہیں۔ موت ہر ایک کو آنی ہے۔ موت کے قانون سے نہ تو کوئی نبی مستثنیٰ ہے نہ کوئی ولی۔ جو بھی آیا ہے اپنا وقت پورا کر کے اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ موت زندگی کی سب سے بڑی محافظ ہے۔ ہم سب اس کی امانت ہیں، پھر کس کی مجال جو اس میں خیانت کر سکے۔ موت لکھی نہ ہو تو موت زندگی کی خود حفاظت کرتی ہے اور جب مقدر ہو تو زندگی دوڑتی ہوئی موت سے لپٹ جاتی ہے۔ زندگی سے زیادہ کوئی جی نہیں سکتا اور موت سے پہلے کوئی مر نہیں سکتا۔

انتہائی پیاری ماں! میرا کریم رب یقیناً اُن سے بڑا فیاضانہ سلوک فرمائیں گے اور یقیناً مرحوم کا جمعۃ المبارک کے روز اپنے رب سے جا ملنا ایک بہت ہی نیک فال ہے اور وہ اپنے تمام حسنات کے طفیل بہت ہی شاداں اور فرحاں ہوں گے۔ آپ نے زندگی بھر اپنے ربّ کریم سے کئی مناجات کی ہوں گی اور یقیناً میرا کریم رب اپنے نیک بندوں کی دعاؤں کو ضرور قبول کرتا ہے۔ ربّ رحمان سے میری دعا ہے کہ آپ سب کو اس دنیا اور آخرت میں اس صبر کا بہت ہی احسن نعم البدل عطا فرمائے۔ ان کے درجات بلند فرمائے اور روزِ جزا کے دن ہمارے اور آپ سب کے آقا ختم الرسول ﷺ کے دستِ مبارک سے

حوضِ کوثر پر شفاعت کا پروانہ نصیب ہو اور ہم سب کو بھی موت کی تیّاری کی فکر نصیب فرمائے۔ آمین

رب العزت کی بارگاہ میں مرحوم کے درجات کی بلندی اور اس دعا کے ساتھ آپ سے اجازت چاہتا ہوں کہ بارالہ۔۔۔ ہماری جنت کا اپنی جنت میں خوب خیال رکھنا۔ میری طرف سے بالخصوص ان کی اکلوتی بیٹی کو خصوصی پرسہ دینے کی درخواست ہے۔ میرے مرحوم والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ جس طرح باپ اپنی بیٹیوں کو رخصت کرتا ہے، اسی طرح صرف بیٹیاں ہی اپنے والدین کے جنازے کو اپنے غم بھرے آنسوؤں اور دعاؤں سے سجا کر دائمی منزل کی طرف رخصت کرتی ہیں۔ میری آنکھوں میں وہ لمحات ہمیشہ کیلئے محفوظ ہو گئے ہیں جب مسجد میں ان کی آخری زیارت کے وقت ان کے تابوت پر تختہ کھینچ کر ان کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے بظاہر ہماری آنکھوں سے اوجھل کر دیا گیا لیکن وہ لمحات ہمیں ہماری موت کو یاد دلاتے رہا کریں گے۔ اللہ تبارک تعالیٰ آپ سب کو اس صدمہ کو برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اس کا دنیا و آخرت میں بہترین اجر عطا فرمائے، آپ سب کو آئندہ زندگی میں خوش و خرم رکھے اور دونوں جہانوں کی تمام نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔ آمین۔ ربّ العزت ہمیں دنیا کے تمام امتحانات میں سرخرو فرمائے اور روزِ قیامت اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے شرمندہ ہونے سے محفوظ فرمائے۔ ثم آمین

ان چند اشعار کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں:

مری حیات یہ ہے اور یہ تمہاری قضا
زیادہ کس سے کہوں اور کس کو کم، بولو
تم اہل خانہ رہے اور میں یتیم ہوا
تمہارا درد بڑا ہے یا میرا غم بولو
تمہارا دور تھا گھر میں بہار ہنستی تھی
ابھی تو در پہ فقط رنج و غم کی دستک ہے
تمہارے ساتھ کا موسم بڑا حسین رہا
تمہارے بعد کا موسم بڑا بھیانک ہے
ہزاروں قرض تھے مجھ پر تمہاری الفت کے
مجھے وہ قرض چکانے کا موقع تو دیتے
تمہارا خون مرے جسم میں مچلتا رہا
ذرا سے قطرے بہانے کا موقع تو دیتے
بڑے سکون سے تم سو گئے وہاں جا کر
یہ کیسے نیند تمہیں آ گئی نئے گھر میں
ہر ایک شب میں فقط کروٹیں بدلتا ہوں
تمہاری قبر کے کنکر ہوں جیسے بستر میں
میں بوجھ کاندھوں پہ ایسے اٹھا کے چلتا ہوں

تمہارا جیسے جنازہ اٹھا کے چلتا تھا
یہاں پہ میری پریشانی صرف میری ہے
وہاں کوئی نہ کوئی کاندھا تو بدلتا تھا
تمہاری شمع تمنا بس ایک رات بجھی
چراغ میری توقع کے روز بجھتے ہیں
میں سانس لوں بھی تو کیسے کہ میری سانسوں میں
تمہاری ڈوبتی سانسوں کے تیر چبھتے ہیں
میں جب بھی چھوتا ہوں اپنے بدن کی مٹی کو
تو لمس پھر اسی ٹھنڈے بدن کا ہوتا ہے
لباس روز بدلتا ہوں میں بھی سب کی طرح
مگر خیال تمہارے کفن کا ہوتا ہے
بہت طویل کہانی ہے میری ہستی کی
تمہاری موت تو اک مختصر فسانہ ہے
وہ جس گلی سے جنازہ تمہارا نکلا تھا
اسی گلی سے مرا روز آنا جانا ہے
میں کوئی راہ ہوں تم راہ دیکھنے والے
کہ منتظر تو مرا پر نہ انتظار مرا
تمہاری موت مری زندگی سے بہتر ہے
تم ایک بار مرے میں تو بار بار مرا
فی امان اللہ
والسلام، خیر اندیش واحقر
سمیع اللہ ملک

بروز اتوار 22 جمادی الاوّل 1443ھ 26 دسمبر 2021ء

مالک سے تعلق کی نئی راہیں

کچھ لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ تشویش اور فکر بھی دل کو کھائے جا رہی ہے۔ تنہائی ہے، دکھ ہیں، اداسی ہے چار سو پھیلی ہوئی، غم ہیں بادلوں کی طرح چھائے ہوئے، بھیڑ ہے، اژدھام ہے اور پھر بھی ہر کوئی اکیلا ہے۔ آسرا، کوئی چھپر نظر نہیں آتا کہ تھوڑی دیر ستالیں، ہر ایک پسینے میں ڈوبا ہوا، سڑک پر کھڑا بیروزگار نوجوان اور سامنے سے پولیس اسکواڈ کے ساتھ سائرن بجاتی ہوئی پراڈو میں بیٹھا ہوا غریبوں کی قسمت سنوارنے کا دعویدار لیڈر، بیان ہی بیان، تقریریں ہی تقریریں، بینرز ہی بینرز، مباحثہ اور ٹاک شو، دانش وری ہر جگہ دیگوں میں پک رہی ہے جس کی سڑاند سے جیناد و بھر ہو گیا ہے۔ قیمتی لباس میں مسکراتے ہوئے تجزیہ کار، غریبوں کو بیچ کھانے والے دلال، انسانی منڈی جس میں ہر شئے برائے فروخت ہے۔ ضمیر، جسم، قول و فعل، بولو جی تم کیا کیا خریدو گے۔ آوازوں کا جنگل جس میں تنہا کھڑا بے دست و پا بندہ بشر!

حکمرانی کی مئے میں مدہوش زردار، یوں کر لو، نہیں جناب ایسا کرو، نہیں نہیں یہ کرو جو میں کہتا ہوں۔ کہیں میلہ ہے زندگی کا اور کہیں برپا ہے ماتم، ہر جگہ بھوک ناچ رہی ہے جسے خودکشی آسودہ کرتی ہے اور کہیں بتائی جا رہی ہیں ترکیبیں انواع و اقسام کے کھانوں کی، کہیں بچیاں منہ اندھیرے اپنے خواب دفن کر کے کام پر جانے کیلئے اسٹاپ پر کھڑی ہیں جنہیں من چلے اپنی جاگیر سمجھ بیٹھے ہیں اور کہیں ہے کیٹ واک، کہیں بدن چھپانے کیلئے ڈھنگ کے کپڑے نہیں، اور کہیں جسم دکھانے کیلئے فیشن ڈیزائننگ، عجب گھڑی ہے، عجیب تماشہ ہے، میڈیا آزاد ہے اور ہر خبر پر نظر رکھے ہوئے، اور خبر کیا ہے کوئی بتاتا نہیں ہے۔

ہم ایک سجدہ کو گراں سمجھ بیٹھے اور اب ہر جگہ ذلت و رسوائی کے ساتھ سر بسجود ہیں۔ ایک کو چھوڑا تو جہاں کے محتاج ہو گئے، ایک کی نہیں سنی اب ہر ایک کی جلی کٹی بھی سننی پڑ رہی ہیں، ایک کی نہیں مانی اور اب زمانے بھر کی ماننی پڑ رہی ہیں، اسی ایک در سے نہیں مانگا اور اب ڈونر انٹرنیشنل کانفرنسوں میں جھولی پھیلائے کھڑے ہیں۔ اس ایک شعائر کی توہین کی، اب ہر جگہ مردود ہیں۔ یہ سب کچھ کیا دھرا ہمارا اپنا ہے، اب تو یہ فصل کاٹنی ہی پڑے گی، وہ ایک تو ہم پر ہمیشہ مہربان رہا تو قدر نہ کی لیکن ہم نے یاری لگائی عیاروں سے مکاروں سے۔ بہت سنا ہو گا آپ نے، بے قدروں سے یاری لگانا ایک نازک چوڑی کی طرح ہوتا ہے جس کا مقدر بالآخر ان گنت ٹکڑوں کے سوا کچھ نہیں لیکن نہیں مانے ہم۔ اپنی تگڑم لڑائی، جی ہم تو فلاں یونیورسٹی کے فاضل ہیں۔ اب پتہ چلا وہ تو جہالت کا پروانہ تھا جسے ہم ڈگری سمجھ کر نہال ہو گئے تھے۔ بس ایک در ہے، وہی تھا، وہی رہے گا! بندہ کے دینے سے کبھی پیٹ نہیں بھرتا اور پھر اس کے سامنے نگاہیں بھی نیچی رہتی ہیں، لیکن وہ تو بے حساب دیتا ہے اور پھر طعنہ بھی کوئی نہیں لیکن اب کون سمجھائے ان کو! یہ تو پاکستان کے اعلیٰ مناصب پر بیٹھ کر بھی اپنے آقا کو نہیں پہچان سکے اور پھر..... وہی چال بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے۔ دعاؤں کیلئے غربت کی لکیر سے نیچے کی نہ غربت ختم ہو رہی ہے اور نہ ہی غریب، سکون قلب بھی غارت ہو گیا ہے۔ آبادی جو موجود ہے!

سکونِ قلب اور اطمینان کیا ہے؟ یہ کیسے حاصل ہوتا ہے؟ کیا یہ خواہشات کو دل سے نکالنے کا نام ہے یا خواہشات کے سیراب ہو جانے کا نام ہے؟ اس کے حصول کیلئے کیسے اور کس طرح جدوجہد کرنی ہو گی؟ پھر اس جدوجہد کی کامیابی کے امکانات کس حد تک ہیں؟ بھلا یہ اس دنیا میں حاصل ہوتا بھی ہے یا محض سراب ہی ہے؟ یہ اور ایسے ہی ڈھیروں سوالات دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ دماغ جدوجہد کرتا ہے لیکن جواب کے حصول میں کامیاب نہیں ہوتا۔

اگر ہو جاتا ہے تو دل مطمئن نہیں ہوتا اور اگر دل و دماغ دونوں متفق ہو جاتے ہیں تو احساس کی دنیا اس کی سیرابی سے محروم رہتی ہے، کھوج، کرید، تجسس، سوال علم کی بنیاد ہیں۔ سو ہم بھی اس سوال کو لیکر در بدر پھرے، سو جواب ملا: سکون قلب کسی چیز کا نام نہیں، یہ تو اللہ کے فضل کو کہتے ہیں۔ اللہ فضل کرے تو آپ سکونِ قلب حاصل کر سکتے ہیں، محسوس کر سکتے ہیں۔ اللہ کے فضل سے سیرابی اطمینان فراہم کرتی ہے لیکن اللہ کا فضل تو آج کل کسی اور ہی معنوں میں لیا جاتا ہے وہ تو مزید بے سکونی اور بے اطمینانی کا باعث بنتا ہے۔ کیا وہ؟ نہیں وہ نہیں۔ اللہ کے فضل اور اس کی نعمتوں کی گنتی ناممکن ہے لیکن انسان کی کوتاہ نظر جن چیزوں کو اللہ کا فضل سمجھتی ہے، اکٹھا کرتی ہے ان کو ہی لے لیں۔ سکونِ قلب کے حصول کا سادہ سا طریقہ یہ ہے کہ اب انہیں تقسیم کرنا شروع کریں مال کی صورت میں، اشیاء کی صورت میں، وقت کی صورت میں۔ میٹھے بول کی صورت میں، پیار اور محبت کی صورت میں۔ جس کو جس چیز کی ضرورت ہو فراہم کریں ورنہ فراہم کرنے کی کوشش کریں، تعاون کریں، اس کے مشکل وقت کو آسان بنائیں یا بنانے کی کوشش پورے خلوص اور دردمندی کے ساتھ کریں اس کیلئے دعائیں کریں۔

آپ کو سکون مل جائے گا، یہی اللہ کا فضل ہے، اللہ کے فضل کی خواہش دل میں پیدا ہو جائے تو انسان سکون حاصل کر لیتا ہے، یہ وہ خواہش ہوتی ہے جو دل کی باقی تمام خواہشات کو اپنا اسیر کر لیتی ہے، ان پر حاوی ہو جاتی ہے۔ انجام کار یہ ہوتا ہے کہ ساری تمنائیں اور خواہشات اسی ایک خواہش پر نثار ہو جاتی ہیں ۔ یہ عشق کی راہ گزر..... پھر یوں بھی ہوتا ہے کہ: عشق کی ایک ہی جست نے کر دیا قصہ تمام۔ قصہ تمام تو ہونا ہی ہے لیکن عشق کی یہ جست مٹی سے بنے خطا کے پتلے کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ دم توڑتا انسان بھی امید پر زندہ رہتا ہے، چاہے چند لمحات ہی کیوں نہ ہوں۔ امید ایک روشن چراغ ہے، امید نشان راہ ہے، آس ہے، لاکھ بلائیں راہ روکے کھڑی ہوں، امید سہارا بن کر ساتھ کھڑی رہتی ہے۔ آگے بڑھنے پر اکساتی ہے امید، محبت، فاتح عالم ہے، دلوں کو تسخیر کرتی ہے محبت۔ انسان ہار کر بھی خوش رہتا ہے، ایثار سکھاتی ہے محبت۔ قیام کرنا، ڈٹے رہنا سکھاتی ہے محبت۔ جو امید و محبت کا پیکر ہوں، انہیں کون تسخیر کر سکتا ہے! وہ زیر ہو کر بھی سربلند رہتے ہیں، سرخرو ٹھہرتے ہیں، زندگی کا پیغام لاتے ہیں، زندگی پر اکساتے ہیں لیکن کیا وجہ ہے کہ اب امید بھی خشک ریت کی طرح مٹھی سے نکلتی محسوس ہو رہی ہے جہاں اداروں کی بجائے افراد اپنی پسند اور ناپسند پر فیصلے کریں، وہاں پر ہر مسئلہ ایک مذاق یا ایک معمہ بن کر رہ جاتا ہے۔

دنیا ایک نئے روشن اور آزاد مستقبل کی راہیں تلاش کر رہی ہے مگر ہم پر اس قدر مظالم اور تمام تر تذلیل کے باوجود امریکا کے عشق یا مخالفت کا ایسا بھوت سوار ہے کہ طاقت کے بل بوتے پر اپنے نظریات کو پھیلانے کی راہ اختیار کر لی ہے اور بڑی بیدردی سے دن دیہاڑے بے گناہ اور معصوم لوگوں کی جانیں لیکر اپنی فتوحات کا علم بلند کرتے ہوئے فخر محسوس کر رہے ہیں۔ آخر کب تک؟ تاریخ گواہ ہے کہ خون خرابہ، جنگ و جدل سے کبھی کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا بلکہ بالآخر مسائل کا حل ہمیشہ میز پر باہمی گفتگو اور روادی سے حاصل ہوا۔ اب بھی وقت ہے کہ اپنے ربِ کائنات کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کیلئے ایک دوسرے کو ختم کرنے اور گلے کاٹنے کی رسم کو ترک کرتے ہوئے ایک دوسرے کو گلے لگائیں سو میرے عزیزو:

اپنے مالک سے تعلق کی نئی راہیں بھی ڈھونڈ صرف سجدوں ہی سے روشن اپنی پیشانی نہ کر

بروز سوموار 23 جمادی الاوّل 1443ھ 27 دسمبر 2021ء

عرفان یاسکون

جس ذات نے انسانی آنکھ کو دیکھنے والا بنایا، اسی نے انسان کے دیکھنے کیلئے ایک خوبصورت کائنات بنائی۔ رنگا رنگ جلوے پیدا فرمائے اور ان جلوؤں میں افادیت نہ اپنی جلوہ گری کے کرشمے دکھائے۔ فنکار، فن کے جلوؤں میں خود جلوہ گر ہے۔ آنکھ نہ ہوتی تو کسی رنگ اور کسی روشنی کی کوئی ضرورت و تھی۔ مشاہدہ، جہاں مشہود کی جلوہ گری کا کمال ہے، وہاں یہ شاہد کے اندازِ نظر کا حسن بے مثال بھی ہے۔ قدرت نے جس ذوقِ تخلیق کا اظہار بے رنگ زمیں میں رنگ دار گل کاری کر کے کیا ہے، اس کی داد بس چشمِ بینا ہی دے سکتی ہے۔ بس آنکھ والا ہی ترے جوبن کا تماشا دیکھ سکتا ہے۔ دیدۂ کور پھر دیدۂ کور ہی ہے۔

آنکھوں میں جلوے اور جلوؤں میں آنکھیں... خوشبو میں رنگ اور رنگ میں خوشبو.....ہر چیز ہر دوسری شے کے خیال میں محو..... محو کرنے والا اور محو ہونے والا... سب ایک ہی محویت کا حصہ ہیں... میں وصول بھی کرتا ہوں اور میں ہی ارسال بھی کرتا ہوں... چہرے بھی میرے ہیں اور آنکھیں بھی وقت بدل میری ہیں..... میرے ہی خیال کی زد میں ہیں..... سب فاصلے..... سب دوریاں پاس ہی رہتی ہیں... بس اک نگاہ کی بات ہے... اتفاقاً ہی اٹھ گئی تو ناممکنات جائے گا..... انقلاب بپا ہو جائے گا..... جو نہیں ہے ہو جائے گا..... اور جو ہے وہ نہیں رہے گا... حاضر غیب ہو جائے گا اور غیب حاضر..... شروع ہو جائیں کو ممکنات بنانے والی آنکھ کسی وقت اٹھ سکتی ہے..... اور پھر حجابات اٹھ جائیں گے... سکوت سے کلام کا پہلو نکل آئے گا۔ صدیاں سمٹنا گی اور لمحے پھیلنے شروع ہو جائیں گے... بطون سے ظہور کا سفر بس اک نگاہ کا سفر ہے... ظلمات سے نور کا سفر ایک نگاہ کا سفر ہے..... بیگانے کو اپنا بنانے .....ورنہ دامن عمل تو خالی کیلئے ایک نظر کافی ہے... جان لینے کے ارادے سے آنے والا جانثار بن جاتا ہے..... یہی اعجاز نگاہ ہے... اپنا مقدر بس وہی نگاہ ہے ہے۔

اور ہمارے بابے اقبال نے بھی کمال کیا ہے، کبھی فرصت ہو تو دیکھئے۔ واہ واہ، کیا بات ہے ان کی تو!.....

آہ کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے
راہ تُو، رہرو بھی تُو، رہبر بھی تُو، منزل بھی تُو
اور اسے بھی تو دیکھ لیجئے ذرا، حکیم تھا ناں وہ، تو مرض بھی نیا دے گیا ہے۔
ترے سینے میں دم ہے دل نہیں ہے
ترا دم گرمیٔ محفل نہیں ہے
گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے!

یہ میں کیا لکھ بیٹھا آج۔ چلئے آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں!

ٹوکیو (جاپان) کے نواح میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، اس کے اسٹیشن کے سامنے چوک میں ایک کتا تھا، اس کا معمول تھا کہ وہ اپنے مالک کو ہر صبح ٹوکیو جانے والی ٹرین پر سوار کراتا تھا اور ہر شام مقررہ وقت پر اسے لینے کیلئے وہاں موجود ہوتا تھا۔ ایک دن اس کا مالک ٹوکیو میں حادثے کا شکار ہو کر چل بسا اور اس شام

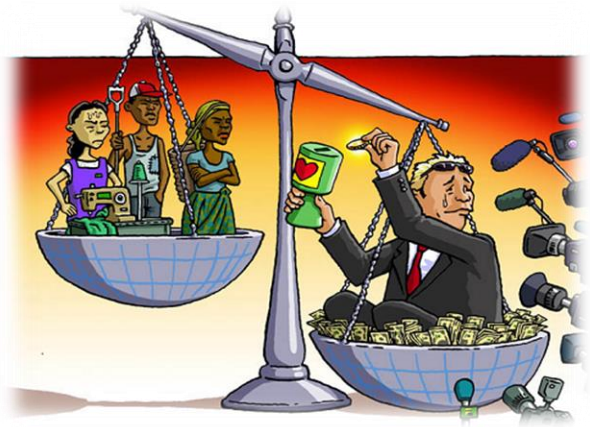

مقررہ ٹرین سے وہ گھر نہ لوٹ سکا۔ وفادار کتا اس شام بھی اسٹیشن پر آیا اور پھر جو اس کے انتظار میں بیٹھا تو مرتے دم تک اس نے وہ جگہ نہیں چھوڑی۔ قصبے کے لوگ کتے سے واقف تھے، اس کے مالک کی موت سے آگاہ تھے، ان کی تمام کوششوں کے باوجود کتا اپنی جگہ سے نہ ہلا، یہاں تک کہ وہیں مر گیا۔ لوگوں نے اس کی یاد میں اس کا مجسمہ چوک میں نصب کر دیا۔ غور کیجئے تو یہاں اہمیت مجسمے کی نہیں اُس مقصد کی ہے جس کی خاطر کتے نے جان دی، اہمیت اس کے جذبۂ وفاداری کی ہے، اس کی محبت کا محور صرف اس کا مالک تھا، اس کی زندگی صرف اسی کیلئے تھی، وہ مر گیا تو کتے نے بھی زندہ رہنا گوارا نہ کیا۔

باباجی کہہ رہے تھے کہ میرا اپنا گھوڑا تھا موتی۔ میں نے شہ سواری موتی کی کمر پر بیٹھ کر سیکھی۔ کیا مجال کہ موتی پر کوئی دوسرا سوار ہو جائے۔ پاکستان بنا، موتی کو میں نے اپنے محلے کے ایک شخص کیلاش کے حوالے کر دیا اور پاکستان آ گیا۔ معلوم ہوا کہ موتی اس قدر رویا کہ نابینا ہو گیا اور جان دے دی۔ موتی کی یاد کیلئے اس کی تصویر میرے پاس ہے مگر موتی نے مجھے جو درسِ محبت دیا اور اذیت فراق کا جو مفہوم سمجھایا وہ ناقابلِ فراموش ہے!!

شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ کل صبح ایک پرندہ بڑے درد و سوز سے بول رہا تھا، اس کی آواز سن کر میرے ہوش جاتے رہے۔ صبر، برداشت اور ہوش کا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا، میری یہ حالت دیکھ کر میرے دوست نے کہا: میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک پرندے کی آواز سن کر تم اپنی سدھ بدھ کیوں کھو بیٹھے۔ میں نے کہا "مجھے یہ تو بتا کہ یہ کہاں کی آدمیت ہے کہ پرندہ تو مسلسل اللہ کی حمد کرے اور میں انسان ہو کر خاموش رہوں"۔ شیخ سعدی بصارت و بصیرت کی عظمتوں پر فائز تھے۔ انسانیت ان کا کردار تھا اور زندگی کا کوئی لمحہ انہوں نے بے فکری سے نہیں گزارا۔ انہوں نے اس راز کو پا لیا تھا کہ ہر ذی روح کی حیات مستعار کا ہر لمحہ اپنے اندر معنویت رکھتا ہے۔

ایک پرندہ چہچہایا تو سعدی نے اس کی چہچہاہٹ کو مقصدیت و معنویت دے دی۔ ہم درختوں پر روز و شب پرندوں کو ایسا کرتے دیکھتے ہیں یا گزر جاتے ہیں یا غلیل سے شکار کر لیتے ہیں، اب تو غلیل کا استعمال بھی بدل گیا ہے۔ یہ اندازِ فکر کا فرق ہے۔ ایک فکر وہ ہے کہ ایک کتے کی وفاداری کو جاپان کے دیہاتیوں نے دوام دے دیا اور ہم ہیں کہ انسان کی وفاداریوں کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔

مجھے وہ رات یاد ہے جب میرے ملک میں ستمگر سیلاب نے قیامت خیز تباہی مچادی، اس قیامت صغریٰ پر ہر آنکھ اشکبار تھی۔ کل جو اپنے مال سے زکوٰۃ کا اہتمام کرتے تھے آج وہ صاحبِ نصاب نہیں رہے۔ ایک ہی رات نے شاہ سے گدا بنا دیا۔ سیلاب کی تباہ کاریوں کی خبریں دل پر بڑی گراں گزر رہی تھیں اور پھر محبت کرنے والوں سے کوئی رابطہ بھی نہیں ہو رہا تھا کہ اچانک باباجی کا فون آ گیا۔ میرے سرد لہجے سے میری پریشانی بھانپ گئے اور میرے مغموم ہونے پر وہ بھی اپنے حزن و ملال پر قابو نہ پا سکے اور انتہائی دل گرفتہ ہو کر ایک کہانی سنا دی جس نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا:

ایک بزرگ جو تلاشِ عرفان میں جنگل جنگل مارے مارے پھر رہے تھے۔ ایک دن گاؤں کے باہر بچے ایک گڑھے کے گرد کھڑے تالیاں بجا رہے تھے۔ اس گڑھے میں کتیا نے بچے دیئے تھے۔ وہ بے حد کمزور تھی، گڑھے سے باہر آنے کی کوشش کرتی ہے تو کمزوری کے باعث واپس لڑھک

جاتی۔ بچے اس منظر کا لطف لے رہے ہیں اور خوش ہو رہے ہیں۔ بزرگ یہ دیکھ کر گاؤں کے نان بائی کے پاس آئے، روٹی خریدی، دودھ فروش سے مٹی کے پیالے میں دودھ لیا، دودھ میں روٹی بھگو کر گڑھے میں اترے اور برتن کو کتیا کے آگے رکھ دیا۔ وہ جانے کب سے بھوکی تھی، جلدی جلدی پیٹ بھرا اور منہ اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھنے لگی۔ بزرگ فرماتے ہیں: مجھے ٹھیک اسی وقت وہ چیز مل گئی جس کا میں برسوں سے متلاشی تھا اور جنگل جنگل مارا مارا پھر رہا تھا۔ یہ حصولِ عرفانِ ذات کا آزمودہ طریقہ ہے۔ لفظ "عرفان" شاید آپ کو نہیں بھایا۔ اس کی جگہ لفظ "سکون" استعمال کر لیتے ہیں۔ آج کے ہر انسان کو اس کی تلاش ہے، میرے خیال میں آج کل کے تمام امراض کی اصل "عدل سکون" ہی ہے۔

سکون کے متلاشیوں کو چاہئے کہ "طالب علم" بن جائیں۔ دولت، حسن، اقتدار اور حیثیت ہی کو نعمت عظمیٰ نہ سمجھ بیٹھیں۔ قدرت نے ایسی بے شمار اشیاء تخلیق کی ہیں جن کو دیکھ کر اور جن کو سمجھ کر ہم حقیقت او غیر حقیقت میں تمیز کر سکتے ہیں۔ بے شمار کام ایسے ہیں جن کے انجام دینے سے گہری طمانیت حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ زندگی کے وہ حقائق ہیں جنہیں تا قیامت جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ طالب علم بننے میں یہی نکتہ پوشیدہ ہے کہ آدمی دیکھے، سیکھے، سوچے اور راہِ راست اختیار کرتا چلا جائے۔ ایسے ہی لوگ قلبِ مطمئن کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ اللہ سے راضی اور اللہ ان سے راضی ہوتا ہے اور جان رکھئے کہ "اصل توانائی روح کی بالیدگی ہے"۔ ہمارے چاروں طرف ایسی نشانیاں بکھری پڑی ہیں، بھوک و افلاس کے مناظر پکار رہے ہیں، جلدی کیجئے، کہیں ان کی "عزت نفس" کو ٹھیس نہ پہنچے، اس سوہنے خالق کی مخلوق تک پہنچنے کی کوشش کیجئے!

بروز منگل 24 جمادی الاوّل 1443ھ 28 دسمبر 2021ء

امریکا ویورپ کی باہمی مجبوریاں

اہلِ یورپ آج بھی اس خیال کے حامل ہیں کہ علم اور ٹیکنالوجی کے میدان میں غیر معمولی پیش رفت کے ذریعے وہ بھرپور فتوحات کے حامل ہوتے چلے جائیں گے۔ یہ محض خام خیالی ہے۔ عسکری قوت کے بغیر کسی بھی سطح پر اپنے آپ کو منوانا انتہائی دشوار ہوتا ہے۔ یورپ کو نرم قوت پر ناز ہے مگر اب وہ سوچنے پر مجبور ہو رہے ہیں کہ عسکری قوت کے بغیر آگے بڑھتے رہنا اور اپنی فتوحات کو برقرار رکھنا انتہائی دشوار ہے۔ یورپ کے بہت سے باشندوں نے اس حقیقت پر ہمیشہ فخر کیا ہے کہ انہوں نے امریکا کی طرح ہر معاملے میں عسکری قوت بروئے کار لانے پر ٹیکنالوجی اور معاشی قوت کو آلہ کار بنانے کو ترجیح نہیں دی۔ ان کے خیال میں ایسا کرنے سے دنیا بھر میں یورپ کے حوالے سے یہ تاثر مستحکم ہوا ہے کہ وہ اپنے مفادات کیلئے کسی کے امن کو داؤ پر لگانے کی بجائے مل جل کر چلنے پر یقین رکھتا ہے۔ یورپ کے عام باشندے کے دل میں یہ احساس پایا جاتا ہے کہ دنیا کو اصولوں اور اخلاقی اقدار کے مطابق چلانے کی کوشش کر کے یورپ کے قائدین نے امریکا پر اخلاقی برتری حاصل کی ہے۔ ہر معاملے کو عسکری قوت کے ذریعے حل کرنے کے بجائے بات چیت، اشتراکِ عمل، معاونت اور امن کے ذریعے درست کرنے کی کوشش اہلِ یورپ کے نزدیک بہت وقیع ہے۔

یورپی قائدین کو اس بات کا احساس تھا کہ اگر وہ ایک معاملے میں طاقتور نہیں ہیں تو دوسرے معاملے میں ہیں۔ عسکری قوت اگرچہ کم ہے مگر معاشی اعتبار سے سپر پاور کے درجے میں ہونا کیا بُرا ہے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ عسکری مہم جوئی سے گریز کر کے وہ اپنی طرزِ زندگی کو محفوظ رکھنے میں بہت حد تک کامیاب ہو جائیں گے۔ یورپی یونین اِسی خیال سے اب تک عسکری مہم جوئی سے گریز کی راہ پر گامزن دکھائی دے رہی تھی لیکن نیٹو کو امریکا کے ماتحت کر کے اس تاثر کی نفی ہو گئی ہے۔

یقیناً 1990ء کے عشرے میں بین الاقوامی ادائیگیوں کو ڈالر سے الگ کرنے کی خاطر یورو کا متعارف کرایا جانا بھی اسی سلسلے کی کڑی تھا۔ فرانس کے ارادے بلند تر تھے تاہم جرمنی بعض معاملات میں متشکک دکھائی دیا۔ امریکا کیلئے یہ مشکل گھڑی تھی۔ اُسے اندازہ تھا کہ یورپ اپنا راستہ بدل رہا ہے۔ عالمی مالیاتی نظام اب تک ڈالر سے وابستہ ہے۔ یورو کا متعارف کرایا جانا اِس امر کی دلیل تھا کہ یورپ اب امریکا کی پالیسیوں سے زیادہ متفق نہیں۔ یورپی یونین کو یہ اندازہ نہ تھا کہ بھرپور عسکری قوت کے بغیر وہ اپنی خارجہ پالیسی کو بہتر انداز سے آگے نہ بڑھا سکے گا اور معاشی مفادات کو تحفظ فراہم کرنا بھی ممکن نہ رہے گا۔ امریکا نے اس کمزوری کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مفادات کو زیادہ سے زیادہ تحفظ فراہم کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ ایران کے معاملے میں اُس نے یہی کیا ہے۔ امریکی قیادت نے ایران پر نئی پابندیاں عائد کرنے کے ساتھ ساتھ اُن یورپی کاروباری اداروں کے خلاف بھی کارروائیوں کا اعلان کر دیا جو ایران سے لین دین جاری رکھیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ امریکا نے اُن اتحادیوں کے خلاف کارروائی کا بھی عندیہ دیا ہے جو ایران سے تیل خریدنا ترک نہیں کریں گے۔

فولاد اور دیگر اشیا پر درآمدی ڈیوٹی میں اضافے سے بھی نئی اقتصادی جنگ شروع ہوئی ہے۔ امریکا نے چین سے فولاد اور دیگر اشیا کی درآمد پر ڈیوٹی بڑھائی تو چین نے بھی جوابی اقدامات کیے۔ اب کوئی ہفتہ نہیں گزرتا جب دونوں ممالک مختلف اشیا پر درآمدی ڈیوٹی بڑھانے کا اعلان نہ کرتے ہوں۔ یورپی یونین کے کاریں بنانے والے ادارے بھی پریشان ہیں کہ اس صورت حال میں کریں تو کیا کریں۔ تجارتی جنگ سے جلد یا بدیر محض نقصان ہی ہوگا۔ امریکا اور یورپ دونوں کے صنعتی اور تجارتی اداروں کو غیر معمولی مسابقت کا سامنا ہوگا۔ خام مال مہنگا ہوتا جائے گا۔ منافع کی شرح گرتی جائے گی۔ یورپ کے بہت

سے صنعتی اداروں کو چین کی بڑھتی ہوئی معاشی ترقی کے سبب اپنی سرگرمیوں کا بڑا حصہ امریکا منتقل کرنا پڑے گا۔امریکی اداروں کا بھی حال بُرا ہی ہوگا۔یہ سب کچھ ایک بڑے معاشی بحران کو جنم دینے کا سبب بن سکتا ہے۔معاملات زیادہ بگڑنے کا خدشہ یوں بھی ہے کہ یورپی یونین کے بہت سے ارکان سلامتی کے حوالے سے نیٹو کی کمٹمنٹ پوری کرنے سے متعلق اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی کوشش نہیں کر رہے۔جرمنی اور دیگر بڑی طاقتوں سے یہ شکایت عام ہے کہ وہ عسکری کاروائیوں کیلئے خاطر خواہ فنڈز فراہم نہیں کر رہے۔اگر فنڈز کی کمی برقرار رہی تو امریکا نیٹو کے پلیٹ فارم سے مشرقی یورپ میں پولینڈ،ایسٹونیا،لٹویا اور لتھوانیا کی سلامتی کی ذمہ داری سے کنارہ کش ہو سکتا ہے۔یہ صورت حال بہت پریشان کن ہے اور یہ صورتحال برقرار رہی تو تجارتی جنگ کو کسی انتہائی خطرناک مرحلے میں داخل ہو سکتی ہے۔

انیسویں صدی کے دوران افیون کی جنگ کے دوران برطانوی برآمدات کو کسی بھی رکاوٹ سے بچانے میں مرکزی کردار برطانوی قیادت کی جانب سے طاقت کے استعمال کی دھمکی نے ادا کیا تھا۔امریکا بھی یہی کچھ کرتا آیا ہے۔اب بھی وہ اپنے معاشی مفادات کو زیادہ سے زیادہ تحفظ فراہم کرنے کی خاطر طاقت کے بے محابا استعمال کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔اگر امریکا اپنی منڈیاں بند بھی کردے تو بعض خطوں سے فوج ہٹانے کی دھمکی اُس کی مصنوعات کیلئے راہ کھلی رکھنے میں کامیاب ہو سکتی ہے۔

یہ نکتہ کوئی بھی ایک مضبوط دلیل کی حیثیت سے پیش کر سکتا ہے کہ مشرقی یورپ سے افواج ہٹانا حکمتِ عملی کے اعتبار سے ایک بڑی غلطی تصور کیا جائے گا کیونکہ ایسا کرنے سے روس کو اپنے اثرات کا دائرہ وسیع تر کرنے میں غیر معمولی حد تک مدد ملے گی۔اس سلسلے میں امریکا ایسی فضا پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے جہاں معاملات اس کے حق میں ہموار ہوں اور دوسرا روس کو کنٹرول کیا جاسکے،اس سے مشرقی یورپ میں یہ تاثر پیدا ہوگا کہ اس کا وجود خطرے میں ہے۔ایسی صورت میں یورپی یونین کیلئے امریکا کی مرضی کی راہ پر گامزن ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے گا۔ابہام پیدا کرکے امریکی قیادت سرمایہ کاری کا رخ بھی موڑ سکتی ہے اور ووٹرز کو بھی مجبور کر سکتی ہے کہ وہ طاقت کے استعمال کے حق میں ووٹ دیں۔یورپی قائدین اب تک اس امر کے خواہش مند رہے ہیں کہ معاشی قوت سے کام لیا جائے اور عسکری قوت کو بہترین آپشن کی حیثیت سے بروئے کار نہ لایا جائے جبکہ امریکا چاہتا ہے کہ عسکری قوت کے استعمال کا آپشن پہلے نمبر پر رکھا جائے۔اس کی تمام پالیسیاں عسکری قوت کے استعمال کے ذریعے اپنی بات منوانے کی بنیاد ہی پر استوار ہیں۔

ٹرمپ کے دور میں،بدقسمتی سے،یورپ کیلئے پیغام یہ رہا ہے کہ اگر وہ اپنے معاشی مفادات کو حقیقی اور دیرپا تحفظ فراہم کرنا چاہتا ہے تو اپنے طور پر کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا یعنی عسکری قوت کے ذریعے دنیا کو یہ پیغام دینا پڑے گا کہ وہ اپنے مفادات کو تحفظ فراہم کر سکتا ہے۔اس لئے یورپی یونین کیلئے ممکن نہیں کہ عسکری قوت بروئے کار لائے بغیر خارجہ پالیسی اور معیشت کے میدان میں اپنی بات باقی دنیا سے منوا سکے۔یورپ پر یہ بھی واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اگر وہ اپنے معاشی مفادات کو حقیقی تحفظ فراہم کرنے کا خواہش مند ہے تو امریکا پر زیادہ انحصار کرنا چھوڑ دے لیکن افغانستان سے انخلا نے صورتحال مکمل طور پر تبدیل کر دی ہے۔

بروز بدھ 25 جمادی الاوّل 1443ھ 29 دسمبر 2021ء

زندگی تو کب کی مر گئی ہے

ہاں میں ہی تو اسے جانتا ہوں اور کون جانتا ہے اسے۔ وہ تو خود کو بھی نہیں جانتا۔ میرا دوست ہے وہ۔ عمر میں مجھ سے بہت چھوٹا۔ اس دنیا کا باسی ہوتے ہوئے بھی یکسر مختلف ہے۔ اس کا ہر کام نرالا ہے۔ بالکل مرعوب نہیں ہے وہ اس سنسار سے۔ نجانے کیا کیا کرتا پھرتا ہے۔ اس ہشت رخی سماج کا باغی۔ آپ اسے پیسے سے نہیں خرید سکتے، بالکل بھی نہیں۔ گفتگو تو وہ کرتا ہی نہیں لیکن اگر کبھی بولنے پر آجائے تو سکتے میں آجائیں گے آپ۔ خاموش ہو جائے تو آپ اسے کھول ہی نہیں سکتے۔ ہاں وہ میری طرح ایک رشتے کو مانتا ہے، محبت کے رشتے کو۔ انسانوں سے ہی نہیں، جانوروں، پرندوں، درختوں سے، دریاؤں سے، ندی نالوں سے، بپھرے سمندر سے، مفلوک الحال مچھیروں سے، خون تھوکتے مزدوروں سے، خاک بسر انسانوں سے جو بھی کچھ ہے محبت کا پھیلاؤ ہے۔

تب لنڈے کے کپڑے پہننے والا مست ملنگ۔ آپ کا خوشبو میں بسا ہوا قیمتی لباس، اسے بالکل متاثر نہیں کر سکتا۔ ہاں اگر آپ میں محبت کا زمزمہ بہتا ہو آپ اسے اسیر کر سکتے ہیں۔ پھر تو اسے کوئی بھی قید کر سکتا ہے۔ ہنسنے ہنسانے والا، گنگنانے والا، چہچہانے والا، لوگوں کے کام آنے والا۔ میرا یہ پاگل دوست یاور ہے، یاور شمشیر۔ وہ واقعی جادو گر ہے۔ دل موہ لینے والا۔ وہ ایک مصور ہے، مجسم مصور۔ آپ اس کے کمرے میں داخل ہو جائیں تو خود کو کسی جادو نگری میں پائیں گے۔ سب کچھ مختلف، انوکھا اور منفرد ہے۔ وہ ایک بڑے شاپنگ پلازہ میں لوگوں کی تصویریں بناتا ہے، لوگ لائنوں میں کھڑے اس کے اشارے کے منتظر رہتے ہیں لیکن وہ اپنا ماڈل خود منتخب کرتا ہے۔ کسی کی غلامی نہیں کر سکتا وہ۔ میں جانتا ہوں لوگوں نے اسے معقول مشاہرہ پر کام دینے کی سر توڑ کوشش کی۔ ایک زمانے میں اسے روزگار کی تلاش تھی اور اب روزگار اسے ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ وہ کسی کی ملازمت کر ہی نہیں سکتا۔ آزاد بندہ جو لوگوں کی آزادی کا بھی خواہاں ہے۔ وہ ٹیلی ویژن کے مختلف ڈراموں اور اسٹیج شوز میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھا چکا ہے لیکن وہ اداکار نہیں ہے۔ بہت معصوم سا بچہ اس کے اندر کلکاریاں مارتا رہتا ہے۔

چند سال قبل تھر میں ہم نے پانی کا ایک فلاحی پراجیکٹ شروع کیا اور وہ بھی میرے ساتھ ہو لیا۔ میری زندگی کا یہ پہلا مگر انتہائی خوفناک وزٹ تھا جس نے مجھے زندگی اور موت کی حقیقت کو اس قدر قریب سے دیکھنے کا موقع دیا کہ کس طرح پانی کے ایک کنستر کیلئے میلوں سفر کرنا پڑتا ہے اور وہ میلا گدلا پانی جس کو ہم دیکھنے کے بھی روادار نہیں، جہاں جانور اور انسان ایک ہی جگہ پانی پینے پر مجبور ہیں۔ ہم اپنی بساط کے مطابق کیا کچھ کر رہے ہیں، یہ ایک الگ داستان ہے لیکن یاور کا برا حال ہو گیا۔ اس نے وہاں کے مناظر کو ایسا پینٹ کیا کہ یہاں آتے ہی "پیاسا تھر" کے نام سے اپنی درجنوں پینٹ کی نمائش کر ڈالی۔ سب کی یہی رائے ہے کہ یاور کی تصویریں موجودہ نظام کے خلاف چیختی اور بین کر رہی ہیں۔ اس کی تمام تصویریں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئیں اور اس نے ساری رقم ہمارے ادارے کے حوالے کر دی کہ تھر کے فلاحی کاموں میں لگا دیں۔ وہ اب بھی اپنے برش اور کینوس کو پیاسے تھر کے فلاحی کاموں کیلئے وقف کر چکا ہے اور تھر زندگی کے مسائل کو اپنی تصویروں میں زندہ کر کے ان کی محرومیوں کو دور کرنے میں اپنا حصہ ڈال رہا ہے لیکن کیا مجال ہے کہ کبھی اس نے کسی اخبار یا الیکٹرنک میڈیا میں اس کی تشہیر بھی کی ہو بلکہ وہ ایسے موقع پر غائب ہو جاتا ہے۔ اس کو لاکھ سمجھایا کہ کم از کم میڈیا میں اس نیک کام کی تشہیر سے لوگوں کی توجہ بہتر انداز میں مبذول کروائی جا سکتی ہے لیکن وہ مسکرا دیتا ہے کہ مجھے صرف اپنا وہ کام کرنا ہے جس کی میرے رب نے توفیق عنائت کر رکھی ہے۔ آج بھی اس کا لباس، رہن سہن وہی ہے جو چند سال سے دیکھ رہا ہوں بلکہ ایک مرتبہ مجھے ملنے کیلئے آیا تو بارش میں شرابور تھا۔

میں نے اسے فوری طور پر اپنے کپڑے دیتے ہوئے مشورہ دیا کہ انہیں پہن لو کہیں تم بیمار نہ پڑ جاؤ۔ چند گھنٹوں کیلئے سوکھنے کیلئے لٹکا دو، پھر دوبارہ اسی کو پہن لینا۔ پہلے تو وہ تھوڑا سا کسمسایا پھر مان گیا۔ پہلی مرتبہ میں نے اسے شلوار قمیض میں دیکھا تو بے حد پیار آیا۔ میں نے انتہائی محبت سے اسے رکھ لینے کو کہا تو اس سے انکار نہ ہو سکا اور اب عید و دیگر تہوار پر بڑے شوق سے پہن کر میرے پاس ضرور آتا ہے۔

ایک زمانے میں ہم دونوں بہت ساتھ رہے ہیں۔ ہائیڈ پارک کی جھیل کے ایک کنارے پر مخصوص کونے میں بیٹھ کر کئی مرتبہ چائے اور کافی کا مزا بھی لیتے رہے ہیں، دریائے ٹیمز کے کنارے ایک گوشے میں بیٹھ کر ایک دوسرے کو غزلیں سنائی ہیں۔ انگریزی اور فرانسیسی ادب پر بات کی ہے لیکن ٹھہریئے، یہ سب کچھ بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ بالکل بھی نہیں۔ مجھے یاد ہے ایک دن اس نے مجھے کہا: "میں شیطان کا کردار ادا نہیں کر سکتا۔" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا "تو کس نے کہا ہے تمہیں شیطان کا کردار ادا کرنے کو۔" وہ بہت ہنسا اور کہنے لگا:

"اس دنیا کے لوگوں نے اور کس نے "بکواس بند کرو، سیدھی طرح بتا کیا چاہتا ہے"۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں سر جھکایا اور کہنے لگا "آپ بھی ناں، دیکھئے ہمارے آس پاس منافقت ہی منافقت ہے۔ آپ ہی تو کہتے ہیں یہاں کوئی رشتہ نہیں ہے، سب تاجر ہیں، ہر شے کے دام ہیں، سب خود کی محبت کے اسیر ہیں۔ محبت میں دینا ہی دینا ہے لینا کہاں ہے۔ ہم سب ایک دوسرے کو بہت خلوص سے شیطان کا پیروکار بننے کی تلقین کرتے ہیں۔ اس ہاتھ دو، اس ہاتھ لو۔ ہم کہتے کچھ ہیں، کرتے کچھ ہیں۔ یہ شیطانی کام نہیں تو اور کیا ہے۔ نہیں نہیں میں یہ کردار ادا نہیں کر سکتا لیکن آپ اگر کوئی ایسا ڈرامہ لکھیں جس میں ہمارے معاشرے کے شیاطین کا ذکر ہو تو میں اس کردار کو خوشی سے کروں گا کہ میں اب معاشرے کی ان شیاطین کو بخوبی سمجھ چکا ہوں۔ رات کے اندھیروں میں مجبور عصمتوں کی چیر پھاڑ کرنے والے یہ خوفناک درندے، دن کے اجالے میں میڈیا اور بالخصوص ٹی وی پر کس قدر شرفاء کا روپ دھارے پند و نصائح کے ساتھ اشک بہا رہے ہوتے ہیں۔ ملک میں فلاحی کاموں کے افتتاح پر اپنے نام کی تختی لگا کر حکومت کے خزانے یا لوگوں کے چندے سے لاکھوں روپے ڈکارنے کے باوجود بلند ہاتھوں سے دعا میں مصروف نظر آنے کی ایکٹنگ کر رہے ہوتے ہیں۔

ہم ہر روز دیکھتے ہیں کہ ان کی کروڑوں روپے کی مالیت کی گاڑی کے ساتھ ساتھ ان کے متوالے اور جیالے بھاگتے ہوئے ان کی گاڑی کے اوپر پھولوں کی پتیاں نچھاور کر رہے ہوتے ہیں جبکہ یہ عدالت میں ملک و ملت کے کروڑوں روپے کرپشن کے مقدمے کیلئے حاضری کیلئے جا رہے ہوتے ہیں۔ عدالت کے احاطے میں ان کی گاڑی تو داخل ہو جاتی ہے لیکن پھول نچھاور کرنے والے متوالے بس دور سے ان کی ایک جھلک دیکھ کر "زندہ باد" کے کے نعرے لگاتے ہوئے اپنے خشک گلے کے ساتھ گر جاتے ہیں اور کئی دوسرے متوالے ان پر پاؤں رکھ کر گزر بھی جاتے ہیں۔ پچھلی سات دہائیوں سے ان کی تقدیر نہیں بدل سکی لیکن ان کی یہ رہنماء ہر سال اپنی کروڑوں روپے کی گاڑیوں کے ماڈل ضرور تبدیل کر لیتے ہیں۔

میں سوچتا ہوں کہ وہ بہت عجیب ہے، بہت زیادہ۔ مجھے یاد ہے کہ ایک زمانے میں جب لڑکیاں اس کے ارد گرد منڈلاتی رہتی تھیں، میں نے اس سے کہا "یار! تو شادی کیوں نہیں کر لیتا؟" آپ بھی ناں، میں انہیں افورڈ ہی نہیں کر سکتا۔ ہر دوسرے مہینے تو یہ گاڑی بدل لیتی ہیں، مجھے بھی کبھی جلد بدل دیں گی۔ نہیں نہیں مجھے معاف کیجئے میں ایسے ہی بھلا ہوں

"پھر اس کا قہقہہ گونجتا۔ بھرپور زندگی لئے ہوئے قہقہہ۔ میں اس کے طنز کو جانتا ہوں۔

پھر ہم دونوں، دونوں ہی کیا ہم سب کے سب جیتے جی دنیا کو پیارے ہو گئے۔ زندگی سے لڑنا کوئی آسان کام ہے بھلا۔ اور پھر ہم بد دماغوں کا دنیا سے لڑنا... ایب نارمل لوگ۔ ہاں مجھے اقرار ہے، میں اپنے رب کا شکر ادا کرتا ہوں، میرے سارے دوست نارمل نہیں ہیں۔ پاگل ہیں، سب کے سب۔ میرے مولا تیرا شکر ہے تو نے مجھے ایسے چڑیا دوست دیئے۔ میں اپنے دوستوں کی بات کر رہا ہو، میرے شناسا تو بہت ہیں، وہ سب انسان ہیں، نارمل فون پر اس کی آواز سنائی انسان... لیکن میری ان سے دوستی کب ہے۔ شناسائی ہے بس، شناسائی۔ یاور سے میری ملاقاتیں کم کم ہونے لگیں، کبھی کبھار جب میں کہتا "تو کہاں غرق ہو گیا ہے" تب اس کا وہی قہقہہ گونجتا "آپ ہی تو کہتے ہیں ہم جیتے جی مر گئے"۔ دیتی "آپ بھی ناں، کہاں غائب ہیں۔"

چھ سات ماہ پہلے اس کا بڑا بھائی میرے پاس آیا "بھائی، یاور کو کیوں نہیں سمجھاتے؟ آپ کی تو بات سنتا ہے، مانتا ہے۔" میں نے پوچھا کیا ہوا؟"" ہونا کیا ہے، کب کرے گا شادی؟" میں نے ان کے سامنے یاور کو فون کیا۔ "جی، جی، جی کیا بات ہے آپ کی واہ واہ، آپ ہی کو یاد کر رہا تھا، حکم کیجئے۔"" تو شادی کیوں نہیں کرتا؟" وہ بہت ہنسا "سب لوگ ڈھونڈ رہے ہیں لڑکی، جلد کر لوں گا، آپ کو بتاتا ہوں، اس وقت راستے میں ہوں۔ تھوڑی دیر بعد فون کروں گا"۔ اس کے بڑے بھائی کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔ "ٹھیک ہے میں نے یاور سے کہہ دیا ہے، انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" ایک دن رات گئے اس کی بہن کا فون آیا "بھائی کیسے ہیں آپ؟"۔ "میں ٹھیک ہوں، خیریت تو ہے؟" آپ یاور کو سمجھائیں ناں، ہم سب اپنے گھروں کے ہو گئے، ابو ہیں نہیں، امی کب تک اسے سنبھالیں، وہ تو خود اتنی کمزور ہو گئی ہیں، کون سنبھالے گا اسے، کب کرے گا وہ شادی"۔ اچھا تم مطمئن ہو جاؤ ابھی اسے ٹھیک کرتا ہوں۔

میں بہت غصے میں تھا، تھوڑی دیر بعد میں نے یاور کو فون کیا اور اتنی سنائیں کہ اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ خلاف معمول وہ خاموش تھا۔ پھر اس کی آواز آئی "میں ابھی آ رہا ہوں آپ کے پاس، آپ جو کہیں گے، وہی کروں گا۔ پہلے میری بات سن لیجئے گا۔ وہ میرے پاس آیا اور آتے ہی شروع ہو گیا۔ "آپ کو کیا ہوا ہے، نہیں نہیں میں آپ سے ملنے آیا ہوں لیکن یہ میرے سامنے آپ نہیں ہیں۔ میں جن سے ملنے آیا ہوں وہ کہاں ہیں۔ نہیں نہیں یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ بالکل بھی نہیں۔ یہ ہم سب کے ساتھ زیادتی ہے۔" شفیق نے بھی جو میرا جانی دشمن ہے، اس کا ساتھ دیا" بالکل یہ زیادتی ہے۔ تمہیں تمہاری ضرورت نہیں ہے، ہم سب جانتے ہیں۔ ہمیں تو ہے ناں۔" بہت مشکل سے میں نے انہیں چپ کرایا۔

"ہاں یاور بول کیا مسئلہ ہے۔ کیوں نہیں کرتا شادی۔ کیوں پریشان کر رہا ہے سب کو۔ سیدھی طرح بات کرنا۔ مجھے تمہاری بکواس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" ہاں میں بہت تلخ تھا۔ اس نے سر جھکایا "آپ ٹھیک کہتے تھے، میں نہیں مانتا تھا، اب میں مانتا ہوں۔ یہاں ہم سب کے سب غلام ہیں۔ قیدی ہیں۔ دنیا کے قیدی۔ ہم نے عذاب خود خریدے، ہم نے اپنا دوزخ خود بنایا۔" اپنا فلسفہ میرے سامنے مت بگھار۔ یہ میں تجھ سے زیادہ بگھار سکتا ہوں، سیدھی طرح بکواس کرو چاہتا کیا ہے۔

"یہاں جینا کتنا مشکل ہے۔ ہمیں سنایا جاتا ہے سادگی اختیار کرو، اسراف مت کرو لیکن جب ہم سادگی اختیار کرتے ہیں تو لوگ نجانے ہمیں کیا کیا کہتے ہیں، ہمیں انسان نہیں دوسرے سیارے کی مخلوق سمجھتے ہیں"۔ تو اصل بات کیوں نہیں کرتا، مجھے تیرا بیہودہ لیکچر نہیں سننا۔ میں زچ ہو گیا ہوں تمہاری

گفتگو سے۔ ''اچھا، اچھا سیدھی بات بتاتا ہوں۔ میں شادی کرنے کیلئے تیار ہوں لیکن بہت سادگی سے۔ کوئی مہندی نہیں، کوئی موو ی نہیں، کوئی بکواس نہیں۔ بس سادگی سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے بالکل بھی جہیز نہیں چاہئے''۔ تو اس میں کیا مسئلہ پھر؟

''ہاں یہی تو مسئلہ ہے سب سے بڑا۔ پچھلے آٹھ ماہ میں درجنوں لوگوں نے میرے انٹرویو کیے۔ کسی کو میرا کام پسند نہیں آتا۔ کسی کو میرا حلیہ پسند نہیں آتا۔ چاچا، ماما، بہنوئی، خاندان بھر کے سامنے انٹرویو دیتے دیتے تھک گیا ہوں۔ بہت کو میں پسند بھی آیا تو وہ سادگی سے شادی پر تیار نہیں ہیں۔ میں نے ایک بیوہ سے بھی اپنی بہن کے ذریعے بات کی تو وہ بھی تیار نہیں ہے اور میں اس شادی کی خرافات اور بیہودہ رسموں کو نہیں مانتا۔ اصل تو نکاح ہے ناں، آپ نے درجنوں نوجوانوں کے نکاح مسجد میں خود پڑھائے ہیں اور میرے علم کے مطابق سب خوشی سے اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ میری عمر 35 سال ہو گئی ہے، میری کوئی ڈیمانڈ نہیں ہے۔ بس میں سادگی سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور کوئی تیار نہیں ہے۔ اب میرا قصور بتائیے۔ آپ ہی تو کہتے تھے یہاں شادی کیا موت بھی مشکل ہے۔ مرنے پر بھی کمر توڑ خرچ اٹھ جاتا ہے۔ میں بھی قرض لوں، لڑکی والے بھی قرض لیں، موو ی بنے تو کوئی نہ کوئی رشتے دار ناراض ہو جاتا ہے۔ شادی کے بعد کوئی گھر آئے تو اسے البم دکھاؤ۔ موو ی دکھاؤ۔ لڑکے والے بھی پریشان کہ اب قرض کیسے چکائیں اور لڑکی والے بھی بیزار کہ اب کیسے حساب بے باق ہو گا۔ ساری زندگی کا گورکھ دھندا رسومات ہی رسومات۔ کسی غریب کا ہاتھ نہیں پکڑیں گے۔ میں تو سب کچھ قبول کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ آپ ابھی کہیں میں اسی وقت آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔ جو آپ کہیں گے میں کروں گا''

میرے سامنے یاور بیٹھا تھا۔ اس کے اندر کا معصوم بچہ اب بھی زندہ ہے۔ وہ سماج کو اس کی اصل شکل دکھانے کیلئے آئینہ لئے گھوم رہا ہے۔ سچ کہتا ہے وہ، ہم سب منافق ہیں۔ کہتے کچھ ہیں، کرتے کچھ ہیں۔ ہم سب غلام ہیں، سماج کے غلام۔ ہاں یہاں باغیوں کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ پاگل ایب نارمل لوگ۔ ہر طرف تاجر، دھوکا دہی دھوکا۔ کوئی دینے والا نہیں ہے، سب کے سب لینے والے۔ کہاں ہے اس میں محبت، اخلاص، ایثار۔ ہاں یہ لفظ گم ہو گئے ہیں۔ گلا سڑا سماج، اس کی بدبو سے سانس لینا دوبھر ہو گیا ہے۔ پھر بھی ہم جی رہے ہیں۔ سسکنے کو جینا کہتے ہیں۔ ہم سب مر گئے ہیں۔ بدروحوں کے مسکن میں سسک رہے ہیں ہم سب۔ زندگی تو کب کی مر گئی ہے۔

کچھ بھی نہیں رہے گا۔ بس نام رہے گا اللہ کا۔

وہ جو گیت تم نے سنا نہیں، مری عمر بھر کا ریاض تھا
مرے درد کی تھی وہ داستاں جسے تم ہنسی میں اڑا گئے

بروز جمعۃ المبارک 26 جمادی الاوّل 1443ھ 31 دسمبر 2021ء

تدبّر سے کام لے اے ناداں

ہر سال جنوری کا مہینہ بہت سی خوشیاں اور کچھ بیتے غموں کی یاد لیکر آتا ہے کچھ تو اپنی خوشیوں میں مگن اور بعض اپنی محرومیوں کو یاد کر کے اداس ہو جاتے ہیں۔ نجانے کیوں ایک طویل عرصے کے بعد آج اندلس کی 2 جنوری 1492ء ربیع الاوّل کی بھی 2 تاریخ اور 897ھ کی سوموار کی وہ شام جو مسلمانوں کیلئے ذلت ور سوائی اور مسکینی بھر اپیغام لائی تھی، بے حد یاد آرہی ہے۔ شائد میرے ارض وطن پر ایسے ہی ذلت اور رسوائی کے مہیب سائے دن بدن بڑھ رہے ہیں جن سایوں کی وجہ سے یورپ کے قلب میں سقوط غرناطہ کا سانحہ پیش آیا۔ اس وقت کا غدار مسلمان بادشاہ ابو عبداللہ جس نے اپنے فوجی افسروں سے کہنا شروع کر دیا تھا کہ یہ وقت لڑائی کا نہیں ہے، ہمیں عیسائیوں سے صلح کر لینی چاہئے۔ جنگ کرنے سے شہر غرناطہ میں خون خرابہ ہو گا۔ اس "روشن خیال" بادشاہ نے خفیہ طور پر (بیک ڈور ڈپلومیسی چینل) اپنے وزیر کو فرنینڈس کے پاس صلح کی درخواست کیلئے بھیجا جسے فرڈی نینڈ نے منظور کیا اور صلح نامہ تیار کیا گیا جس پر دونوں فریقوں نے دستخط کئے۔ غرناطہ کے غیرت مند مسلمانوں نے مقابلہ کیا۔ وہ ہتھیار ڈالنے کے حق میں بالکل نہیں تھے مگر غدار بادشاہ ابو عبداللہ اور اس کے امیروں نے ان غیرت مند مسلمانوں کا ساتھ نہیں دیا بلکہ عوام کو اپنی روشن خیالی کے پردے کے پیچھے چھپی ہوئی ذلت آمیز صلح پر رضامند کروایا جس کے نتیجے میں اٹھارہ شرائط پر مبنی یہ معاہدہ طے پایا کہ:

(1) مسلمان غریب ہوں یا امیر، ان کے جان ومال کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا اور جہاں یہ رہنا چاہیں گے اجازت ہو گی۔

(2) ابو عبداللہ اپنے عہدیداروں اور شہریوں سمیت فرنینڈس اور ازابیلا کی وفاداری کا حلف اٹھائے گا۔

(3) مسلمانوں کے مذہبی امور میں عیسائی قطعاً دخل نہیں دیں گے۔

(4) تمام مسلمان قیدی رہا کئے جائیں گے۔

(5) کوئی عیسائی مسجد میں داخل نہیں ہو گا۔

(6) نو مسلم اپنے آبائی مذہب کو اختیار نہیں کریں گے۔

(7) مساجد اور اوقاف بدستور قائم رہیں گے اور ان امور میں عیسائی دخل اندازی نہیں کریں گے۔

(8) مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان مقدمات کی سماعت ایک مخلوط عدالت کرے گی۔

(9) مسلمانوں کے معاملات میں شریعت کے قوانین کی پابندی کی جائے گی۔

(10) اس جنگ میں جو مسلمان گرفتار ہوں گے انہیں فوراً رہا کیا جائے گا۔

(11) اگر کوئی مسلمان افریقا جانا چاہے تو اس کو مکمل آزادی ہو گی۔

(12) مسلمانوں کو عیسائی ہونے کی اجازت ہو گی۔

(13) جو مال غنیمت مسلمانوں کے قبضے میں آیا ہے وہ بدستور ان کی ملکیت میں رہے گا۔

(14) مسلمانوں کے گھروں میں کوئی عیسائی سپاہی متعین نہیں کئے جائیں گے۔

(15) موجودہ ٹیکس کے علاوہ کوئی جدید ٹیکس نہیں لیا جائے گا۔

(16)سلطان ابو عبداللہ کے سپرد ابشاراۃ کی حکومت کر دی جائے گی۔
(17)ساٹھ دن تک معاہدے کی تمام شرائط کی تکمیل کر دی جائے گی۔
(18)60دن کے اندر شہر غرناطہ، قلعہ الحمراءاور تمام سامان جنگ جو اس وقت قلعہ میں موجود ہے،عیسائیوں کے قبضے میں دے دیا جائے گا۔
یہ وہ18 شرائط تھیں جو ابو عبداللہ اور فرنینڈس کے درمیان طے پائیں۔
ان تمام شرائط میں بظاہر مسلمانوں کی عزت و آبرو کی حفاظت کی ضمانت نظر آرہی ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ قرآن و حدیث میں یہود و نصاریٰ کے بارے میں واضح احکامات ہیں کہ وہ کبھی بھی تمہارے خیر خواہ اور ہمدرد نہیں ہو سکتے اور تاریخ نے اس بات کو بہت جلد سچ کر دکھایا۔ کچھ عرصے میں ہی عیسائیوں نے اس معاہدے کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں اور پھر مسلمانوں پر ظلم و ستم کی وہ عبرتناک داستان شروع ہو جاتی ہے جو آج بھی اسپین اور دنیا کی تاریخ میں موجود ہے۔ سب سے پہلے تبدیلی مذہب کا حکم نامہ جاری ہوا جس کے تحت حکم دیا گیا کہ ہر مسلمان عیسائیت قبول کر لے ورنہ قتل کر دیا جائے گا۔ اس حکم کے ذریعے بے شمار مسلمان جبراً عیسائی بنا دئے گئے۔ نو مسلم خاندان بھی داخلی زیادتیوں سے محفوظ نہیں رہ سکے، ہزاروں لوگوں کو سولی پر لٹکا دیا گیا اور ہزاروں کو قیدی بنا کر جبری مشقت کے کیمپوں میں پہنچا دیا گیا جہاں موت کے بعد ان کو رہائی ملی۔

مدارس میں بچوں کو عیسائیت کی تعلیم دی جانے لگی۔ ان کے کتب خانوں میں محفوظ تاریخ کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ صرف ایک دن میں تین ہزار سے زائد مسلمانوں کو عیسائی بنایا جاتا تھا۔ کچھ عرصے بعد نہ صرف مسلمانوں کے لباس اور زبان پر پابندی لگائی گئی بلکہ انہیں اپنا نام بھی تبدیل کرنے کا حکم جاری ہو گیا۔ مساجد کو گھوڑوں اور دیگر جانوروں کے اصطبل میں تبدیل کر دیا گیا اور مسلمانوں کی عالیشان اور خوبصورت مساجد کو گرجا گھروں میں تبدیل کر دیا گیا۔ ابشاراۃ میں ابو عبداللہ اور اس کے سارے خاندان کو عبرتناک انداز میں قتل کر دیا گیا اور اس علاقے کو نہ صرف مسلمانوں کا مذبح خانہ بنا دیا گیا بلکہ مسلمانوں کو جانوروں کی طرح ذبح کرنے کا تماشہ دکھایا جاتا تھا۔

مسلمانوں کے زیر حکمرانی اندلس کئی صدیوں تک سچی تہذیب و شائستگی کا مرکز اور علوم فنون کا سرچشمہ بنا رہا، جس کی ہمسری یورپ کی کوئی قوم نہیں کر سکی۔ جو مسلمان اپنا دین بدلنے پر راضی نہیں ہوئے ان کو عیسائیوں نے دہشتگرد کا نام دیکر جلاوطن کر کے نام و نشان تک مٹا دیا۔ اس سرزمین پر خدائے بزرگ و برتر کا نام لیوا ایک بھی متنفس نہیں بچا تھا۔ آج اس سرزمین کی مسجد قرطبہ جس کو دنیا کی خوبصورت مسجد کہا جاتا ہے جسے دیکھنے ہزاروں سیاح یہاں کا رخ کرتے ہیں وہاں کسی مسلمان سیاح کو نماز تک پڑھنے کی اب تک اجازت نہیں بلکہ قانونی جرم تک قرار دے دیا گیا ہے۔ شائد اب یہ مسجد آج اذان کی آواز سے محروم پھر کسی طارق بن زیاد اور عبدالرحمٰن اوّل کا انتظار کر رہی ہے۔

وہی اندلس جہاں پہلے داخل ہونے والے مسلمان عبدالرحمان الداخل جیسی عظیم الشان شخصیت نے یورپ کے قلب میں پہلی اسلامی مملکت قائم کی۔ یورپ کو تاریکیوں سے نکال کر جدید سائنسی، سیاسی، ادبی اور فنی علوم سے روشناس کروایا اور فن تعمیرات کے حوالے سے مسلمانوں نے ایسے نمونے پیش کئے کہ جن کو دیکھ کر دنیا آج بھی دنگ ہے، اس میں مسجد قرطبہ اور قصر الحمرا کے نام قابل ذکر ہیں۔ مسلمانوں نے یہاں اپنی آمد کے فوراً بعد ہی تین لاکھ کتابوں پر مشتمل ایک مکتب غرناطہ شہر میں قائم کروایا۔ اس کے بعد اندلس نے ترقی کی ایسی منزلیں طے کیں کہ اس سرزمین کو قلب یورپ کا درجہ مل گیا۔ صلیبی قوتوں نے آٹھ صدیوں تک اندلس کے علوم و فنون اور ترقی سے پورا فائدہ اٹھایا لیکن مسلمانوں کو اپنے دشمن کی حیثیت سے یاد رکھا۔ مسلمان

امراءاور حکومتی اداروں کے بااثر عہدیداروں سے خصوصی تعلقات کی بناء پر اندلس کی حکومت میں ان کی مداخلت اس قدر بڑھ گئی کہ بادشاہ کے دربار میں خصوصی مشیر ان کی تعیناتی ان کی سفارش سے ہونے لگی۔ان مشیر ان کی بدولت امور مملکت کے تمام حساس راز فرنینڈس اور ازابیلا کے پاس باقاعدگی کے ساتھ پہنچنے لگے اور بالآخر سقوط غرناطہ کا سانحہ غدار مسلمانوں کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچا۔ مسلمانوں نے 800 سال تک شاندار حکومت کی لیکن وہ کیا اسباب تھے کہ آٹھ صدیوں تک حکومت کرنے والوں کو اس ذلت ورسوائی کا منہ دیکھنا پڑا۔تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں، آپ کو آج کے حالات سے حد درجہ مماثلت نظر آئے گی، مگر ہے کوئی اس پر فکر وتدبر سے کام لے؟

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبّر بھی کیا تُو نے
وہ کیا گردُوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

بروز اتوار 29 جمادی الاوّل 1443ھ 2 جنوری 2021ء

پیوند لگے تھے، آبرو میں

ضروری ہے کیا بات کرنا! مگر سوائے باتوں کے ہم نے اب تک کیا ہی کیا ہے! باتیں کرتے رہتے ہیں اور باتیں سنتے رہتے ہیں۔ کیا بات کریں! کیا منی بجٹ پر بات کریں کہ مالیاتی آقا کا حکم ہے کہ ان کے احکام کی تعمیل کی جائے۔ انصاف کے علم برداروں کی سفاکی پر بات کریں، پنجاب حکومت نے کابینہ میں توسیع کا عندیہ دیا ہے تو کیا وزراء کی فوج پر بات کریں، ان کی بلٹ پروف گاڑیوں پر بات کریں، شاہی دعوتوں پر بات کریں، فاقہ زدہ خاک بسر لوگوں پر بات کریں! کیا ہم جبہ و دستار پر بات کریں، جاگیرداروں کی اُن اراضی پر بات کریں، میڈیا کے چٹخاروں پر بات کریں یا حقوق انسانی کے پرچم برداروں کے نمائشی مظاہروں پر بات کریں، کتوں کے آگے ڈال دی جانے والی بچیوں پر بات کریں، کاروکاری، ونی اور سوارا پر بات کریں.....؟؟؟ کیا بات کریں بتایئے؟ سینیٹ میں تنی ہوئی گردن کے ساتھ کھڑے ہو کر یہ اعلان کر کے ہمیں خاموش کر دیا جاتا ہے کہ خبردار یہ ہماری بلوچ روایات ہیں۔ کیا ہم سب کچھ برباد ہوتا ہوا دیکھتے رہیں، کانوں اور آنکھوں کو بند کر کے بس باتیں کرتے رہیں، پریس کانفرنسیں، سیمنیار اور خالی خولی مظاہرے سجاتے رہیں... بس باتیں ہی باتیں اور کچھ نہیں۔ آخر ہم اپنے بچوں کیلئے ورثہ میں بزدلی، ناکامیوں اور مایوسیوں سے بھری تاریخی چھوڑ کر رخصت ہو جائیں؟

روتا ہوں میں چاکِ پیرہن کو نکلا تھا ہوائے تند خُو میں
انداز سے خسروی تھی ظاہر پیوند لگے تھے، آبرو میں

چھوڑیے میں پھر کہیں اور نکل جاؤں گا۔ اسے پڑھیے۔ آج ہم "فرانز کافکا" کا افسانہ "دستاویز" کی بات کر لیتے ہیں شائد اس کا کلائمیکس ہمارا مستقبل سنوار دے اور ہم اپنے ہاتھوں سے کھودے ہوئے مزید تباہی کے گڑھے میں گرنے سے محفوظ ہونے کی کوئی سبیل نکال لیں: اسے پڑھیے۔

"محسوس ہوتا ہے کہ ہماری بستی کے دفاعی انتظامات میں ابتدا سے کچھ کمزوری رہ گئی تھی جس کے باعث آج ہمیں یہ دن دیکھنا پڑا ہے ہم اپنے روزمرہ کاموں میں اتنے مشغول رہے کہ اس طرف توجہ ہی نہ دے پائے لیکن گزشتہ کئی دنوں سے جو کچھ ہو رہا ہے اُس نے ہمیں مضطرب کر دیا ہے۔ میں شہر کے چوک پر جوتے بنانے کا کام کرتا ہوں۔ ایک صبح جوں ہی میں نے اپنی دکان کا دروازہ کھولا تو دیکھا کہ چوک سے منسلک ہر سڑک پر سپاہیوں کا پہرہ ہے۔ اجنبی شکلوں والے ان سپاہیوں کا ہماری فوج سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ شمال کی وحشی نسلوں کا ہراول دستہ ہے۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ دور دراز وادیوں سے تعلق رکھنے والے لوگ ہمارے دارالخلافہ کے چوک تک کیسے آ گئے جبکہ ہمارا شہر اپنے ملک کی سرحدوں کے بہت اندر واقع ہے۔ بہر حال وحشی یہاں تک پہنچ چکے ہیں اور ہر روز ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔

وہ اپنی فطرت کے مطابق کھلے آسمان تلے قیام کرتے ہیں، سر پر چھتوں کی موجودگی سے انہیں وحشت ہوتی ہے، صبح سے شام تک وہ اپنی تلواروں کو چمکانے، نیزوں کی نوکیں تیز کرنے اور شہ سواری کی مشق میں مصروف رہتے ہیں۔ شہر کا خوبصورت اور پر سکون چوک ان کی آمد کے بعد سے اصطبل نما جگہ میں تبدیل ہو گیا ہے۔ ابتدا میں ہم لوگ موقع ملتے ہی چوک صاف کرنے کیلئے اپنی دکانوں سے نکل آتے تھے اور تندہی سے کام کرتے تھے لیکن اب ہم ایسا کرنے سے قاصر ہیں۔ ایک طرف تو وحشیوں کی تعداد زیادہ ہونے سے گندگی میں اضافہ ہمارے بس سے باہر ہو گیا ہے اور پھر یہ بھی کہ اب وہ کام کے دوران ہمیں مارتے ہیں اور بعض اوقات گھوڑوں کے سموں تلے روندنے کی کوشش کرتے ہیں۔

وحشیوں سے گفتگو ناممکن ہے، انہیں ہماری زبان کا ایک لفظ بھی سمجھ نہیں آتا، اور ان کی اپنی کوئی زبان نہیں ہے، وہ آپس میں پہاڑی کوّوں کی طرح باتیں کرتے ہیں اور ان کی دلخراش آوازوں سے ہماری سماعتیں متاثر ہو رہی ہیں انہیں ہماری اخلاقیات یا معاشرتی قدروں سے کوئی غرض نہیں ہے۔ وہ ہمارے تہذیبی اداروں پر قہقہے لگاتے ہیں، ہماری اشاروں کی زبان بھی سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، بس ہنستے رہتے ہیں شور مچاتے ہیں اور کوّوں کی طرح چیختے رہتے ہیں۔ ہم انہیں سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں یہاں تک کہ ہمارے جبڑے دُکھ جاتے ہیں اور ہم ہاتھ ہلا ہلا کر نڈھال ہو جاتے ہیں لیکن وہ کچھ نہیں سمجھتے۔ وہ کچھ سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔ اکثر وہ اپنے چہرے بگاڑ لیتے ہیں۔ کبھی کبھی ان کا منہ اتنا بگڑ جاتا ہے کہ ان کی آنکھوں کی پُتلیاں اوپر چڑھ جاتی ہیں اور نچلا سفید حصہ سامنے آجاتا ہے۔ اس موقع پر ان کے منہ سے جھاگ بھی نکلتی ہے لیکن اس حرکت سے وہ کچھ ثابت نہیں کرنا چاہتے یہ دھمکی بھی نہیں ہوتی بس اس طرح کر کے مخاطب پر خوف طاری کرنا ان کا مقصود ہوتا ہے۔

جو چیز بھی انہیں پسند آئے، لے جاتے ہیں، اس کیلئے انہیں طاقت بھی استعمال نہیں کرنی پڑتی۔ وہ اپنی مطلوبہ چیز کی طرف بڑھتے ہیں اور ہمیں ان کا راستہ چھوڑ کر اپنی رضامندی کا اظہار کرنا ہوتا ہے۔ میرے ذخیرے سے بھی انہوں نے کئی چیزیں اٹھالی ہیں لیکن جب میں دیکھتا ہوں کہ وہ قصائی کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں تو میری شکایت دم توڑ دیتی ہے۔ وہ قصائی کا سارا گوشت کھا جاتے ہیں، ان کے گھوڑے بھی گوشت خور ہیں۔ اس سے پہلے ہماری بستی میں کبھی کسی نے گوشت کھانے والا گھوڑا نہیں دیکھا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وحشی اور اس کا گھوڑا ایک ہی گوشت کے لوتھڑے کو مخالف سمتوں سے کھانا شروع کر دیتے ہیں۔ قصائی تمام دن اپنی دکان میں بیٹھا کانپتا رہتا ہے۔ وحشیوں کو روکنا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ ہم چندہ کر کے قصائی کا نقصان کسی حد تک پورا کر دیتے ہیں، اگر ہم ایسا نہ کریں تو قصائی دوسرے دن گوشت نہیں لا سکے گا اور اگر وحشیوں کو گوشت نہ ملا تو نجانے وہ کیا کریں، یوں تو وہ گوشت ملنے کے بعد بھی اپنے ظلم کی کوئی نشانی ضرور چھوڑ جاتے ہیں۔

ذبح کرنے کی زحمت سے بچنے کیلئے قصائی ایک زندہ بیل لے آیا تھا آئندہ وہ ایسا کبھی نہیں کرے گا۔ میں اپنی دکان کے تہہ خانے میں چمڑے کے ٹکڑوں میں چھپ کر لیٹ گیا تھا مگر اس کے باوجود ایک گھنٹے تک بیل کی چیخیں میرے کانوں میں گونجتی رہی تھیں۔ وحشیوں نے دائرہ وار کھڑے ہو کر زندہ بیل پر دانت گاڑ دیے تھے اور اسے ہر سمت سے ادھیڑنا شروع کر دیا تھا۔ شام کو میں ڈرتے ڈرتے باہر نکلا تو دیکھا کہ بیل کے ڈھانچے کے گرد وحشی یوں بدمست پڑے ہیں جیسے جشن کے اختتام پر مے نوش شراب کے بڑے برتن کے آس پاس لیٹے نظر آتے ہیں۔ یہی وہ موقع تھا جب میں نے بادشاہ کو محل کی کھڑکی سے جھانکتے دیکھا تھا۔ عام طور پر وہ محل کے اندرونی کمروں تک محدود رہتا تھا لیکن اُس دن وہ بیرونی راہداری کے جھروکے سے سر لگا کر جھانک رہا تھا۔ چوک پر ہونے والے واقعات کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اب کیا ہو گا؟ ہم سب کے ذہنوں میں یہی سوال گونجتا ہے بادشاہ کے محل کی کشش وحشیوں کو یہاں تک کھینچ لائی ہے اور ہم میں سے کوئی بھی انہیں واپس دھکیلنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ محل کے آہنی دروازے بند رہتے ہیں، وحشیوں کی آمد سے قبل جو شاہی دربان ان دروازوں کے باہر کھڑے پہرہ دیتے تھے، اب وہ سلاخوں کے اندر ٹہلتے نظر آتے ہیں۔ ہم کب تک وحشیوں کا عذاب سہیں گے؟ بس افسانے کا ایک حصہ تمام ہوا،

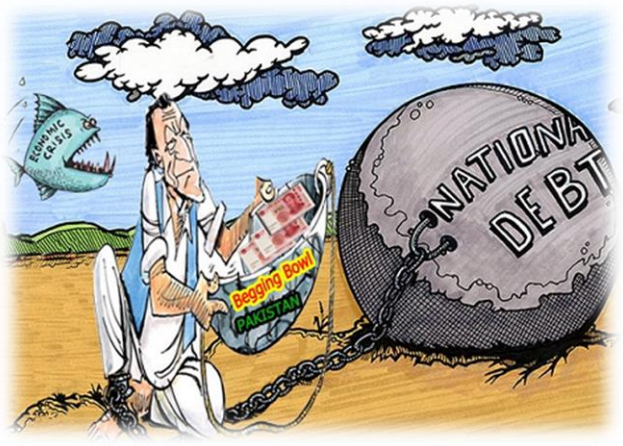

اس افسانے کی روشنی میں حقیقت کی دنیا میں آپ کو لیکر چلتا ہوں:

نئے پاکستان اور مدینہ ریاست بنانے والے اب تک ملک کی تقدیر بدلنے کیلئے کئی وزیر خزانہ اور درجنوں سیکرٹری آزما کر تبدیل کر چکے لیکن ابھی تک کامیابی کو چھو نا تو کجا، دن بدن گراف تیزی سے روبہ زوال ہوتا چلا گیا جس کا نتیجہ اپنے ہی مضبوط صوبے میں بلدیاتی انتخابات کے نتائج کے بعد ساری جماعت کے اکابرین کو تبدیل کر دیا گیا، اور جماعت کے تمام رہنمائوں نے بیک زبان اپنی شکست فاش کو موجودہ مہنگائی کے پیچھے چھپنے میں عافیت جانی۔ اقتدار سنبھالنے سے قبل قوم کو جو خواب دکھائے گئے، اب وہی گلے کی ہڈی بن کر کچوکے لگا رہے ہیں۔ دو ماہ قبل عالمی مالیاتی اداروں کی منت سماجت کیلئے پوری ٹیم امریکا روانہ کی جہاں شرفِ ملاقات کیلئے کڑی شرائط کی تکمیل تھا لیکن اس کے باوجود جب بات نہ بن سکی تو مدینہ ریاست کے ولی عہد سے چار فیصد سود پر تین ارب ڈالر اس شرط پر مستعار لئے گئے کہ یہ رقم کہیں بھی خرچ کرنے کی اجازت نہیں ہو گی بلکہ ملکی خزانہ میں دیوالیہ سے بچنے کیلئے رکھی جائے گی کیونکہ بڑے حسین دعووں کے ساتھ ملکی خزانے کی بیمار حالت کو ٹھیک کرنے کیلئے ایف بی آر کی سربراہی سید شبر زیدی کے حوالے کی گئی تھی جو چند ماہ بعد ہی اس بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ کر چلے گئے اور اب پچھلے دنوں ببانگ دہل انہوں نے پاکستانی عوام کو بتایا ہے کہ پاکستان عملاً دیوالیہ ہو چکا ہے بس اس کا اعلان باقی ہے۔ دیوالیہ ہونے کے بعد کے خوفناک مناظر کا نقشہ کھینچتے ہوئے جس تباہی کا ذکر کیا اب اس کے اثرات واضح ہونے شروع ہو گئے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ افسانے میں جن وحشیوں کا زندہ بیل کے جسم میں دانت گاڑ کر خون پینے کا نقشہ کھینچا گیا ہے، اس پر عملدرآمد جاری ہو گیا ہے۔

آپ نے اقتدار سنبھالنے سے قبل قوم کو یقین دلایا تھا کہ وہ عالمی مالیاتی اداروں کے پاس ہرگز نہیں جائیں گے لیکن اب خود اعلان کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ حکومت کی جانب سے منی بجٹ کا پیش کرنا آئی ایم ایف کے مطالبات کا ایک حصہ ہے جنہیں پورا کر کے ایک ارب ڈالر کی قسط وصول ہو گی۔ آئی ایم ایف کے ساتھ پروگرام کی اگلی قسط کیلئے پاکستان کا کچھ پیشگی اقدامات اٹھانا لازمی ہے جن میں ایک سٹیٹ بینک آف پاکستان کا خود مختاری کا بل بھی ہے اور اس کے ساتھ 400/ارب روپے اضافی ٹیکس اکٹھا کرنا ہے۔ ایف بی آر کے سربراہ کے مطابق حکومت نے وفاقی بجٹ میں 5800 ارب روپے کا ٹیکس اکٹھا کرنے کا ٹارگٹ رکھا تھا تاہم آئی ایم ایف نے پاکستان سے مطالبہ کیا ہے اس سال ملک میں ٹیکس آمدنی 6200/ارب روپے ہو۔ اب 400/ارب اضافی منی بجٹ میں سیلز ٹیکس کی چھوٹ ختم کر کے اور اس کی شرح میں اضافہ کر کے اکٹھا کیا جائے گا۔ اسی طرح 400/ارب اضافی اکٹھا کرنے کیلئے پٹرولیم ڈویلپمنٹ لیوی میں بھی فوری اضافہ کیا جا رہا ہے۔ خود ایف بی آر کے سربراہ نے اعتراف کیا ہے کہ اگرچہ حکومت آئی ایم ایف کے مطالبے پر مالیاتی خسارہ دور کرنے کیلئے یہ اقدامات کر رہی ہے تاہم اس سے ملک کا بڑھتا ہوا مالیاتی خسارہ ختم ہوتا مشکل نظر آ رہا ہے۔ اگر آپ کی غلط پالیسیوں کی بناء پر یہ خسارہ ختم نہیں ہو گا تو یقیناً آئی ایم ایف کا دباؤ آپ کی خود مختاری سلب کرنے کیلئے ایٹمی نیوکلیر سے دستبرداری کا سفر کیسے روک سکیں گے جو بہر حال ایک عرصے سے امریکا و مغرب کا ٹارگٹ ہے۔

یہی وجہ ہے ملک میں ایک مرتبہ پھر عالمی سود خوداداروں کے حکم پر منی بجٹ لانے کے ساتھ ساتھ کڑی شرائط کے بل بھی پاس کروالئے گئے ہیں اور جس عجلت سے اسمبلی کے اسپیکر ان تمام بلوں کو منظور کروا رہے تھے اس سے یوں معلوم ہو رہا تھا کہ ملک کے مستقبل کو بے رحمی سے نہ صرف ذبح کیا جا رہا ہے بلکہ ہوشربا نئے ٹیکسز کی منظوری کے بعد عوام کی تکا بوٹی کر کے سود خور مہاجنوں کی سیر شکمی کیلئے پیش کر دی گئی ہیں۔ 150 آئٹموں پر براہ راست ٹیکس عائد کر کے نو منتخب سینیٹر اور وزیر خزانہ شوکت ترین کا عجیب بے نیاز مندانہ بیان کہ چند سو ارب ٹیکسز بڑھا دینے سے قوم کو کوئی فرق نہیں پڑتا

اور عجیب ڈھٹائی کا عالم تو یہ ہے کہ دعویٰ کیا جارہا ہے کہ پاکستان میں اب بھی دوسرے ملکوں کی نسبت مہنگائی بہت کم ہے۔

صنعت کار ہر ملک کی ریڑھ کی ہڈی تسلیم کئے جاتے ہیں، اس منی بجٹ پر وہ بھی چیخ اٹھے ہیں۔ کاروباری طبقے کے مطابق خام مال پر سیلز ٹیکس کی چھوٹ ختم کرنے اور اس کی شرح 17 فیصد کرنے سے معیشت اور پیداواری عمل پر تباہ کن منفی اثرات مرتب ہوں گے اور خام مال کے مہنگا ہونے سے پیداواری عمل سست روی کا شکار ہو جائے گا۔ یاد رکھیں کہ خام مال کے مہنگا ہونے سے جب مصنوعات مہنگی ہوتی ہیں تو یہ سمگلنگ میں اضافے کا باعث بنتی ہیں۔ ملک میں خوردنی تیل کی زیادہ قیمت کی وجہ سے ایران سے سمگل شدہ خوردنی تیل اب زیادہ مارکیٹ میں آرہا ہے جس کا اثر خوردنی تیل کی صنعت پر پڑ رہا ہے۔ پھر یہ صورتحال روزگار کے مواقع کو کم کرنے کا باعث بنے گی۔ آپ نے تو قوم کو ایک کروڑ نوکریاں دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن یہاں تو معاملہ الٹا ہو گیا۔

اس سلسلے میں کہا کہ خام مال پر سیلز ٹیکس صنعتی شعبے کی کاروباری لاگت کو بڑھائے گا اور اس کے دو نتیجے نکل سکتے ہیں، ایک تو زیادہ لاگت کی وجہ سے مصنوعات کی قیمتیں بڑھیں گی جو غریب آدمی کو متاثر کریں گی دوسرا پیداواری عمل میں کمی آئے گی اور اس کی وجہ سے کم پیداوار ہو گی تو کم ملازمتوں کے مواقع پیدا ہوں گے اور موجودہ صنعت کار پہلے سے موجودہ ملازمین میں چھانٹی کر کے اپنے خسارہ کو کم کرنے کی کوشش کریں گے، اس طرح دونوں صورتوں میں اس کا اثر غریب آدمی پر پڑے گا۔

ان حالات میں یوں لگتا ہے بستی کے دفاع کا فریضہ عالمی کاریگروں اور ہنر مندوں کو سونپ دیا گیا ہے اور ہم نے اپنی غلط پالیسیوں کی بناء پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہم یہ فرض انجام دینے کے قابل نہیں ہیں۔ پچھلے تین سالوں سے مسلسل دہائی دے رہا ہوں کہ ایف اے ٹی اے ایف کے ذریعے مشکیں کس کر آپ کو معاشی طور پر دیوالیہ کیا جائے گا اور اس کے بعد جس طرح ساہوکار قرض نہ ملنے کی صورت میں گھر کے سارے مال کی قرقی کا سمن لیکر دروازے پر پہنچ جاتا ہے اور حکم دیا جاتا ہے کہ کسی چیز کو ہاتھ لگائے بغیر گھر کو خالی کر کے نکل جائیں۔ اب یہ فیصلہ کون کرے گا کہ ہم سب کس کی غلطی سے برباد ہو رہے ہیں؟؟

ہر سفر کے بعد ویسا ہی سفر رکھا گیا
اور پھر مقسوم میرا در بدر رکھا گیا
ہم کہاں سینے کی تہہ میں یہ سمندر تھامتے
ایک اِس خاطر تجھے، اے چشم تر رکھا گیا

بروز سوموار 30 جمادی الاوّل 1443ھ 3 جنوری 2021ء

سقوطِ غرناطہ اور پاکستان

غرناطہ سپین کے جنوب میں ایک تاریخی شہر کا نام ہے اور اس کی وجہ شہرت مسلمانوں کا الحمراء محل ہے۔ 1492ء تک غرناطہ آخری اسلامی ریاست کا مرکز تھا آج سے ٹھیک 553 سال قبل۔ 892ھ بمطابق 1492ء میں ہسپانیہ میں مسلم اقتدار کا ہمیشہ کیلئے خاتمہ ہو گیا اور ان کی آخری ریاست غرناطہ بھی مسیحیوں کے قبضے میں چلی گئی۔ اس واقعے کو سقوط غرناطہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہسپانیہ میں آخری مسلم ریاست غرناطہ کے حکمران ابو عبداللہ نے تاج قشتالہ اور تاج آراغون کے مسیحی حکمران ملکہ آئیزابیلا اور شاہ فرڈیننڈ کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور اس طرح ہسپانیہ میں صدیوں پر محیط مسلم اقتدار کا ہمیشہ کیلئے خاتمہ ہو گیا۔ 18 شرائط پر مبنی معاہدے کے تحت مسلمانوں کو مکمل مذہبی آزادی کی یقین دہانی کرائی گئی لیکن مسیحی حکمران زیادہ عرصے اپنے وعدے پر قائم نہ رہے اور یہودیوں اور مسلمانوں کو ہسپانیہ سے بے دخل کر دیا گیا۔ مسلمانوں کو جبراً مسیحی بنایا گیا جنہوں نے اس سے انکار کیا انہیں جلاوطن کر دیا گیا۔

ان تمام شرائط میں بظاہر مسلمانوں کی عزت و آبرو کی حفاظت کی ضمانت نظر آ رہی ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ قرآن و حدیث میں یہود و نصاریٰ کے بارے میں واضح احکامات ہیں کہ وہ کبھی بھی تمہارے خیر خواہ اور ہمدرد نہیں ہو سکتے اور تاریخ نے اس بات کو بہت جلد سچ کر دکھایا۔ کچھ عرصے میں ہی عیسائیوں نے اس معاہدے کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں اور پھر مسلمانوں پر ظلم و ستم کی وہ عبرتناک داستان شروع ہو جاتی ہے جو آج بھی اسپین اور دنیا کی تاریخ میں موجود ہے۔ سب سے پہلے تبدیلی مذہب کا حکم نامہ جاری ہوا جس کے تحت حکم دیا گیا کہ ہر مسلمان عیسائیت قبول کر لے ورنہ قتل کر دیا جائے گا۔ اس حکم کے ذریعے بے شمار مسلمان جبراً عیسائی بنا دئے گئے۔ ہزاروں لوگوں کو سولی پر لٹکا دیا گیا اور ہزاروں کو قیدی بنا کر جبری مشقت کے کیمپوں میں پہنچا دیا گیا جہاں موت کے بعد ان کو رہائی ملی۔

مدارس میں بچوں کو عیسائیت کی تعلیم دی جانے لگی۔ ان کے کتب خانوں میں محفوظ تاریخ کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ صرف ایک دن میں تین ہزار سے زائد مسلمانوں کو عیسائی بنایا جاتا تھا۔ کچھ عرصے بعد نہ صرف مسلمانوں کے لباس اور زبان پر پابندی لگائی گئی بلکہ انہیں اپنا نام بھی تبدیل کرنے کا حکم جاری ہو گیا مساجد کو گھوڑوں اور دیگر جانوروں کے اصطبل میں تبدیل کر دیا گیا اور مسلمانوں کی عالیشان اور خوبصورت مساجد کو گرجا گھروں میں تبدیل کر دیا گیا۔ ابشاراۃ میں ابو عبداللہ اور اس کے سارے خاندان کو عبرتناک انداز میں قتل کر دیا گیا اور اس علاقے کو نہ صرف مسلمانوں کا مذبح خانہ بنا دیا گیا بلکہ مسلمانوں کو جانوروں کی طرح ذبح کرنے کا تماشہ دکھایا جاتا تھا۔

مسلم ہسپانیہ (اندلس) کے آخری حکمراں ابو عبداللہ بن مولائے ابوالحسن جب وہ غرناطہ کی چابیاں مسیحی حکمرانوں کے حوالے کر کے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے غرناطہ سے جلاوطن ہو رہا تھا۔ اس نے جب آخری نگاہ اپنے آباؤاجداد کے ورثے پر ڈالی تو اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں، تو اس وقت اپنے بیٹے کی آہ وزاری پر اس کی ماں نے یہ تاریخ ساز الفاظ کہے: جس چیز کی حفاظت تم مردوں کی طرح نہیں کر سکے، اس کے چھن جانے پر عورتوں کی طرح آنسو بہانے سے کیا فائدہ۔

اس مقام پر جہاں ابو عبداللہ کی آہ نکلی مسیحیوں نے مسلمانوں کی شکست کی علامت کے طور پر محفوظ کر لیا اور آج اسے مور کی آخری آہ کے نام سے جانا جاتا

ہے۔یورپی تاریخ داں اندلس کے مسلمانوں کے لیے "مور" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ابو عبداللہ، اندلس کی آخری مسلم ریاست مملکت غرناطہ کا وہ بد بخت حکمران تھا جس نے عین اس وقت اپنے والد ابوالحسن اور چچا محمد بن سعد الزاغل کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا جب وہ اندلس میں مسیحیوں کے مشترکہ لشکر سے اندلس میں مسلمانوں کی بقا کی آخری لڑائی لڑ رہے تھے۔

1469ء کے اندلس کے سیاسی منظر نامے پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے اس داستان کے آخری باب کی طرف چلتے ہیں جس کا آغاز تقریباً آٹھ سو سال قبل جبل طارق یا جبر الٹر کے ساحل پر طارق بن زیاد نے مسیحی گاتھ شہنشاہ راڈرک کو عبرتناک شکست دے کر کیا تھا۔ موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد نے جلد ہی ہسپانیہ سے مسیحیوں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور اسی طرح ہسپانیہ، دمشق کی خلافت کے زیر نگیں آ گیا۔ دمشق کے انقلاب کے بعد اسلامی خلافت بغداد منتقل ہو گئی اور اندلس کی حکمرانی اموی شہزادے عبدالرحمن الداخل کو مل گئی۔ وقت گزرتا گیا اور اندلس کی حکومتیں بدلتی رہیں اور مسلمان اندلس میں مضبوط اور مستحکم ہوتے چلے گئے۔ آہستہ آہستہ اندلس عالم سلام کا علم و ہنر کا مرکز بن گیا۔ دور عروج میں اندلس نے ابنِ بیطار، ابنِ رشد، ابنِ باجا، الفارابی، ابن حزم، اسحق موصلی اور الخطیب جیسے ہزاروں علما اور فضلاء پیدا کیے۔ پھر وقت نے پلٹا کھایا اور اندلس کے مسلمانوں کا زوال شروع ہو گیا، پھر قدرت نے یوسف بن تاشفین کی صورت میں اندلس کے مسلمانوں کو سنبھلنے کا بہترین موقع فراہم کیا مگر ان کے نصیب میں زوال لکھ دیا گیا تھا۔ الداخل کی عظیم سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہونا شروع ہو گئی۔ سرقسطہ، قشطالیہ، الشبیلہ اور قرطبہ جیسے عظیم علم و ہنر کے مراکز مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلنے شروع ہو گئے۔ آراغون اور قشتالہ کی مضبوط مسیحی مملکتیں وجود میں آ گئیں۔ تاریخ میں آراغون کی حکمران ازابیلا نامی ملکہ کا بڑا خوفناک کردار بھی سامنے آیا ہے۔ یہ وہی ملکہ ہے جس کی تحریک پر کولمبس نے اپنی بحری مہم شروع کی تھی۔ دوسری طرف قسطلہ کا شاہ فرنڈیڈس نامی متعصب عیسائی تھا۔ یہ دونوں حکمراں شدت پسند اور مسلمان دشمن تھے اور اندلس سے مکمل طور پر مسلمانوں کا خاتمہ چاہتے تھے، اسی مشترکہ مفاد کے تحت ان دونوں حکمرانوں 1469ء میں آراغون اور قسطلہ کی ریاستوں کو باہم مدغم کر لیا اور آپس میں شادی کر لی۔

1469ء تک اندلس کے مسلمان غرناطہ کی ریاست تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ سارا اندلس ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا، مسلمان اندلس بھر سے سمٹ کر غرناطہ میں اپنی بقاء کی لڑائی میں مصروف تھے۔ غرناطہ کا موجودہ حکمران ایک نڈر اور قابل شخص مولائے ابوالحسن تھا۔ اہل اندلس کو طویل عرصے بعد ایک لائق حکمران نصیب ہوا تھا۔ اہل اندلس اسے اپنا نجات دہندہ تعبیر کر رہے تھے۔ سلطان ابوالحسن سے مسلمانوں کی توقعات کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سلطان کا بھائی محمد بن سعد الزاغل (جو الزاغل کے نام سے مشہور ہے) مالقہ کے علاقے کا حکمران تھا اور جب اس نے یہ محسوس کیا کہ مسیحی ان دونوں بھائیوں میں پھوٹ ڈلوانا چاہتے ہیں تو الزاغل فوراً غرناطہ پہنچا اور اس نے مالقہ کے تخت سے دست بردار ہوتے ہوئے ابوالحسن کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اسی طرح ابوالحسن طاقتور ہو گیا اور جب فرنڈیڈس نے ابوالحسن سے خراج طلب کیا تو اس نے تاریخی جواب دیا: غرناطہ کے ٹکسال میں مسیحیوں کو دینے کیلئے سکّوں کی بجائے اب فولاد کی وہ تلواریں تیار ہوتی ہیں جو ان کی گردنیں اتار سکیں۔ یہ جواب سن کر فرنڈیڈ اور ازابیلا مبہوت رہ گئے۔ اس وقت قشتالہ اور آراغون کی باہمی ریاست کا رقبہ سوا لاکھ مربع میل کے لگ بھگ تھا جبکہ غرناطہ کی ریاست سمٹ سمٹا کر صرف چار ہزار مربع میل رہ گئی تھی۔ یہ مختصر رقبہ بھی مسیحیوں کی نگاہ میں کھٹک رہا تھا۔ وہ اندلس سے مسلمانوں کا مکمل خاتمہ چاہتے تھے۔ انہوں نے ابوالحسن سے فیصلہ کن جنگ کا ارادہ کیا اور خاموشی سے جنگی تیاریاں تیز کر دیں۔ ابوالحسن بھی غافل نہیں تھا۔ آخر کار غرناطہ کے سرحدی مقام لوشہ میں سلطان ابوالحسن اور فرنڈیڈ کا ٹکراؤ ہو گیا، اہل غرناطہ قوت اور عدد دونوں اعتبار سے مسیحیوں کی مشترکہ افواج کے مقابلے پر کمزور تھے مگر ان کو علم تھا کہ ان کے پاس اندلس آخری خطہ اراضی رہ

گیا ہے۔اس کے دفاع کیلئے اہل غرناطہ نے سر دھڑ کی بازی لگادی۔آخر کار لوشہ کے میدان میں طارق بن زیاد کی یاد تازہ کرتے ہوئے ابوالحسن نے فرنیڈنڈ کو شکست فاش سے دوچار کیا۔

ابھی ابوالحسن لوشہ کے میدان میں ہی تھا کہ غرناطہ میں اس کے ولی عہد ابوعبداللہ نے بغاوت کر دی اور غرناطہ کے تخت کا مالک بن بیٹھا۔مسیحیوں سے جہاد میں مشغول مسلمانوں کیلئے یہ خطرناک اطلاع تھی۔لوشہ کی فتح کے بعد وہ ابوالحسن کی سربراہی میں اندلس میں مسلمانوں کی نشاط ثانیہ کا خواب دیکھ رہے تھے۔ابوعبداللہ کی بغاوت نے ان کے ہوش اڑا دیئے اور سلطان ابوالحسن کو مجبوراً لوشہ چھوڑ کر مالقہ میں پناہ لینی پڑی۔یعنی اس نازک دور میں جب اہل اندلس اپنے بقاء کی جنگ میں مصروف تھے،ابوعبداللہ کی اقتدار کی ہوس نے غرناطہ کی سلطنت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔بجائے باپ کے ہاتھ مضبوط کرنے کے ابوعبداللہ اس کی سلطنت کے درپے ہو گیا۔دوسری طرف مسلمانوں کو منقسم دیکھ کر شکست خوردہ فرنڈیڈ کو حوصلہ مل گیا اور اس نے مالقہ پر حملہ کر دیا۔مالقہ میں ابوالحسن اور فرنڈیڈ کو برسرپیکار دیکھ کر ابوعبداللہ نے بے غیرتی کی انتہا کرتے ہوئے ابوالحسن پر پشت سے حملہ کر دیا۔ابوالحسن تجربہ کار سپہ سالار تھا،اس نے ایک طرف تو مسیحیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا دوسری طرف ابوعبداللہ کو واپس غرناطہ جانے پر مجبور کر دیا۔سی دوران ابو ابوعبداللہ اور فرنڈیڈ کا لوشینیہ کے مقام پر آمنا سامنا ہو گیا۔ناتجربہ کار ابوعبداللہ نے شکست کھائی اور گرفتار ہو گیا،ابوعبداللہ کے فرنڈیڈ کی قید میں جانے کے بعد غرناطہ کا تخت خالی ہو گیا،بیٹے کی بغاوت نے ابوالحسن کو بیمار کر دیا تھا،اس پر زبردست فالج کا حملہ ہو گیا تھا،اس نے ریاست سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے اپنے بھائی الزاغل کو غرناطہ کا تخت سنبھالنے اور فرنیڈنڈ کا مقابلہ کرنے کا حکم دیا۔الزاغل غرناطہ پہنچا اور اس نے مسلم افواج کی از سرِ نو تنظیم شروع کر دی۔

الزاغل بلاشبہ ابوالحسن کا حقیقی جانشین تھا اور ممکن تھا کہ اپنی دلیری اور صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے وہ اندلس کے مسلمانوں کا نجات دہندہ بن جاتا مگر اس موقع پر ابوعبداللہ کا ایک دفعہ پھر مکروہ کردار سامنے آتا ہے۔دوران قید فرنیڈنڈ نے ابوعبداللہ کی خصلت پہچان لی۔وہ سمجھ گیا کہ ابوعبداللہ کو مسلمانوں سے زیادہ اپنے اقتدار کی خواہش ہے۔اب فرنیڈنڈ نے ابوعبداللہ کو الزاغل اور ابوالحسن کے خلاف استعمال کرنے کا منصوبہ بنایا۔اس نے ابوعبداللہ کو یقین دلایا کہ وہ اسے غرناطہ کا وارث تسلیم کرتا ہے اور یہ کہ فرنیڈنڈ غرناطہ کا تخت حاصل کرنے میں ابوعبداللہ کی مدد کرے گا۔

ابوعبداللہ سے ساز باز کرنے کے بعد فرنڈیڈ نے اسے اپنی قید سے رخصت کر دیا۔ابوعبداللہ سیدھا مالقہ پہنچا جہاں الزاغل کا قبضہ تھا اہل مالقہ کو یقین دہانی کرائی کہ فرنڈیڈ اس کے ساتھ ہے اور اگر اہل مالقہ،ابوعبداللہ کا ساتھ دیں تو وہ ان کی مسیحیوں سے صلح کروا سکتا ہے۔جنگ وجدل سے گھبرائے ہوئے مسلمان اس کی باتوں میں آگئے اور انہوں نے مالقہ پر ابوعبداللہ کی بالادستی تسلیم کر لی۔اب ابوعبداللہ نے الزاغل کو پیغام بھیجا کہ اگر وہ لوشہ کا قلعہ اس کے حوالے کر دے تو ان دونوں کی صلح ہو سکتی ہے۔اس طرح مسیحیوں کی مشترکہ افواج کا مقابلہ دونوں مل کر کریں گے۔لوشہ کا قلعہ دراصل غرناطہ کا دفاعی مورچہ تھا،فرنڈیڈ کئی سالوں سے لوشہ پر قبضہ کرنے کے چکر میں تھا اس طرح اُس کا راستہ غرناطہ تک آسان ہو جاتا مگر اہل لوشہ نے اپنے علاقے کا دفاع بڑی بے جگری سے کیا ہوا تھا۔لوشہ کی دفاعی اہمیت کے باوجود مسلمانوں میں اتحاد کے خواہش مند الزاغل نے ابوعبداللہ کا کہا مان لیا اور لوشہ کا قلعہ اس

کے حوالے کر دیا۔ لوشہ پر قبضہ فرنڈیڈ کے منصوبے کا حصہ تھا۔ اب ابو عبداللہ مالقہ اور لوشہ دونوں پر قابض تھا۔ اس نے فوراً فرنیڈنڈ کو لوشہ آنے کی دعوت دے ڈالی۔ مسلمان حیران و پریشان ہو گئے کہ جس لوشہ کی حفاظت کیلئے انہوں نے سالوں سے سر دھڑ کی بازی لگائی ہوئی ہے وہ بغیر کسی خون خرابے کے فرنڈیڈ کو مل گیا۔

ادھر مالقہ میں جب مسلمانوں نے یہ صورت حال دیکھی تو انہوں نے ابو عبداللہ کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس پر فرنڈیڈ نے مالقہ کا محاصرہ کر لیا۔ اہل مالقہ کی مدد کیلئے الزاغل غرناطہ سے روانہ ہو گیا۔ غرناطہ خالی دیکھ کر ابو عبداللہ کو سنہری موقع مل گیا، وہ فوراً غرناطہ پہنچ گیا اور تخت غرناطہ پر قبضہ کر لیا۔ یہاں سے المناک داستان کا وہ باب شروع ہوتا ہے جس کا انجام مسلمانانِ اندلس کی مکمل بربادی پر ختم ہوا۔ وہ لوگ جو آٹھ سو سال قبل اندلس میں روشنی کا پیغام لے کر آئے تھے اور روشنی کی مانند پورے اندلس میں پھیل گئے تھے وہ راستہ بھول گئے۔ افراد راستہ بھول جائیں تو گھرانے تباہ ہو جاتے ہیں مگر جب قومیں راستہ فراموش کر دیں تو سلطنتیں برباد ہو جاتی ہیں۔ اندلس کے مسلمانوں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ غرناطہ پر ابو عبداللہ کا قبضہ بھی مسلمانان اندلس کیلئے بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ یہ منظر نامہ دیکھتے ہوئے مالقہ والوں نے فرنیڈنڈ سے صلح کر لی۔ اس طرح لوشہ اور مالقہ پر فرنڈیڈ کا قبضہ مکمل ہو گیا۔

ابو عبداللہ کو بیٹا کہنے اور مسلمانوں کی خیر خواہی کا دم بھرنے والا فرنڈیڈ اب اپنے اصل روپ میں آ گیا۔ اس نے ابو عبداللہ کو پیغام بھجوایا کہ اب غرناطہ کی چابیاں مسیحیوں کے حوالے کر دی جائیں۔ یہ پیغام ملتے ہی ابو عبداللہ کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ اپنوں سے غداری کرنے کا انجام اسے نظر آنے لگا۔ اس نے اہل غرناطہ سے مشورہ کیا اہل غرناطہ موسیٰ اور طارق کے فرزند تھے۔ انہوں نے آخری دم تک جنگ لڑنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اہل غرناطہ اور فرنڈیڈ میں سخت لڑائی لڑی گئی۔ مسلمانوں کو علم تھا کہ اندلس میں اب غرناطہ ہی ان کی آخری امید ہے لہٰذا وہ جم کر لڑے اور انہوں نے مسیحیوں کو شکست سے دوچار کر دیا غرناطہ کے مضافات کے علاقے دوبارہ مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے۔ ان میں البشرات نامی پہاڑی علاقہ بھی شامل تھا۔
قدرت قوموں کو سنبھلنے کیلئے کئی مواقع دیتی ہے۔ یوسف بن تاشفین کی آمد سے لے کر ابو الحسن کی تخت نشینی تک اہل اندلس کو سنبھلنے کے کئی مواقع ملے مگر اقتدار کی خواہش اور ہوس میں اپنوں سے غداری نے اہل اندلس کو برباد کر کے چھوڑا۔ اس نازک موقع پر جب مسیحی اندلس میں مسلمانوں کو آخری پناہ گاہ کے سامنے مورچہ زن تھے اس وقت بھی اہل اندلس کی آپس کی نااتفاقی ختم نہ ہوئی۔ اہل غرناطہ کی ابو عبداللہ کی سربراہی میں مسیحیوں کے خلاف کامیابیاں اس کے چچا الزاغل کو ایک آنکھ نہ بھائی، وہی محمد بن سعد الزاغل جو کچھ عرصہ قبل مسلمانوں کے اتحاد کی خاطر اپنے بھائی سلطان ابو الحسن کے حق میں اپنی سلطنت سے دستبردار ہو چکا تھا، اس دفعہ اس نے شرمناک حرکت کی۔ الزاغل نے اہل غرناطہ کے خلاف فرنڈیڈ کے حق میں اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے فرنڈیڈ کو ابو عبداللہ پر حملہ کرنے پر اکسایا۔ فرنیڈنڈ نے یہ سنہری موقع جانے نہ دیا اور ایک دفعہ پھر مسلمانوں کو آپس میں لڑوا دیا۔ اب الزاغل نے فرنیڈنڈ کی مدد کے ساتھ ابو عبداللہ پر حملے کرنے شروع کیے، غرناطہ کے مضافات کے تمام قلعے ایک ایک کر کے مسیحیوں کے قبضہ میں دوبارہ چلے گئے اور آخر کار اہل غرناطہ محصور ہو کر رہ گئے۔ غرناطہ کے تخت کا خواہش مند الزاغل کو فرنڈیڈ نے اس کی خدمات کا صلہ دیتے ہوئے اسے ہسپانیہ سے نکل جانے کا حکم دیا۔ الزاغل، فرنڈیڈ کا منہ دیکھتا رہ گیا اور آخر کار مراکش میں جلاوطن کر دیا گیا اور وہیں گمنامی کی موت مر گیا۔ غداروں کا انجام یہی ہوتا ہے۔

اب فرنڈیڈ اور ازابیلا نے فیصلہ کن معرکہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ 1492ء کا سال آ گیا اور اسی سال موسم گرما میں مسیحیوں کی مشترکہ افواج نے غرناطہ کا محاصرہ کر لیا۔ غرناطہ کے شمال میں پہاڑی سلسلہ تھے اور محاصرے کے دوران اہل غرناطہ کو مدد ملتی رہی مگر سردیاں شروع ہوتے ہی پہاڑوں

پر برف باری شروع ہوگئی اور غرناطہ کو کمک ملنا بند ہوگئی۔ شہر میں اشیاء خورد نوش کی قلت ہوگئی۔

اہل غرناطہ اب بھی مسیحیوں پر فیصلہ کن حملہ کرنے پر آمادہ تھے۔ غرناطہ کا سپہ سالار "موسیٰ بن ابی غسان" افسانوی شہرت کا حامل کردار تھا۔ وہ آخری سپاہی تک لڑنا چاہتا تھا مگر ابو عبداللہ ذہنی طور پر شکست قبول کر چکا تھا۔ وہ اور اس کے اکثر امرا فرنڈیڈ سے صلح کا معاہدہ کرنا چاہتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ اسی طرح وہ اپنے لیے زیادہ سے زیادہ مراعات حصل کر سکیں گے۔ امرِ اسلطنت سازش میں مصروف ہوگئے۔ پس پردہ مسیحیوں سے رابطے قائم کرنے لگے ان سازشی عناصر کا سرغنہ وزیر اعظم غرناطہ "ابوالقاسم" تھا۔ فرنڈیڈ نے غرناطہ پر قبضے کی صورت میں اس کو غرناطہ کا اہم عہدہ دینے کا وعدہ کر لیا۔ ابو عبداللہ کی ذہنی شکست میں ابوالقاسم کا مرکزی کردار تھا۔ بلآخر ابو عبداللہ نے ابوالقاسم کو خفیہ سفارتکاری کی اجازت دے دی۔ صلح کی شرائط طے کر لی گئیں۔ بظاہر ان شرائط میں مسلمانوں کیلئے ہر قسم کا تحفظ یقینی بتایا گیا تھا مگر بعد میں مسیحیوں نے اس پر کتنا عمل کیا وہ ایک علیحدہ باب ہے۔

معاہدے کے تحت ابو عبداللہ کو البشرات کے علاقے میں ایک جاگیر دے دی گئی۔ آخر کار وہ تاریخی دن آگیا جسے آج تک تاریخ اسلام کا ہر طالب علم سیاہ دن سے تعبیر کرتا ہے۔ 2 جنوری 1492ء کو غرناطہ کی چابیاں ابو عبداللہ نے اپنے ہاتھوں سے فرنڈیڈ اور ازابیلا کو پیش کر دیں۔ پادری اعظم نے قصر الحمراء پر لہراتا صدیوں پرانا پرچم اسلامی اتار کر صلیب کو نصب کر دیا اور اس طرح سقوط غرناطہ کے ساتھ ساتھ اندلس میں مسلمانوں کا آٹھ سو سالہ حکمرانی کا سورج بھی غروب ہوگیا۔ سو سال کے اندر اندر مسیحیوں کے ظلم و ستم کے باعث لاکھوں مسلمان ہجرت کر کے مراکش اور شمالی افریقا میں آباد ہوگئے ان کے قبائل آج بھی وہاں مہاجر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ لاکھوں مسلمانوں کا قتل عام ہوا اور بیشمار اہل ایمان مسیحی ظلم و ستم کی تاب نہ لا کر مسیحی بن گئے۔ یوں ایک غدار اور بزدل حکمران ابو عبداللہ کی شامت اعمال کا نتیجہ اہل اندلس کو دیکھنا پڑا۔

مسلمانوں کے زیر حکمرانی اندلس کئی صدیوں تک سچی تہذیب و شائستگی کا مرکز اور علوم فنون کا سرچشمہ بنا رہا، جس کی ہمسری یورپ کی کوئی قوم نہیں کر سکی۔ جو مسلمان اپنا دین بدلنے پر راضی نہیں ہوئے ان کو عیسائیوں نے دہشتگرد کا نام دیکر جلاوطن کر کے نام و نشان تک مٹا دیا۔ اس سرزمین پر خدائے بزرگ و برتر کا نام لیوا ایک بھی متنفس نہیں بچا تھا۔ آج اس سرزمین کی مسجد قرطبہ جس کو دنیا کی خوبصورت مسجد کہا جاتا ہے جسے دیکھنے ہزاروں سیاح یہاں کا رخ کرتے ہیں وہاں کسی مسلمان سیاح کو نماز تک پڑھنے کی اب تک اجازت نہیں بلکہ قانونی جرم تک قرار دے دیا گیا ہے۔ شائد اب یہ مسجد آج اذان کی آواز سے محروم پھر کسی طارق بن زیاد اور عبدالرحمٰن اوّل کا انتظار کر رہی ہے۔

وہی اندلس جہاں پہلے داخل ہونے والے مسلمان عبدالرحمان الداخل جیسی عظیم الشان شخصیت نے یورپ کے قلب میں پہلی اسلامی مملکت قائم کی۔ یورپ کو تاریکیوں سے نکال کر جدید سائنسی، سیاسی، ادبی اور فنی علوم سے روشناس کروایا اور فن تعمیرات کے حوالے سے مسلمانوں نے ایسے نمونے پیش کئے کہ جن کو دیکھ کر دنیا آج بھی دنگ ہے، اس میں مسجد قرطبہ اور قصر الحمرا کے نام قابل ذکر ہیں۔ مسلمانوں نے یہاں اپنی آمد کے فوراً بعد ہی تین لاکھ کتابوں پر مشتمل ایک مکتب غرناطہ شہر میں قائم کروایا۔ اس کے بعد اندلس نے ترقی کی ایسی منزلیں طے کیں کہ اس سرزمین کو قلب یورپ کا درجہ مل گیا۔ صلیبی قوتوں نے آٹھ صدیوں تک اندلس کے علوم و فنون اور ترقی سے پورا فائدہ اٹھایا لیکن مسلمانوں کو اپنے دشمن کی حیثیت سے یاد رکھا۔ مسلمان امراء اور حکومتی اداروں کے بااثر عہدیداروں سے خصوصی تعلقات کی بناء پر اندلس کی حکومت میں ان کی مداخلت اس قدر بڑھ گئی کہ بادشاہ کے دربار میں خصوصی مشیران کی تعیناتی ان کی سفارش سے ہونے لگی۔ ان مشیران کی بدولت امور مملکت کے تمام حساس راز فرنینڈس اور ازابیلا کے پاس

باقاعدگی کے ساتھ پہنچنے لگے اور بالآخر سقوط غرناطہ کا سانحہ غدار مسلمانوں کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچا۔ مسلمانوں نے 800 سال تک شاندار حکومت کی لیکن وہ کیا اسباب تھے کہ آٹھ صدیوں تک حکومت کرنے والوں کو اس ذلت ورسوائی کا منہ دیکھنا پڑا۔ تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں، آپ کو آج کے حالات سے حد درجہ مماثلت نظر آئے گی، مگر ہے کوئی اس پر فکر وتدبر سے کام لے؟ (کیا ہمارے ہاں اسٹیٹ بینک کے گورنر کی تقرری اور دوسرے مشیران کہاں سے آئے ہیں اور ان کی تقرری کس کے احکام سے ہوئی ہے؟)

مجھے اب خوف اس بات کا ہے کہ ہم اپنی تاریخ سے اب بھی کوئی سبق حاصل کرتے دکھائی نہیں دے رہے۔ شائد میرے ارض وطن پر ایسے ہی ذلت اور رسوائی کے مہیب سائے دن بدن بڑھ رہے ہیں جن سایوں کی وجہ سے یورپ کے قلب میں سقوط غرناطہ کا سانحہ پیش آیا۔ اس وقت کا غدار مسلمان بادشاہ ابو عبداللہ جس نے اپنے فوجی افسروں سے کہنا شروع کر دیا تھا کہ یہ وقت لڑائی کا نہیں ہے، ہمیں عیسائیوں سے صلح کر لینی چاہئے۔ جنگ کرنے سے شہر غرناطہ میں خون خرابہ ہوگا۔ اس "روشن خیال" بادشاہ نے خفیہ طور پر (بیک ڈور ڈپلومیسی چینل) اپنے وزیر کو فرنینڈ کے پاس صلح کی درخواست کیلئے بھیجا جسے فرڈی نینڈ نے منظور کیا اور صلح نامہ تیار کیا گیا جس پر دونوں فریقوں نے دستخط کئے۔ غرناطہ کے غیرت مند مسلمانوں نے مقابلہ کیا۔ وہ ہتھیار ڈالنے کے حق میں بالکل نہیں تھے مگر غدار بادشاہ ابو عبداللہ اور اس کے امیروں نے ان غیرت مند مسلمانوں کا ساتھ نہیں دیا بلکہ عوام کو اپنی روشن خیالی کے پردے کے پیچھے چھپی ہوئی ذلت آمیز صلح پر رضامند کروایا۔۔۔۔ پاکستان میں ایسا ہی کھیل شروع ہو چکا ہے۔ آئی ایم ایف کے حکم پر حکومت نے اسمبلی میں منی بجٹ کے نام پر جس خطرناک کھیل کا آغاز کیا ہے، اس کے نتائج سے خوفزدہ ہوں۔

بروز بدھ ۲ جمادی الآخر 1443ھ 5 جنوری 2021ء

خطے میں بھارت کی تجارتی پسپائی

بھارت عالمی تجارت میں ایک بڑا شراکت دار ضرور ہے لیکن اسے اب پاکستان اور چین جیسی بڑی طاقت سے گھیراؤ کے خطرات لاحق ہیں۔ چین کے ''بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے میں بھارت کے پانچ پڑوسی ممالک پاکستان، بنگلادیش، سری لنکا، نیپال اور مالدیپ شامل ہیں۔ مودی کو تشویش ہے کہ اس منصوبے سے اس کے پڑوسی ممالک میں چین کا اثر ورسوخ حد سے زیادہ بڑھ جائے گا اور نئی بننے والی بندرگاہیں اور سڑکیں چین کو عسکری معاونت بھی فراہم کر سکتی ہیں۔ اس وجہ سے بھارت جنوبی ایشیا میں چین سے ایک قدم آگے نہیں تو برابر رہنے کیلئے کوششیں کر رہا ہے۔ اب تک بھارتی سازشی ذہنیت نے پاکستان کے خلاف افغانستان میں جو سرمایہ کاری کی تھی، وہ بھی بھرے میدان میں غرق ہو گئی لیکن پھر بھی اپنے چھوٹے ہمسایہ ممالک میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کی کوششیں کر رہا ہے۔ ان کوششوں میں بھارت کو کچھ کامیابیاں ضرور حاصل ہوئی ہیں لیکن خطے کے چھوٹے ممالک پر چین کی نوازشات کو دیکھتے ہوئے جنوبی ایشیا پر تسلط قائم کرنے کا بھارتی منصوبہ بری طرح ناکام دکھائی دے رہا ہے۔

بھارت اور چین دونوں ہی بحرِ ہند کے تجارتی راستوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان ممالک کے درمیان مالدیپ اور سری لنکا پر اپنا اثر ورسوخ قائم رکھنے کی جنگ شدت اختیار کر جائے گی۔ مالدیپ کے اس وقت کے صدر عبداللہ یامین نے ملک میں ایمرجنسی نافذ کر دی، بھارت نے ملک میں جمہوریت بحال کرنے کی اپیل کی، جسے عبداللہ یامین نے نظرانداز کر دیا۔ اس وقت سے بھارت اور مالدیپ کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ ستمبر 2018ء میں ہونے والے انتخابات میں عبداللہ یامین کو ہرا کر ابراہیم محمد صدر بن گئے۔ بھارت نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے مالدیپ کو 1.4 ارب ڈالر کا امدادی پیکج دیا۔ ابراہیم محمد نے عبداللہ یامین کے دورِ حکومت میں ملک پر چڑھنے والے قرضوں کی تحقیقات کا بھی اعلان کر دیا۔ ان قرضوں میں بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے کے تحت بننے والے چین مالدیپ دوستی پُل کے اخراجات بھی شامل ہیں۔ لیکن چین سے حاصل ہونے والے فوائد کو دیکھتے ہوئے ابراہیم محمد نے بھی اعلان کر دیا ہے کہ مالدیپ چین سے تعلقات ختم نہیں کرے گا۔

دوسری جانب سری لنکا میں بھی بھارت کو اپنے لیے ایک موقع ملا ہے۔ سری لنکا اپنے ساحلی شہر ہامبانتوتا میں ایک آئل ریفائنری تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ اس ریفائنری کی تعمیر میں ایک بھارتی کمپنی بھی کئی ارب ڈالر کی حصہ دار ہے۔ اس ریفائنری کی تعمیر ہامبانتوتا کی بندرگاہ کے نزدیک ہی ہو رہی ہے۔ یہ بندرگاہ بھی چین کے بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے کا حصہ ہے اور بھارت کو اس پر تحفظات ہیں۔ بھارت سمجھتا ہے کہ بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے کے تحت دیے جانے والے قرضوں کے ذریعے چین سری لنکا پر اپنا اثر ورسوخ قائم کرنا چاہتا ہے۔ سری لنکا نے بھی خاطر خواہ سرمایہ حاصل نہ ہونے کی وجہ سے قرضوں میں کمی کے عوض ہامبانتوتا کی بندرگاہ ایک چینی کمپنی کو 99 سال کی لیز پر دے دی ہے۔ سری لنکا کی حکومت نے چینی سرمایہ کاری سے مطمئن نہ ہونے کے باوجود بینک آف چائنا سے ایک ارب ڈالر ادھار لیا ہے تاکہ وہ اپنے پرانے قرض اتار سکے۔ سری لنکا کی ''بھارت کے ساتھ برابری'' کی خواہش اسے معاشی خطرات کے باوجود چینی امداد حاصل کرتے رہنے پر مجبور کرے گی۔

بھارت اور چین کے درمیان ہمالیہ کا متنازع علاقہ بھی ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اس وجہ سے ان بڑی طاقتوں کے درمیان نیپال اور بھوٹان جیسی چھوٹی ریاستوں پر دبدبے کی جنگ شدت اختیار کرے گی۔ 2017ء میں نیپالی وزیراعظم کھڑگا پرساد اولی کے اقتدار میں آنے کے بعد سے چین کے بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے میں نیپال کی دلچسپی بڑھ گئی ہے۔ شروع میں نیپال نے 35 منصوبوں کی خواہش ظاہر کی تھی جسے چین کے کہنے پر کم کر کے 9 کر دیا گیا تھا۔

وزیر اعظم اولی بھارت سے دوری بھی اختیار نہیں کرنا چاہتے تھے، اس وجہ سے گزشتہ سال انہوں نے اپنا پہلا غیر ملکی دورہ بھی بھارت کا ہی کیا۔ دوسری طرف بھارت بھی نیپال میں سرمایہ کاری کر رہا ہے، جس میں 4ء1 ارب ڈالر کا ہائیڈرو پاور منصوبہ بھی شامل ہے۔ لیکن وزیر اعظم اولی کو ان کے گزشتہ دور حکومت میں بھارت کی جانب سے سرحد کی بندش کا تلخ تجربہ یاد ہے۔ اس بندش کی وجہ سے ہی نیپال آئل کارپوریشن اور پیٹرو چائنا کے درمیان پہلی بار ایندھن کی خریداری کا معاہدہ ہوا تھا۔

نیپال کے برعکس بھوٹان بھارت کا سب سے مضبوط اتحادی ہے۔ یہ بھارت کا وہ واحد پڑوسی ملک ہے جو اب تک بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے کا حصہ نہیں بنا ہے۔ 2017ء میں بھارت اور چین کی افواج ڈوکلام کے علاقے میں آمنے سامنے آگئی تھیں (ڈوکلام چین اور بھوٹان کے درمیان ایک متنازع علاقہ ہے) یہ کشیدگی کئی ماہ جاری رہی تھی۔ اسی لئے بھارت بھوٹان پر اپنا اثر و رسوخ قائم رکھنا بہت ضروری سمجھتا ہے۔ بھارت کی جانب سے دیگر ممالک کو دی جانے والی امداد میں سب سے زیادہ حصہ بھوٹان کو ملتا ہے۔ مودی نے 2014ء میں اپنا پہلا غیر ملکی دورہ بھی بھوٹان کا ہی کیا تھا۔

بنگلادیش بھی بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے کا حصہ ہے۔ یہ اپنے جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے چین کو بندرگاہوں تک رسائی دے سکتا ہے۔ 2016ء میں چینی صدر اور بنگلادیشی وزیر اعظم سے ملاقات کے بعد 20 ارب ڈالر سے زیادہ کے منصوبوں پر دستخط ہوئے۔ بنگلادیش میں چین کے منصوبوں کی لمبی فہرست ہے، جس میں ریلوے لائن، سڑکیں، پٹ سن کی ملیں، بندرگاہیں اور بجلی کے منصوبے شامل ہیں۔ بھارت بھی ملک کے شمال مشرقی حصے تک بہتر رسائی کیلئے بنگلادیش کے ساتھ خوشگوار تعلقات رکھنا چاہتا ہے۔ ملک میں جاری تعمیراتی اور معاشی منصوبے بنگلادیش کے چین اور بھارت کے ساتھ تعلقات مضبوط کریں گے۔

بیلٹ اینڈ روڈ پروگرام کے تحت پاکستان میں جاری منصوبے بھارت کیلئے پریشانی کا باعث ہیں۔ چین پاکستان اقتصادی راہداری کے ذریعے چین کا تجارت کیلئے آبنائے ملاکا پر انحصار کم ہو جائے گا۔ بھارت کے ساتھ کسی ممکنہ بحری جھڑپ کی صورت میں گوادر کی بندرگاہ چینی بحریہ کیلئے معاون ہو سکتی ہے۔ دوسری جانب آزاد کشمیر سے گزرنے والی سڑک بھی بھارت کیلئے تشویش کا باعث بنی ہوئی ہے۔ بھارت کا کہنا ہے کہ اس طرح چین نے اپنے ہی بنائے ہوئے عدم مداخلت کے اصول کی خلاف ورزی کی ہے۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان جاری کشمیر کے تنازع کی وجہ سے چین پاکستان اقتصادی راہداری بھارت کو بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے کا ایک بڑا مخالف کے طور پر سامنے آرہا ہے کیونکہ اس کے آقا کو بھی یہی مطلوب ہے۔

بھارت اور چین کے تعلقات خاصے پیچیدہ ہیں۔ چین کی پاکستان کے ساتھ شراکت کی بناء پر بھارت خاصے دباؤ میں ہے۔ بھارت اور چین کے درمیان ریاست "اُروناچل پردیش" اور "آکسائی چن" کے علاقوں کا تنازع بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ بحر ہند اور جنوبی ایشیا میں چین کے بڑھتے ہوئے قدم بھی خطے میں بھارتی اثر و رسوخ کیلئے خطرہ ہیں۔ یقیناً بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے سے منسلک تمام ممالک میں اس منصوبے سے متعلق بحث ہوتی رہے گی، تاہم بھارت کے بڑھتے ہوئے قدم اور مودی کی غلط پالیسیاں خطے کے چھوٹے ممالک کو اس بات پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ چین کے ساتھ اپنے تعلقات کو آگے بڑھائیں اور چین نے اس سنہری موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

بروز ہفتہ 5 جمادی الآخر 1443ھ 8 جنوری 2021ء

بے غیرتی کا شاہکار زندگی

ہائے تشویش ہمیں تیرا خیال ہے، جب دیکھو ہم تجھ میں مبتلا رہتے ہیں۔ تجھ سے محبت کرتے ہیں، ہائے ہائے کا ورد کرتے ہیں۔ ہاں ہم اظہار یکجہتی بھی کرتے ہیں، تصویریں کھنچواتے ہیں اور پھر اخبارات میں چھپواتے ہیں تاکہ سند رہے کہ ہم تشویش کی بیماری میں یکجہتی بھی کرتے ہیں۔ یہ دیکھو تصویری ثبوت، ہم دن مناتے ہیں.... ماں کا دن، باپ کا دن، محبوبہ کا دن، اور نجانے کتنے دن۔ یوم اطفال منایا گیا، بچوں کے حقوق پر بڑے زور شور سے جذباتی تقریریں سننے کو ملیں اور ہر صاحب حیثیت کو تشویش میں مبتلا دیکھا۔ اخبارات میں رپورٹس بھی شائع ہوئیں، دو دن پہلے ایک خبر دیکھی، ٹی وی چینلز نے اپنے کیمروں کی آنکھ سے یہ مناظر محفوظ کیے اور پھر چل سو چل۔ غربت اور افلاس سے مجبور ماؤں نے اپنے جگر گوشے ایدھی سنٹرز کے حوالے کرنے شروع کر دیئے ہیں۔ رپورٹ میں بتایا گیا کہ ایک ماں اپنے چار بچوں کو سنٹر میں چھوڑ کر چلی گئی۔ اس سے پہلے ایک اور جوان ماں اپنے تین بچوں کو روتا چھوڑ کر ابھی سنٹر کے دروازے پر پہنچی ہی تھی کہ بیٹی کی چیخ نے اسے دروازے پر ہی ڈھیر کر دیا۔ ایسی درجنوں مثالیں اس رپورٹ میں دکھائی جا رہی تھیں، میرا تو دم گھٹنا شروع ہو گیا اور مارے بزدلی کے میں نے ٹی وی بند کر دیا۔ کیا کروں بچوں کی چیخ و پکار اور مائوں کی بے بسی نے میرے دل میں ایک ماتم کی مجلس سجادی ہے جس سے جان چھٹتی نظر نہیں آ رہی۔ تفصیلات تو آپ پڑھ چکے ہوں گے اور ہائے ہائے بھی کیا ہو گا۔ لیکن اب بہت اچھے ہیں ہم سب۔

اب بھی غربت اور افلاس سے مجبور مائیں اپنے جگر گوشوں کو ایدھی سنٹر کے حوالے کر دیتی ہیں کہ بچوں کی بھوک اور بیماری ان سے برداشت نہیں ہوتی۔ وہ ایدھی جو گزشتہ سات دہائیوں سے سماج سیوا میں لگے رہے اور ان بیمار اور مفلس بچوں کو کھانا کھلانے کیلئے بھیک بھی مانگتے رہے۔ دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے اپنی آنکھیں بھی عطیہ کر گئے اور دو پڑھے لکھے نوجوان جو ایک بم دھماکے میں اپنی آنکھوں سے محروم ہو گئے تھے، اپنے گھروں کے اکلوتے کفیل تھے، ایک مرتبہ پھر ایدھی کی آنکھوں نے ان کی تاریک دنیا روشن کر دی۔ وہی بیکس ایدھی جو سڑکوں پر کھڑا سسکتی انسانیت کیلئے اپنی جھولی پھیلائے کھڑا رہتا تھا اور ہر گزرنے والا غریب ریڑھی اور رکشے والا بھی اپنی بساط کے مطابق پورے یقین کے ساتھ بخوشی اپنا حصہ ڈال کر مطمئن ہو جاتا تھا۔ اس کی رخصت کا جب وقت آیا تو دنیا نے دیکھا کہ ہماری فورسز کے تمام سربراہ باوردی اس کو سلیوٹ پیش کر رہے تھے اور پہلی مرتبہ کسی عوامی فقیر کا جنازہ سرکاری توپ پر رکھ کر بڑی شان سے آخری آرام گاہ تک پہنچایا گیا لیکن خیراتی کاموں پر اپنی تشہیر کیلئے میڈیا کو استعمال کرنے والے بیشتر سرکاری اور سیاسی رہنماء ایدھی کے جنازے سے بھی محروم رہے یا یوں کہیں کہ میرے رب نے ان کو اجازت ہی نہیں دی۔

اس سے پہلے ہم نے برداشت کا دن منایا تھا لیکن آخر کب تک برداشت! بس تبلیغ ہی تبلیغ، لیکچر ہی لیکچر، باتیں ہی باتیں، سیمینار سجایئے، یہ شداد کی جنت پنج ستارہ ہوٹل کس لیے ہیں، سجی ہوئی لمبی سی میز، اس ترتیب سے رکھے ہوئے گلاس جن کے اندر سفید رومال ٹھنسا ہوتا ہے اور پھر منرل واٹر۔ میز کے کناروں اور درمیان میں تازہ پھولوں کا ڈھیر، گہری سوچ میں ڈوبے، تشویش زدہ دانش ور، آسودہ حال، سوشل اور ٹائم پاس سامعین، ٹشو پیپر، کافی، چائے، پیسٹری اور کوکیز کے شوقین۔ مستعد اور فرمانبردار ویٹرز، اور ہر لمحے کو محفوظ کرنے والے کیمرے، کیا خواب ناک ماحول؟ اور پھر سیمینار ختم اور پیسہ ہضم۔ وہی ڈھاک کے تین پات، چکنے گھڑے۔ ہر ایک پند و نصائح کا ٹوکرا سر پر اٹھائے گھوم رہا ہے۔ باتیں لے لو، باتیں کتنے ٹن چاہئیں! لوگ مہنگائی کو رو رہے ہیں۔ وہ شکوہ کر رہے ہیں، ارزانی نہیں ہے ارے کتنی باتیں چاہئیں، کتنے لیکچر چاہئیں باتیں اور ہاں وہ بھی بالکل مفت۔ دو چار ٹن تو میں خود بھی

تھامے گھوم رہاہوں۔ باتوں سے مرعوب کرنے والے روح سے خالی جسم اور ویسی ہی باتیں، بس بولنا ہے۔ بولتے رہنا ہے، کرنا کرانا کچھ نہیں۔

ہم سب اشتہار کے رسیا ہیں، بس اشتہار چھپا تو دوڑ پڑتے ہیں۔ پھر ہر ایک کے دل میں درد بھر جاتا ہے، تصویر اور سیلفی بنانی ہے ناں جناب۔ پھر کوئی راشن لے کر پہنچ جاتا ہے، کوئی نوکری دینے لگتا ہے، سب حاتم طائی کی اولاد بن جاتے ہیں۔ ویسے سوشل ڈنر کرتے ہیں، پارٹیاں منعقد کرتے ہیں، جھوم برابر جھوم، دو دو لاکھ کا عروسی جوڑا تو اب عام ہو گیا ہے، اور لاکھوں روپے کے زیورات، دکھاوا ہی دکھاوا۔ پوچھا جائے کہ لائے کہاں سے یہ دولت؟ تو تیوری پر بل پڑتے ہیں۔ عمرے پر عمرہ، جہاز بھر بھر کر لے کر جاتے ہیں کروڑوں روپے قومی خزانے کے اور ثواب کا ثواب۔ خانہ کعبہ اور مسجد نبوی کے دروازے کھول کر اندر داخل کیا جاتا ہے، نجانے کیا کیا مانگا جاتا ہے لیکن باہر نکلتے ہی نوید سنائی جاتی ہے کہ والی مکہ و مدینہ نے چار فیصد سود پر پاکستان کو تین ارب ڈالر اپنے خزانے میں صرف رکھنے کیلئے عطا کر دیئے ہیں، اب کیا لکھوں کہ میرے رب نے تو سود کو اپنے خلاف کھلی جنگ قرار دیا ہے۔ پڑوس میں افغان بھوک اور فاقوں میں مبتلا ہیں لیکن چین کی کثیر امدادی پیکج کو محض اس لئے ٹھکرا دیا کہ سروس کے نام پر ایک فیصد سود عائد کیا گیا تھا جبکہ ہمارے وزیر خارجہ کی تصویر بھی بہت وائرل ہو رہی ہے جس میں وہ قرض دینے والے ملک سعودی سفیر کے سامنے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اپنے حسن اخلاق کا مظاہرہ فرما رہے ہیں اور ایک درباری و خوشامدی مولوی اس کی صفائی دینے کیلئے اپنی عاقبت کو داؤ پر لگا رہا ہے۔

ابھی دیکھتے رہیے، عیدِ قرباں پر آپ کو اسی ملک میں ایسی کئی خبریں پڑھنے کو ملیں گی کہ اتنے لاکھ کا بکرا، اتنے لاکھ کا بچھڑا، بیچنے والا جو شکل سے مفلوک الحال لیکن اس کا دعویٰ کہ وہ سارا سال اس جانور کو بادام اور مکھن کھلاتا رہا ہے، نجانے اس خبر کو دیکھ کر کتنے بیکس خاندان کے افراد اپنے انسان ہونے پر شرمندہ ہو کر قربانی کا جانور بننے کی خواہش کرتے ہوں گے۔ پھر ٹی وی پر فیشن زدہ ایلیٹ کلاس یہ کہتے ہوئی بھی نظر آئے گی کہ ڈیڈی نے اتنے کروڑ کے جانور قربان کر دیئے۔ خاک بسر لوگ قربان ہو رہے ہیں کسی کی کان پر جوں تک نہیں رینگتی، سب کچھ اپنے لالے تللوں اور نمائش کیلئے، ہم وہ نمائشی بھکاری ہیں جنہیں اپنے پڑوسی کی خبر نہیں ہے اور رو رہا ہوں پورے ملک کو۔ یہاں کماؤ حلال حرام کے چکر چھوڑو۔ باہر کے بینکوں کے پیٹ بھرو۔ یہاں بھی عیش اور باہر بھی عیش۔ رند کے رند رہے اور ہاتھ سے جنت نہ گئی، بس جہاز بھر کر اپنے خوشامدیوں کے ساتھ عمرہ کر کے پاک پوتر ہو جاؤ۔

تصویر شاہکار وہ لاکھوں میں بک گئی
جس میں بغیر روٹی کے بچہ اداس ہے

سب ڈھکوسلہ، جعلی پن بکواس ڈھٹائی، بے حسی اور بے غیرتی، وہ جناب عیسیٰ علیہ السلام نے باآواز بلند کہا: مارو ضرور مارو پتھر لیکن پہلا پتھر وہ مارے گا جو پوتر ہو۔ ہم تو خود ترسی کے مریض ہیں، خدا کیلئے ترس کھاؤ ہم پر۔ زندگی کے نام پر بدترین موت۔ کبھی دو پل نہیں سوچتے کہ کب تک ایسا ہوتا رہے گا، کب تک بھیک مانگیں گے! شرم و حیا کا لفظ ہی ہماری لغت سے غائب ہو گیا ہے، ہمیں بھیک چاہیے، دیتے جاؤ، ہمارے ساتھ جو چاہے کر لو ہاں جو چاہے کرو۔ کیا ہم بھول گئے کہ بھری عدالت میں امریکی اٹارنی نے کیا کہا تھا کہ پاکستانی تو دس ہزار ڈالر کیلئے اپنی ماں کو بھی فروخت کر دیتے ہیں، اس لئے کہ ہم نے اس وقت تازہ تازہ مال عافیہ صدیقی کی شکل میں فروخت کیا تھا اور آج بھی وہ مجاہدہ امریکی جیل میں ان وعدوں کی تکمیل میں گزار رہی ہے جنہوں نے اقتدار سنبھالنے سے قبل عافیہ کو اپنی بیٹی اور بہن قرار دیتے ہوئے سارے میڈیا کے

سامنے قول واقرار کئے تھے۔اقتدار کی نمک کی کان میں پہنچتے ہی سب نمک بن گئے اور اب تو یہ نعرہ ہے کہ جو چاہو لے لو، بس بھیک دے دو۔لعنت ہے ایسے جینے پر۔کچھ نہیں بدلنے کا یہاں کچھ بھی نہیں۔ہم خود کو نہیں بدلتے تو سماج کیسے بدل جائے گا! ہر ایک اپنا اُلو سیدھا کرنے میں لگا ہوا ہے۔بس آج کا دن گزارنا ہے،اس پیٹ کے دوزخ کو بھرنا ہے چاہے عزت بیچنی پڑے،گالیاں سننی پڑیں بس پیٹ بھرنے کیلئے راتب دے دو۔پھر سڑکوں پر آکر یہ جیوے وہ جیوے کے نعرے، کب ہوش میں آئیں گے۔

وہی عشوہ گری ہے اور وہی رسمِ عزاداری
یہاں طرزِ طرب،نہ شیوۂ ماتم بدلتا ہے

کئی تلخ یادیں اور خبریں لائن میں ایستادہ کھڑی چیخ چیخ کر مطالبہ کر رہی ہیں کہ ان کا بھی ذکر کروں۔آپ تو جانتے ہیں کہ لمحہ بھر کی خطا، صدیوں کی سزا پر جا پہنچتی ہے۔کہیں پر کسی مظلوم پر ظلم ہوتا ہے اور ہم سب تماشہ دیکھتے ہیں۔ہمارے ہاں ایک خبر چھپی تھی جس کی بڑی ہی خوفناک سرخی تھی "قبضہ گروپ کی چنگیزی، مڈل کی طالبہ۔۔۔۔۔کو برہنہ کرکے کھمبے سے باندھ کر سرِعام تشدد،اہل محلہ کی منت سماجت کے بعد حوا کی بیٹی پر چادر ڈالنے کی اجازت ملی۔آپ کہتے ہیں کہ میں بہت سخت زبان استعمال کرتا ہوں۔میں نے اس وقت بھی یہ لکھا تھا کہ ایک معصوم بچی کو پورے محلے کے سامنے برہنہ کیا گیا اور پورا محلہ ان کی منتیں کرتا رہا۔اسے بے غیرتی نہ کہوں تو کیا کہوں! اگر وہ متحد ہو جاتے تو کس کے باپ میں اتنا دم ہے کہ وہ کسی معصوم بچی کو برہنہ کرتا لیکن جناب بہت پیاری ہے ہمیں اپنی جان، بے غیرتی کا شاہکار زندگی۔مجرموں کی بعد میں اور ان اہل محلہ کی کھال پہلے کھینچنی چاہیے کہ تم میں سے کوئی ایک بھی غیرت مند نہیں تھا،سب کے سب بے غیرتی کا مجسمہ بن کر یہ منظر دیکھتے رہ گئے! میں کہوں گا کہ پھر ایسے بے غیرتوں کو جینے کا حق ہی نہیں ہے۔میرے ایک قاری نے مجھے یہ لرزہ خیز اطلاع دی ہے کہ تمام ملزمان شک کا فائدہ دیتے ہوئے بری کر دیئے گئے اور ایک مرتبہ پھر وہ گائوں میں گولیوں کی تڑتڑاہت میں خوشی مناتے ہوئے داخل ہوئے اور سارا گاؤں دبک کر اپنے گھروں کے کواڑ بند کرکے اپنی غیرت کو تھپکیاں دیکر سلانے میں مصروف ہو گئے۔

افلاس کی بستی میں ذرا جا کر تو دیکھو
وہاں بچے تو ہوتے ہیں مگر بچپن نہیں ہوتا

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم بن ابی طالب اہل خشیت میں سے تھے،آپ رضی اللہ عنہ کی زبان اطہر سے نکلنے والے الفاظ یاقوت وزمرد اور اندھیرے میں چراغ کی مانند ہیں،قرآن اور صاحب قرآن کی پہچان میں آپ کے اقوال آج بھی رہنمائی فرماتے ہیں۔حضور نبی اکرم ﷺ نے آپ کو شہر علم کے دروازے سے تشبیہ دی،آپ رضی اللہ عنہ وہ عظیم صحابی رسول ہیں جن سے بے ساختہ محبت کا اظہار ایمان کی پختگی کا پیمانہ ہے۔آپ کے ارشادات بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھاتے ہیں،آپ جب نماز کیلئے کھڑے ہوتے تو اللہ کا خوف لرزہ بر آندام کر دیتا،شہادت سے قبل آپ نے مسکرانا بند کر دیا تھا۔آپ رضی اللہ عنہ کے مختصر الفاظ میں دین، دنیا کی حقیقتیں بیان ہوئیں،صاحب نہج البلاغہ نے فرمایا "مجھے تم پر جس چیز کا سب سے زیادہ ڈر ہے وہ خواہش کی پیروی اور لمبی امیدیں باندھنا ہے،خواہش نفس کی پیروی گمراہ کر دیتی ہے اور لمبی امیدیں باندھنا آخرت کو بھلا دیتا ہے۔ایک اور جگہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہر شخص کی اصلیت دنیا میں ہی ظاہر کر دے گا۔

میں ابھی یہ پڑھ کر اپنا محاسبہ کرتے ہوئے کانپ ہی رہا تھا کہ میڈیا میں یہ خبر چلنا شروع ہو گئی کہ "اسکروٹنی کمیٹی نے پی ٹی آئی کی اصلیت قوم پر عیاں کر دی، دوسروں پر چوری کے الزامات لگانے والے عمران خان خود چور نکلے۔ اب ہر طرف سے یہ مطالبہ زور پکڑنے لگا ہے کہ عمران خان قوم کو بتائیں 53 بینک اکاؤنٹس کیوں چھپائے تھے؟ خفیہ بنک اکاؤنٹس کن مقاصد کیلئے استعمال ہوتے رہے؟ رپورٹ سے ثابت ہوا کہ عمران خان صادق اور امین نہیں رہے، رپورٹ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ عمران خان سمیت پی ٹی آئی ممنوعہ غیر ملکی فنڈنگ میں ملوث ہے۔ عمران سمیت پی ٹی آئی کو سیاست کیلئے تاحیات نااہل قرار دینا ضروری ہے۔

غیر ظاہر شدہ فنڈز کے بارے میں اسٹیٹ بینک کی رپورٹ میں انکشاف ہوا ہے کہ پی ٹی آئی نے 77 میں سے صرف 12 اکاؤنٹس ظاہر کیے۔ اسکروٹنی کمیٹی کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ پی ٹی آئی نے اکاؤنٹس میں 1 ارب 33 کروڑ 22 لاکھ 33 ہزار 368 روپے ظاہر کیے تھے جبکہ اسٹیٹ بینک کی دستاویزات کے
تحت اکاؤنٹس میں ایک ارب 64 کروڑ 26 سے زائد رقم وصول کی گئی، پی ٹی آئی نے 53 بینک اکاؤنٹس اور 31 کروڑ روپے کی رقم چھپائی گئی۔ پی ٹی آئی کے 2008 اور 2009 کے دو بینک کھاتوں کو ظاہر نہیں کیا گیا۔ رپورٹ کے مطابق پی ٹی آئی نے نیوزی لینڈ اور کینیڈا کے اکاؤنٹس تک رسائی نہیں دی۔ اسکروٹنی کمیٹی نے تحریک انصاف کے 2008 سے 2013 کے آڈٹ کی تفصیلات، بینک اکاؤنٹس پر اپنا تجزیہ کو رپورٹ کا حصہ بناتے ہوئے کہا ہے کہ 2012-13 کی آڈٹ رپورٹ پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے۔ آڈٹ فرم کی فراہم کردہ کیش رسیدیں بنک اکاؤنٹس سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ آڈٹ رپورٹ منظوری کیلئے پی ٹی آئی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی میں پیش کی گئی تھی۔ آڈٹ رپورٹ پر تاریخ نہ ہونا اکاؤنٹنگ معیار کے خلاف ہے۔ پی ٹی آئی کے خلاف اسکروٹنی کمیٹی کی رپورٹ کے اہم نکات سامنے آئے جس کے مطابق مطابق اسٹیٹ بینک کی جانب سے پی ٹی آئی کے بینک اکاؤنٹس کی تفصیلات میں پاکستان میں ڈالر آپریٹڈ اکاؤنٹس کی تفصیلات بھی رپورٹ میں شامل ہیں۔ رپورٹ میں ممنوعہ فنڈنگ سے متعلق بھارتی، فرانسیسی اور آسٹریلوی قوانین کا حوالہ بھی شامل ہے۔

ابھی دو دن قبل آنے والی خبر نے بھی چونکا دیا کہ ہمارے محترم وزیر اعظم عمران خان نے 2017ء میں ایک لاکھ 3 ہزار 763 روپے ٹیکس دیا اور 2018ء میں 2 لاکھ 82 ہزار 449 روپے ٹیکس ادا کیا اور اب اس سال انہوں نے 98 لاکھ 54 ہزار 959 روپے ٹیکس ادا کیا ہے۔ ان کے مشیر سے عمران خان کے کاروبار کے بارے میں جب سوال کیا گیا تو انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا جبکہ اپوزیشن کے ہر رہنماء کے اثاثوں اور آمدن کے پورے اکاؤنٹس انہیں ازبر یاد ہیں۔ کتنی خبریں سناؤں، قانون کی حکمرانی زندہ باد۔ اوہو یہ تو میں بھول گیا کہ عمران خان کی حکومت کرپشن فری پاکستان کا ہفتہ منانے کا پروگرام بنا رہی تھی، پتہ نہیں اب اس رپورٹ کے بعد اس پروگرام کا کیا بنے گا، تاہم اگر ایسا ہوا تو آپ ضرور منائیں، میں بھلا کون ہوتا ہوں آپ کو روکنے والا، سیمینار، سیمینار کھیلیں، باتیں بیچیں، باتیں کھائیں، لیکن ذرا ٹھہریں مجھے عین وقت پر جوزف ہیلر کے افسانے "آشوبِ شہر" کا ایک جملہ یاد آ گیا: "ہمارے گھر آنے والے غریبوں کو ہمارے اندازِ رہائش سے لطف اٹھانے کی اجازت ہے"۔

پہلے کون رہا ہے یہاں، جواب رہے گا۔ کچھ بھی تو نہیں رہے گا، بس نام رہے گا میرے رب کا

کچھ اور دیر نمائش ہے شور و شر کی یہاں　　یہ اک حباب ہے موجِ فنا پہ ٹھہرا ہے
فروغِ حسن سرورِ کشید دل سے ہے　　نشاطِ عشق غم بے بہا پہ ٹھہرا ہے

بروز اتوار 6 جمادی الآخر 1443ھ 9 جنوری 2021ء

لاعلاج مرض!

بہت عجیب ہیں ہم۔ میں تو بدنصیب کہنے والا تھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یہی کہنا چاہتا ہوں۔ اندر مجھے روکتا ہے کہ نہیں، اتنا آگے نہ جاؤ۔ ہمارے رویے، ہمارا برتاؤ، ہماری بود و باش، ہماری خواہشات سب کچھ عجیب ہے۔ خواب بھی، ہم تضادات کا مجموعہ ہیں۔ جو اہم ہے اسے نظر انداز کر دیتے ہیں، جو ثانوی ہے اسے اوّلیت دیتے ہیں۔ میں بندہ نفس ہوں، مجھے بندہ رب بننا تھا اور بندہ رب وہ ہے جو اس کی چلتی پھرتی، جیتی جاگتی، ہنستی گاتی تصویروں سے محبت کرے۔ لیکن ٹھہریئے! مشروط محبت نہیں.... بس محبت، جس میں اخلاص ہو، طلب نہ ہو۔ بس دینا ہی دینا، لینا کچھ نہیں، کھلے بازو اور کھلا دل، تنگ دلی کا گزر بھی نہ ہو۔ طمع اور لالچ چھو بھی نہ سکیں..... بس خالص محبت۔ میرا رب تو اس سے محبت کرتا ہے جو اس کی مخلوق سے محبت کرے۔ کتنا عجیب ہے یہ رویہ کہ میں کسی سے محبت کرتا ہوں اور اس کی تخلیق سے صرف نظر!

بڑا سا ڈرائنگ روم وہ وقت آج بھی مجھے یاد ہے..... جناب حسن مطہر کے ہاں مکہ مکرمہ میں، عمرہ سے ابھی لوٹے تھے اور مدینہ منورہ کی تیاری تھی، اور سفید بالوں والے باباجی.... اور کچھ دوستوں کی بحث پر ان کی مسکراہٹ۔ میں نے انسانی شکل میں بہت فرشتے دیکھے ہیں، وہ بھی ایسے ہیں، بہت تحمل اور بہت صبر والے.... اور مجھے تو دونوں چھو کر بھی نہیں گزرے۔ جب بہت دیر ہو گئی تو انہوں نے مجھ سے کہا "تو سمجھ گیا ہے ناں، ویسے ہی یہ بحث کر رہے ہیں!" تو میں بہت ہنسا اور کہا "نہیں باباجی مجھے کچھ کچھ تو سمجھ آ گیا، پوری طرح نہیں"۔ "او پگلے جب تجھے کسی کی بری عادتیں بھی اچھی لگیں، اس کے غصے پر بھی پیار آئے، تو اس کی جھڑکی سن کر بھی سرشار ہو، اس کی ڈانٹ سننا چاہے، بلکہ خود ایسی حرکت کرے کہ وہ تجھے ڈانٹ دے، تجھ میں سے "تو" نکل جائے اور "وہ" بس جائے، انا صرف دم نہیں توڑے بلکہ فنا ہو جائے، جب وہ دھتکار دے اور تو اور قریب آئے.... جب تجھ میں، تیری رگ و پے میں، تیری نس نس میں، لہو کی ہر بوند میں وہ سما جائے تو سمجھ لینا ہاں! اب ہے محبت، اگر ایسا نہیں تو عبث ہے، سب عبث، سب کار عبث ہے۔

ہاں مجھے سمجھ آ گیا تھا، تجربہ تو کوئی بھی نہیں جھٹلا سکتا۔ بالکل ایسا ہی ہے۔ مجھے عجیب لگتا ہے۔ ہم سب اللہ کی محبت کے طلبگار ہیں اور مخلوق سے بیزار۔ نجانے کیا ہے یہ۔ میں اسے قید کرنا چاہتا ہوں جبکہ محبت آزادی ہے۔ وہ سارے عالم کا رب ہے، ساری کائنات کا رب ہے اور میں اسے صرف رب المسلمین سمجھ بیٹھا ہوں۔ وہ لامحدود ہے اور میں اسے محدود کر کے اپنی بوتل میں بند کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس کے بندوں کو تقسیم کرتا ہوں خانوں میں، وہ سب کو دیتا ہو اور میں سب سے روکتا ہوں۔ وہ وسیع ہے اور میں تنگ دل۔ میں بندوں کا حساب کتاب اس پر نہیں چھوڑتا، خود کو توال بن گیا ہوں۔ میں محبت تو کیا کروں نفرت کا بیج بوتا رہتا ہوں۔ میں کون ہوتا ہوں اس کے اور اس کی مخلوق کے درمیان آنے والا! میں ڈنڈے اور بندوقیں لیکر انسان پر ٹوٹ پڑا ہوں۔ وہ جبر سے منع کرتا ہے اور میں اپنی بات طاقت سے منوانا چاہتا ہوں۔ میں اس کی کوئی بات نہیں سنتا اور اس کا خلیفہ بنا پھرتا ہوں۔ مجھے میرے نفس نے برباد کر دیا ہے، میں اس کی مخلوق کیلئے آزار بن چکا ہوں اور رب سے تقاضہ کرتا ہوں کہ مجھے محبت سے دیکھے! میں خود ظالم ہوں اور رب سے طلب کرتا ہوں اس کا رحم! میں کسی کو بھی معاف کرنے کیلئے تیار نہیں ہوں اور ہر دم اس کو کہتا ہوں کہ مجھے معاف کر دے! میں خود پیٹ بھر کر کھاتا ہوں اور اپنے آس پاس خاک بسر لوگوں سے بے خبر ہوں! میں عجیب ہوں، میرے رب نے جو حقوق دیئے ہیں سب کو، میں وہ سلب کر کے بیٹھ گیا ہوں، میں اپنی بات محبت سے نہیں بلکہ دھونس، دھاندلی اور دھمکی سے منواتا ہوں۔ میں اتنا ظالم ہوں کہ میرے گھر والے جنہیں میں نے اتنی محنت کر کے، سچ جھوٹ بول کر، ہلکان ہو کر، ہر جائز و ناجائز کی پرواہ کئے بغیر انہیں پالا ہے، جب وہ اپنے حقوق جو میرے رب نے انہیں دیئے ہیں، طلب

کر بیٹھیں تو میں ڈنڈا لیکر کو دپڑتا ہوں۔اس وقت تو مجھے رب یاد نہیں آتا۔ میں بہت ظالم ہوں، جو رب نے حقوق دیئے ہیں میں نے وہ بھی چھین لئے ہیں، اور دعویٰ کرتا ہوں محبت کا، اپنے رب سے !

ہر بندے کا رب سے ایک خاص تعلق ہے اور ایسا کوئی آلہ ایجاد نہیں ہوا جو مجھے بتائے کہ کون رب کے کتنا قریب ہے..... وہ جو تسبیح لئے گھوم رہا ہے یا وہ جو سڑک پر تار کول بچھا رہا ہے، وہ جو موٹر میں گھوم رہا ہے یا وہ جو برہنہ پا ہے۔ہاں موٹر تو کیا ہے، جہاز میں بیٹھنے والا بھی اس کے قریب ہو سکتا ہے۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ میں رب اور مخلوق کے درمیان آؤں ! میں خود کو کیوں نہیں دیکھتا کہ میرا کیا تعلق ہے رب سے ! میں اگر نماز پڑھتا ہوں تو بے نمازیوں کو حقارت سے دیکھتا ہوں۔ میں اگر روزہ رکھتا ہوں تو دوسروں سے خود کو اعلیٰ سمجھ بیٹھتا ہوں۔ مجھے کیا معلوم ہے کیا مجبوری ہے کسی کی۔ وہ جانے اور اس کا رب..... مجھے تو اپنا کام کرنا ہے۔ جو مجھے کرنا چاہئے وہ نہیں کرتا اور جو نہیں کرنا چاہئے وہ کرتا چلا جا رہا ہوں۔ میں اپنے رب سے محبت کے جھوٹے وعدے سے کب باز آؤں گا ! مخلوق سے نفرت اور رب سے محبت۔ مجھے تو کچھ پلے نہیں پڑتا، آپ کو سمجھ آ گیا ہو تو براہ مہربانی مجھے بھی سمجھائیے۔ میں پہلے بھی اپنے کسی کالم میں یہ واقعہ لکھ چکا ہوں، نجانے اسے کیوں دہرانے کو جی چاہتا ہے شائد ایسی ہی پریشانی میں حضرت شبلی بھی مبتلا تھے جس کی دوا لینے کیلئے اپنے زمانے کے بہت بڑے طبیب اور حاذق کے پاس جا پہنچے اور اپنے دل کا ماجرا کہہ ڈالا کہ حضرت مجھے گناہوں کا مرض ہے، اس کی کوئی دوا ہو تو مجھے عنائت کیجئے۔ اپنے اس مرض کے علاج کیلئے اصرار کر رہے تھے۔ یہاں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ میدان میں ایک مفلوک الحال فقیر زمین سے تنکے چننے میں مصروف تھا، اس نے سر اٹھا کر کہا: جو تجھ سے کو لگاتے ہیں وہ تنکے چنتے ہیں ! شبلی ! یہاں آؤ میں اس کی دوا دیتا ہوں۔

حیا کے پھول، صبر و شکر کے پھل، عجز و نیاز کی جڑ، غم کی کونپل، سچائی کے درخت کے پتے، ادب کی چھال، حُسنِ اخلاق کے بیج، یہ سب لے کر ریاضت کے ہاون دستہ میں کوٹنا شروع کرو اور اشکِ پشیمانی کا عرق ان میں روز ملاتے رہو۔ ان سب کو دل کی دیگچی میں بھر کر شوق کے چُولہے پر پکاؤ۔ جب پک کر تیار ہو جائے تو صفائے قلب کی صافی میں چھان لینا اور شیریں زبان کی شکر ملا کر محبت کی تیز آنچ دینا۔ جس وقت تیار ہو کر اترے تو اس کو خوفِ خدا کی ہوا سے ٹھنڈا کر کے باوضو ہو کر استعمال کرنا"۔ حضرت شبلی نے نگاہ اٹھا کر دیکھا، وہ دیوانہ غائب ہو چکا تھا ! میری دعا ہے کہ ہمارے مقتدر حلقے بھی اس نسخہ کیمیا پر نہ صرف غور کریں بلکہ اس پر عمل کرنے کی توفیق بھی طلب کریں۔ آپ سب آباد رہیں، خوشحال رہیں، دلشاد رہیں.... سب کو چلے جانا ہے یہاں سے، کسی کو بھی نہیں رہنا، بس نام رہے گا میرے رب کا۔ یہ میں تو نہیں کہہ رہا ناں، بابا اقبال کہہ رہے ہیں !

عجب واعظ کی دیں داری ہے یارب — عداوت ہے اسے سارے جہاں سے
کوئی اب تک نہ یہ سمجھا کہ انساں — کہاں جاتا ہے، آتا ہے کہاں سے
وہیں سے رات کو ظلمت ملی ہے — چمک تارے نے پائی ہے جہاں سے

بروز منگل 8 جمادی الآخر 1443ھ 11 جنوری 2021ء

امید نہ ٹوٹے

تبدیلی کا سلسلہ تو جاری و ساری رہتا ہے۔اسی کا نام زمانہ ہے۔ پانی ٹھہر جائے تو جوہڑ بن جاتا ہے۔ چلتا ہوا پانی ہی صاف اور شفاف ہوتا ہے۔ سیاست ٹھہرے ہوئے پانی کا نہیں بلکہ اس کی روانی کا نام ہے۔اس کے بند مضبوط ہونے چاہئیں۔ ورنہ طالع آزما اس بند میں شگاف کرنے میں کسی قسم کی مروت کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔اوپر کی سطح پر تبدیلیاں ہی تبدیلیاں ہیں اور نیچے ؟ کیا اب بھی وہی ہم اور وہی غم ہوں گے۔ چہرے بدلنے سے کبھی مقدر نہیں انہیں ڈرائیں بدلتے۔ تبدیلی کا عمل جب تک نچلی سطح تک نہیں جائے گا، عوام کے احساسات وجذبات اسی طرح سلگتے رہیں گے۔ مہنگائی کے ایشو پر اور دوڑائیں نہ، وہ تو پہلے ہی بہت ڈرے ہوئے اور تھکے ہوئے ہیں۔ حالات وواقعات نے انہیں اس قدر ٹچی بنا دیا ہے کہ سوئی کی آواز بھی انہیں کسی دھماکے سے کم نہیں لگتی۔اس کیلئے موجودہ سرکار کو عوام کیلئے "کاروبار" کرنا ہوگا پھر کہیں جا کر ان کا بازار چلے گا۔ان کی مسکراہٹ سے کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ مسکراتے ہوئے چہروں کے دل بہت اداس ہوتے ہیں،ان کے تو خواب بھی کسی عذاب سے کم نہیں ہوتے۔ ہر رات کو شب برأت سمجھنے والوں کو یادوں کی بارات کا کیا پتہ ،انہیں اس کا پہلے سے اندازہ ہو جائے تو وہ آنکھ بند کرنے سے ہی توبہ کر لیں۔ بہت سے لوگوں کی آنکھیں کھلی ہوئی ہوتی ہیں مگر ان کے ضمیر سو رہے ہوتے ہیں۔ایسا بھی ہوتا ہے کہ آنکھیں ہمیشہ کیلئے بند ہو جاتی ہیں مگر ان کی تعبیر جاگتی رہتی ہے۔

بہت سے خواتین و حضرات کو آنکھوں کی "چہل قدمی "کا بڑا شوق ہوتا ہے 'انہیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہوتا کہ آنکھیں بھٹک جائیں یا کہیں اٹک جائیں۔اسی شوق چشم میں وہ بہت سے روگ بھی لگا جاتے ہیں۔ دوسروں کے گھروں میں " نظر اندازی "کرنے والوں کو اپنی چادر و چار دیواری کے اندر بھی دیکھنا چاہئے کہ اس تاک جھانک سے دل پر کیا گزرتی ہے۔ من کا ویسے بھی دھن سے کیا رشتہ ہے۔اسی لئے کہتے ہیں کہ دل نہ بھریں، یہ بھر گیا تو بہت سے سیلاب جسم کو ڈبو دیں گے۔ سیاست میں یہی سیلاب، سونامی بن جاتے ہیں۔ پیارے پاکستان میں بہت سے سیاستدان اقتدار کے بغیر نہیں رہ سکتے اور اسلام آباد ان کے بغیر نہیں رہ سکتا، ہماری بربادی میں ان لوگوں کی آبادی کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ آمریت کے کسی نئے طوفان کیلئے تشدد کو ہوا دی جا رہی ہے۔ جب تک سمجھوتے دل سے نہیں ہوں گے ،اس کیلئے چاہے جتنے مرضی الفاظ جمع کر لیں، کاغذ کورا ہی رہے گا۔ لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ محبت صرف ایک بار ہوتی ہے اور اس کے بعد سمجھوتے ہی چلتے ہیں، جب تک جان ہے، جہان داری تو نبھانی ہی پڑے گی، جس میں ہار جیت چلتی رہتی ہے۔ جیتنے والوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ قوم دکھوں سے ہار رہی ہے۔ آئے دن کوئی ماں اپنے معصوم بچوں سمیت خود کو ٹرین سے کٹوا کر ہمارے سسٹم کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ ہمارے یہاں تو زندہ لوگوں کا حساب نہیں لیا جاتا، مرے ہوئے کس کھاتے میں آئیں گے۔

صرف اگر اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے سخت فیصلے کریں گے تو لوگوں کا ری ایکشن بھی اسی طرح کا سخت ہوگا۔ فیصلے تو تاریخ میں کچھ اس قسم کے بھی رقم ہوئے ہیں۔ جب سکندر مرزا پشاور کے ڈپٹی کمشنر تھے تو ان دنوں وہاں ڈاکٹر خان صاحب کی قیادت میں ایک جلوس نکالا گیا۔ سکندر مرزا نے جلوس کو منتشر کرنے کیلئے پولیس تک طلب نہیں کی بلکہ اس کے راستے میں ٹھنڈے شربت کی سبیلیں لگائیں، گرمی کا موسم تھا، جلوس کے شرکاء جی بھر کر اپنی پیاس بجھاتے رہے۔ شربت میں جمال گوٹہ ملایا ہوا تھا۔ پھر ایک روز جب ڈاکٹر خان صاحب وزیر بن گئے تو سکندر مرزا نے بیوروکریسی کو نصیحت کی کہ "ڈاکٹر صاحب کو خوش رکھنے کا خیال رکھا کرو،اس شخص نے ساری عمر جیل کی ہوا کھائی ہے یا پولیس کے ڈنڈے، ہم اسے بڑی مشکل سے گھیر گھار کر حکومت میں لائے ہیں۔ اب اسے ''گڈ لائف'' کا ایسا چسکا لگاؤ کہ وہ اس پنجرے سے باہر نہ نکل سکے۔" سکندر مرزا کے ری پبلکن پارٹی کے خواب کی تعبیر

ڈاکٹر صاحب کے ہاتھوں ہی ہوئی۔

جب بھی کوئی سرکار گڈ لائف کے پنجرے کی اسیر ہوئی، اس کے نتیجے میں خلقت صرف حقیر ہوئی۔ عوام نے موجودہ سرکار کو بڑی تمناؤں کے ساتھ چنا ہے۔ صرف ماضی کے ہی تذکرے نہ کریں، عوام کے علم میں سب کچھ ہے۔ اب باتوں کی بجائے عمل کر کے دکھائیں، عوام کو دیئے گئے ریلیف سے ہی ان کے گریف ختم ہوں گے۔ انسان کے جذبات ناقابل تسخیر ہوتے ہیں۔ مگر یہ بھی تو سوچیں کہ ان کے درد کے فاصلوں کو کیسے کم کرنا ہے۔ فاصلے تو ایک ہی جسم میں دل و دماغ کے درمیان دشمنی لگا دیتے ہیں۔ ایسے میں دل اپنا نہ دماغ حالانکہ ان کی ورکنگ ریلیشن شپ سے ہی قدم آگے بڑھتے ہیں۔ سرکار کا دعویٰ ہے کہ پہلی بار پیارے پاکستان کو جمہوریت ملی ہے، یہ واقعی مل گئی ہے، لوگ تو تب مانیں گے۔

تمہیں ملنے سے بہتر ہو گیا ہوں
میں صحرا تھا سمندر ہو گیا ہوں

صحرا میں سراب بھی کسی خوبصورت خواب سے کم نہیں دکھائی دیتا، جس کی مرہون منت آنکھیں امید سے "تر بتر" رہتی ہیں۔ امید کسی حال میں بھی نہیں ٹوٹنی چاہئے۔ بصورت دیگر انجام اس عمارت کی طرح کا ہوتا ہے جو لمحوں میں مسمار ہو جاتی ہے۔ امید کو بارود کے ساتھ ساتھ "نمرود" سے بھی بچانا ہوتا ہے کیونکہ یہ زندگی کی سب سے واضح علامت ہوتی ہے۔ یہ وہ سورج ہے جو رات کو بھی روشن رکھتا ہے۔ امید ٹوٹ گئی تو سمجھو کہ قسمت ہی پھوٹ گیا ہے اس گئی۔ اب بھی یہی کہا جا رہا ہے کہ ملکی معیشت کیلئے مزید سخت فیصلے کرنے پڑیں گے۔ بجلی کے اضافی بلوں کے ذریعے دن دیہاڑے جو ڈاکہ ڈالا کے مجرموں کو کیفر کردار پہنچانے میں لیت و لعل سے کیوں کام لیا جا رہا ہے؟ اوپر تبدیلی آ گئی ہے کیا، جو نیچے اسی طرح کے سخت فیصلے ہوں گے؟ گستاخی معاف! اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ صرف چہرے ہی بدلے ہیں۔

بروز بدھ 8 جمادی الآخر 1443ھ 12 جنوری 2021ء

محبت کی سُولی

میری انتہائی سادہ دیہاتی، سفید ان پڑھ ماں عجیب سی باتیں کرتی تھی "دل کی آنکھ سے دیکھ، دل کے کان سے سن" میں نے انہی سے سنا تھا۔ بہت جری اور بہادر، اب تو نئی نسل کی بچیاں چھپکلی اور معمولی سے کیڑوں کو سامنے دیکھ کر اپنے اوسان خطا کر دیتی ہیں اور اپنی چیخوں سے آسمان سر پر اٹھا لیتی ہیں، لیکن کیا مجال کہ رات کا گھپ اندھیرا یا کبھی بادلوں کی کڑکتی گرج چمک سے انہیں کبھی خوف آیا ہو۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ خوف جیسی کوئی شئے بھی ان سے خوفزدہ ہے۔ سفید موتئے کی کلیوں یا گلاب کے پھولوں کو ایک بڑی تھالی میں رکھ کر ان سے باتیں کرنا ان کا ایک معمول تھا۔ میں ان سے کبھی پوچھتا کہ "ماں جی! کیا یہ آپ کی باتیں سنتے ہیں" تو فوراً مسکرا کر فرماتیں کہ "یہ نہ صرف سنتے ہیں بلکہ سمجھتے بھی ہیں، تجھے جس دن ان سے کلام کرنا آ گیا پھر دیکھنا تجھے کسی کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ خفا بھی ہو جاتے ہیں یہ تو..... یہ پودے، درخت اور پھل پھول بہت لاڈلے ہوتے ہیں، بہت پیار چاہتے ہیں، اسی لئے اکثر مائیں اپنی اولاد کو پھول کہہ کر مخاطب ہوتی ہیں۔" میں خاموش رہتا، کچھ سمجھ میں نہ آتا لیکن اب کچھ کچھ سمجھنے لگا ہوں اور شائد یہ انہی کی دعاؤں کا ثمر ہے۔

شوہر کا انتقال ہو گیا تو سب بچوں کی باپ بھی بن گئیں۔ بڑی سی چادر میں لپٹا ہوا رعب دار چہرہ، جس نے گھر کے تمام امور کو خود اعتمادی کے ساتھ سنبھالا دیا۔ کبھی نہیں جھکیں، سماج کو کئی مرتبہ جھکتے دیکھا۔ اپنے شوہر کی طرح مجبوروں کیلئے انکار تو انہوں نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ جہاں سے گزرتیں، لوگ سر جھکا کر سلام کرتے، لمحہ بھر رک کر ان کی خیریت دریافت کرتیں، "بالکل شرم نہ کرنا، کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا" ان کی گفتگو کا یہ آخری جملہ ہوتا اور وہاں سے آگے بڑھ جاتیں۔ سب بچوں کی پڑھائی اور دوسرے معمولات پر مکمل اور گہری نظر، مجال ہے کوئی عمل ان سے پوشیدہ رہ سکے۔ وہ اکثر میرے کپڑے اس انداز اور نزاکت سے دھوتیں کہ ان کو بھی کہیں چوٹ نہ آ جائے۔ میں اکثر ان کے پاس بیٹھ جاتا اور کسی کتاب یا اخبار سے کوئی کہانی قصہ پڑھ کر ان کو سناتا رہتا لیکن اس کہانی یا قصہ پر ان کا تبصرہ سن کر یقین نہیں آتا تھا کہ میری ماں بالکل ان پڑھ ہے۔ ایک دفعہ میں سامنے بیٹھا کچھ سنا رہا تھا کہ اچانک ایک پتھر میری پشت کی طرف دیوار پر دے مارا۔ میں اس اچانک عمل پر خوفزدہ ہو گیا، پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک زہریلا کیڑا تھا جو اس پتھر کی ضرب سے کچلا گیا۔ وہ غضب ناک شیرنی لگ رہی تھیں۔ "ماں جی! اس نے آپ کا کیا نقصان کیا تھا کہ آپ نے اس کا یہ حشر کر دیا"۔ "کچھ نہیں، خاموش رہو" میرے اس سوال پر مجھے سینے سے چمٹا کر بولیں "یہ اگر میرے پھول کو کاٹ لیتا تب کیا کرتی؟" کچھ لوگ بھی بہت معصوم لگتے ہیں لیکن ان میں زہر بھرا ہوتا ہے، ڈس لیتے ہیں پھر بھی ناآسودہ رہتے ہیں" ہاں! یہ میں نے انہی سے پہلی دفعہ سنا اور سیکھا تھا۔ زندگی بھر یہی ان کا عمل رہا، بہت مضبوط اعصاب کی مالک تھیں، ہر دم نبرد آزما..... سماج سے، وقت سے، حالات کے جبر سے۔

ہم سب کو رات جلد سونے کا حکم تھا لیکن خود کب سونے کیلئے جاتی تھیں، کسی کو علم نہیں تھا۔ یہ پتہ ہے کہ صبح چار بجے اٹھ کر گھر کے کام کاج میں مصروف ہو جاتیں تھیں اور سب کو فجر کی نماز پڑھنے اور قرآن کریم کی تلاوت کا اہتمام سختی سے کرواتی تھیں۔ صبح سویرے اٹھ کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ کوئی سارے گھر کی باقاعدگی کے ساتھ نگرانی کر رہا ہے۔ اپنے پالتو کتے کو ہر روز شاباش دیتی کہ ساری رات تم نے کس قدر ذمہ داری سے اپنی ڈیوٹی نبھائی۔ اس سے یوں باتیں کرتیں جیسے وہ اسی ستائش کا منتظر ہے۔ ایک فاصلے پر سر جھکائے کھڑا، کیا مجال کہ اپنی حدود سے تجاوز کرے۔ ایک مرتبہ اس کو سمجھا دیا کہ دہلیز کے اس پار رہنا ہے۔ بس ساری عمر گرمی ہو یا سردی، کوئی بہانہ بنائے بغیر، خاموشی کے ساتھ اپنے فرائض بجالاتا رہا اور اپنی مالکہ کے احکام کی تعمیل کی! مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ سب کچھ میری ماں نے کہاں سے سیکھا ہے جس نے آج تک کسی کتاب کو چھوا تک نہیں، کسی مکتب کو دیکھا تک نہیں

.....یہ کیا اسرار تھا؟اب اس کی جتنی گہرائی میں جاتا ہوں عقل ودانش کے نئے نئے پرت کھلتے جاتے ہیں۔ان کے جملوں کی سادگی میں چھپی حکمت اور حلاوت آج پھر شدت سے محسوس کر رہا ہوں ۔وہی محبت میں گندھی ہوئی ماں،جب بھی لکھنے کیلئے الفاظ کم پڑتے ہیں،فوراً اپنی کسی یاد کے آنچل سے نمودار ہو کر اسی طرح میرا ہاتھ پکڑ کر لکھنا شروع کر دیتی ہے جس طرح بچپن میں تختی پر لکھوانے کی مشق کرواتی تھیں۔

ان کی اپنی ایک کابینہ تھی۔اڑوس پڑوس کی کئی عورتیں اپنے دکھوں کا غم ہلکا کرنے کیلئے موجود رہتی تھیں۔ایک دن میں ان کو یہ کہتے سنا کہ "چھوڑو بہن! ہم سب پچھلی دفع کرواسے،بے غیرت پچاس بھی ہوں تو کیا کرنا،غیرت مند مند تو ایک بھی بہت ہے،جو اپنے گلے کی حفاظت نہ کر سکے وہ چرواہا کیسا"۔ سات دہائیوں سے غزہ پر خوفناک بمباری کے دلدوز مناظر دیکھ رہے ہیں لیکن کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی،صابرہ اور شتیلہ بھی مجھے یاد ہیں،مجھے بوسنیا بھی نہیں بھولا،بھارتی گجرات کا احمد آباد اور کشمیر بھی دل کی دھڑکنوں کو بند کرنے کیلئے کافی ہے،عراق اور افغانستان کا حشر تو ساری دنیا کے سامنے کی زینت.....پھول اور کلیاں خوں میں نہائی ہوئی،معصومیت بیدردی سے قتل ہے۔کیسی کیسی لہو رنگ تصویریں ہیں اخبارات اور الیکٹرانک میڈیا نسل کشی کرنے والے ہنس رہے ہیں،کھیل رہے ہیں انسانیت کے ساتھ۔مہلک ہو رہی ہے،کڑیل نوجوانوں کو درگور کرنے کا سلسلہ اب بھی جاری ہے، ترین ہتھیار استعمال ہوئے،منوں بارود برساتے ہوئے انہوں نے کچھ نہیں دیکھا،آگ وخون کی ہولی کھیل میں مصروف رہے۔وہ کتنے جوش اور تکبر سے کہہ رہا تھا کہ ابھی تو شروعات ہیں،آگے آگے دیکھتا جا"ہاں! قصر سفید اور مغربی آقاؤں کی لونڈی اقوام متحدہ نے تو ہلکی سی مذمت بھی کرنا چھوڑ دی ہے۔دنیا بھر میں ہونے والے مظاہروں کی بھی کسی کی پرواہ نہیں۔وہ کوئی اصول اور کوئی ضابطہ نہیں مانتے۔دنیا بھر کے اصول وضابطے صرف امت مسلمہ کیلئے ہیں۔دنیا بھر میں ایک دو نہیں پورے ستاون ممالک ہیں لیکن.....لیکن کتنے پر سکون ہیں،سو رہے ہیں ان کے حکمران،ان کی افواج،ان کے گولہ بارود کے خزانوں کو زنگ لگ رہا ہے،سب داد عیش دیتے ہوئے اور دنیا بھر کی عیاشی کا ساماں لئے ہوئے.....بے حسی کا شکار اور سفاکی کی تصویر ہمارے مسلم حکمران۔

مجھے آج پھر اپنی ماں یاد آتی ہے،چٹی ان پڑھ،جو کہتی تھی کہ "بے غیرت پچاس بھی ہوں تو کیا کرنا،ہاں غیرت مند ایک بھی بہت ہے" مجھے آج پچاس میں سات کا اضافہ کرنا ہے لیکن وہ غیرت مند ہے کہاں....کیا ایک بھی غیرت مند نہیں رہا.....سب کے سب.....!مجھے آپ سے کچھ نہیں کہنا قارئین!مجھے تو آپ نے پہلے ہی اپنی محبت کی سولی پر لٹکا رکھا ہے۔میں ان سے کیا کہوں!وہ بھی نہیں رہیں گے اور ہم بھی،کوئی بھی تو نہیں رہے گا،بس یہی سوچ کر ندامت سے خاموش ہو جاتا ہوں کہ شائد یہی حق کے علم بردار ہوں جو اپنے ہاتھوں میں اپنے معصوم بچوں کے لاشے بطور علم اٹھائے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں،کوئی بھی تو علم سرنگوں کرنے کو تیار نہیں۔اب تو لاکھوں علم راہ گزاروں میں عزادار اٹھائے نکل آئے ہیں!!!یہ منیر نیازی کیوں تڑپ اٹھے!

سن بستیوں کا حال جو حد سے گزر گئیں

ان امتوں کا ذکر جو رستوں میں مر گئیں
کر یاد ان دنوں کو کہ آباد تھیں یہاں
گلیاں جو خاک و خون کی دہشت سے بھر گئیں
صرصر کی زد میں آئے ہوئے بام و در کو دیکھ
کیسی ہوائیں کیسا نگر سرد کر گئیں
کیا باب تھے یہاں جو صدا سے نہیں کھلے
کیسی دعائیں تھیں جو یہاں بے اثر گئیں
تنہا اجاڑ برجوں میں پھرتا ہے تو منیر
وہ زر فشانیاں ترے رخ کی کدھر گئیں

بروز جمعرات 10 جمادی الآخر 1443ھ 13 جنوری 2021ء

امت مسلمہ کو ایک اور بڑا دھچکا

وقت کی تبدیلی کے ساتھ ''عیسائی صیہونیت'' یا ''کرسچن زائنزم'' کی اصطلاح مقبول ہو رہی ہے، مغرب کے ساتھ امریکا میں جدید پھیلتا ہوا یہ نظریہ میں بھی بہت مقبول ہو رہا ہے جس پر خود امریکی مصنفہ گریس ہال سیل اپنی کتاب ''فورسنگ گاڈس ہینڈس'' (''خوفناک جدید صلیبی جنگ'') میں میڈیا بہت بہت عرصے قبل ہی حیران کن تفصیلی انکشافات کر چکی ہیں۔ اس نے بتایا ہے کہ آج کے دور میں کل کے ''یہودیوں کے خون کے پیاسے عیسائی'' اب آگے بڑھ کر ان سے بھی زیادہ یہود دوست ہو گئے ہیں اور پورا فلسطینی علاقہ یہودیوں کو دینے کے حق میں مسلسل عالمی دباؤ ڈال رہے ہیں جو چوطرفہ بھی ہے۔ ایک طرف وہ اپنے امریکی عیسائیوں کو متاثر کر رہے ہیں تو دوسری طرف کانگریس، سینیٹ، امریکی صدور اور مسلم حکومتوں تک کو دباؤ میں لا رہے ہیں۔ مصنفہ کے کیے گئے انکشافات وہ ہیں جن سے ہماری تمام مسلم حکومتوں کے کان بہت زیادہ کھڑے ہونے چاہییں لیکن افسوس کہ کسی بھی مسلم حکمران طبقے کو مطالعے اور غور و فکر سے دلچسپی ہی نہیں ہے۔ دنیا کے بدلتے ہوئے سنگین حالات اور مسلمانوں کے خلاف تابڑ توڑ مسلط کی جانے والی جنگوں کی اصل وجوہات دریافت کرنے سے وہ بالکل ہی انجان بنے بیٹھے ہیں۔

امریکا میں مسلمانوں کا ایک جدید تحقیقی ادارہ بنام ''اسلاموفوبیا اسٹڈیز سینٹر'' کے نام سے برکلے، کیلی فورنیا میں کام کر رہا ہے۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کو وہ اپنی تحقیقات سے مسلسل چوکنّا اور آگاہ کر رہا ہے کہ غیر مسلم عیسائی و یہودی قوتیں مسلمانوں کے خلاف عرصۂ دراز سے بہت دور رس، بہت تیز اور بہت گہری سازشوں میں مصروفِ عمل ہیں۔ اس لیے ہر سمت اور ہر حکومت سے انہیں بہت محتاط و چوکنّا رہنا ہوگا کیونکہ ان کا ناپاک ارادہ یہی ہے کہ مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے یکسر مٹا دیا جائے۔ ادارے نے بہت دلائل کے ساتھ واضح کیا ہے کہ انہی گہری سازشوں کے باعث بڑھتی ہوئی عیسائی صیہونیت کے ساتھ اب ایک نئی صیہونیت مزید اُبھر کے سامنے آ رہی ہے جس کا نام حیرت انگیز طور پر ان قوتوں نے ''مسلم صیہونیت'' رکھا ہے۔ اس کا آغاز فی الحال مشرقِ وسطیٰ سے ہوا ہے جب تمام مسلم عرب خطے، ماسوائے ایک دو کے، خونی و سیاسی یہودیوں کے آگے گھٹنے ٹیک دیے ہیں۔ اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے کے ساتھ انہوں نے اسی دیگر سہولیات بھی عطا کی ہیں۔ افسوس ناک طور پر اس نئے دائرے میں شامل ہونے کیلئے پاکستان بھی وقتاً فوقتاً پر پُرزے نکالتا رہتا ہے جس کیلئے فیلرس چھوڑے جاتے ہیں تاکہ رائے عامہ کی ذہن سازی کی جا سکے۔ مسلمان اور صیہونیت کے ہمدرد؟ سنتے ہی بہت عجیب سا لگتا ہے لیکن حقیقت یہی ہے۔ ہمارے سامنے یہ صیہونیت مسلسل مصروفِ عمل ہے۔ صیہونیت کے پھیلاؤ کی خاطر یہودیوں کے ساتھ مسلمان بھی اب ان کا ساتھ دیں گے، ہزاروں برس سے موجود مسلم فلسطینیوں کو قتل کریں گے اور قبلۂ اوّل بیت المقدس کو شہید کر کے ان کے ہزار سال قبل مسمار شدہ ہیکل کی تعمیر میں مدد دیں گے۔

مذکورہ تحقیقاتی ادارے نے بتایا ہے کہ جنگِ عظیم اوّل کے بعد جب خلافت عثمانیہ کی بندر بانٹ ہو ہی تھی، تو یروشلم کو برطانیہ کے زیرِ انتظام دے دیا گیا تھا۔ بے تحاشا بمباری ہو رہی تھی اور شہر کے مقدس مقامات کا تحفظ مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ شہر کا چارج لینے والا برطانوی کمانڈر جنرل ''ایڈمنڈ ایلن بی'' یروشلم شہر میں پیدل داخل ہوا اور برسرِ عام اعلان کیا کہ ''آج جا کر صلیبی جنگوں کا خاتمہ ہوا ہے''۔ اس دور کے وزیرِ اعظم برطانیہ ''لائیڈ جارج'' نے یہی بات دہرائی کہ ''آج کے دن برطانوی شہریوں کیلئے یروشلم کی فتح، کرسمس کا ایک بڑا تحفہ ہے''۔ واضح رہے کہ یہ 16 اور 17 دسمبر 1917ء کی بات ہے۔ دوسری طرف ایک اور برطانوی اخبار نے سلطان صلاح الدین ایوبی کے دشمن رچرڈ شیر دل کی تصویر لگائی، جو صیہون کی پہاڑی سے نیچے

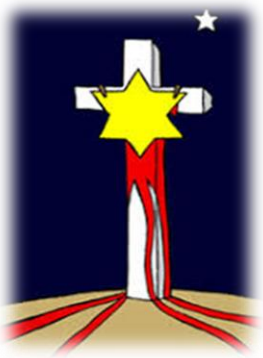

یروشلم شہر کو جھانک رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ ''میرا خواب آج پورا ہو گیا''۔ ادھر برطانوی فوج نے بھی انہی الفاظ کے ایک خفیہ میمو کا اجرا کیا تھا لیکن بعد میں اس سے یہ الفاظ حذف کر دیے گئے تھے، کیونکہ برطانوی افواج میں ایک بڑی تعداد مسلم سپاہیوں اور افسران کی بھی خدمات انجام دے رہی تھی اور برطانیہ کو خدشہ ہوا کہ کہیں ان الفاظ سے فوج میں بے چینی نہ پیدا ہو جائے۔ دوسری طرف گورنر مکہ شریف ہاشمی کو بھی برطانیہ ترکوں کے خلاف جنگ کیلئے مالی امداد دے رہا تھا چنانچہ اسے اس کی جانب سے بھی عدم تعاون کے خطرے کا ادراک ہوا۔ انہی دنوں برطانوی وزارتِ اطلاعات نے یہ بھی انکشاف کیا تھا کہ جن دو کمانڈروں نے ترکی کے اس ''سرینڈر'' میں حصہ لیا تھا، وہ دراصل سابقہ "نائٹس" کی اولاد میں سے ہیں۔ یاد رہے کہ سابقہ دور میں صلیبی شعلے بھڑکانے میں نائیٹس سب سے آگے آگے تھے۔

یاد رہے کہ یہ فتح سیکولر سے زیادہ مذہبی تھی۔ (اسلام کے خلاف مغرب کی جتنی بھی جنگیں لڑی جاتی رہی ہیں یا اب لڑی جا رہی ہیں، ان کے بارے میں کبھی خوش فہمی میں نہیں رہنا چاہیے کہ وہ غیر مذہبی تھیں یا اب وہ مذہبی جذبوں سے تائب ہو چکے ہیں)۔ سو سارا یورپ یروشلم کی اس فتح سے خوش تھا اور یہودیوں کو مکمل تعاون دے رہا تھا، تاکہ وہ یہاں ٹیمپل یا صومعہ بنا سکیں۔ عیسائیوں کا منشا یہ تھا کہ نیا ٹیمپل بنے تب ہی ان کے نبی عیسیٰؑ کی جلد آمد ممکن ہو۔ برطانوی حکومت نے بھی 1917ء میں کنعان سرحدیں بائبل کی روشنی میں طے کر دی تھیں۔

عرب ممالک میں اسرائیل کی قربتیں بہت آگے بڑھ گئی ہیں۔ سفارت خانے کھل گئے ہیں، اسرائیلی جہاز ان کے ہاں اترنے لگے ہیں، یہودیوں کے "کوشر" ریسٹورنٹس کھل گئے ہیں، سنیما اور اسٹیج کنسرٹس رواج پا گئے ہیں۔ ایک سعودی عرب ہی باقی رہ گیا ہے جو حرمین شریفین کی موجودگی کے باعث بہت کھل کر آگے بڑھنے سے رُکتا ہے ورنہ عملاً تو وہ بھی اسرائیل کو قبول کر چکا ہے۔ یہ وہ حکومتیں ہیں جو اَب سے 75 سال پیچھے تک اسرائیل کو مسلسل غاصب اور جارح قرار دیتی تھیں۔ ان کے آبائی حکمرانوں کی تقریریں اسرائیل کے خلاف آج بھی موجود ہیں۔ مصر نے تمام عرب ممالک کی مخالفت کے باوجود 1977ء میں جب اسرائیل کو تسلیم کیا تھا تو عرب ممالک میں اتنی غیرت تھی کہ سب نے مل کر مصر کا بائیکاٹ کیا تھا اور وہ عرصۂ دراز تک عرب دنیا سے کٹا رہا تھا۔ یہی عرب ممالک تھے جہاں یاسر عرفات کی تنظیم اور حماس کے قائدین بھی اپنے دفاتر رکھا کرتے تھے لیکن فضا اب الٹ کر یکسر اسرائیلیوں کے حق میں ایسی چلی گئی ہے کہ اخوان المسلمون کے علاوہ تبلیغی جماعت پر بھی پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ اسرائیل اب ان کا دوست قرار پایا ہے، جبکہ مزاحمتی تحریک حماس مجرم ٹھہری ہے۔ یہی عرب مسلم ممالک اب یہودیوں کی خاطر ''مسلم صیہونیت'' کو بڑھ چڑھ کر فروغ دیں گے، ویسے ہی جیسے پروٹسٹنٹ عیسائی فادرس، بڑھ چڑھ کر اپنے پیروکاروں کو اسرائیل اور مسمار شدہ ہیکل کی تعمیرِ نو کی خاطر مہم چلانے اور مالی تعاون کرنے پر اپنے چینلوں سے اکساتے رہتے اور امریکی حکومت کو اسرائیل کا مسلسل ساتھ دینے کے خطبے اور ہدایات دیتے رہتے ہیں۔ کمال اتاترک کی مانند مسلم دنیا کو یہ ایک اور بڑا دھچکا ہے۔

بروز ہفتہ 12 جمادی الآخر 1443ھ 15 جنوری 2021ء

عدم مساوات کا مشترکہ مسئلہ

دنیا بھر میں عدم مساوت پائی جاتی ہے لیکن دنیا کی دو بڑی طاقتوں امریکا اور چین کو اپنے اپنے معاشرے میں شدید نوعیت کی روز افزوں عدم مساوات کے مشترکہ مسئلے کا سامنا اور شدید الجھنوں کا شکار ہیں۔ ایسا کسی نے سوچا نہیں تھا کہ یہ سب کچھ اس طور واقع ہوگا۔ دونوں بڑی طاقتوں کی دو عشروں کی معاشی نمو سے توقع تھی کہ تمام ہی کشتیاں رواں رکھنے کی راہ ہموار ہوگی۔ امریکا اور چین میں تیزی سے پنپتے ہوئے متوسط طبقے کی بہبود یقینی بنانا جو بائیڈن اور شی جن پنگ کا ترجیحی ایجنڈا رہا ہے۔ دونوں کو اچھی طرح اندازہ ہے کہ اُن کے سیاسی مفادات داؤ پر لگے ہوئے ہیں۔ دونوں ہی کو معاشرے میں عدم مساوات کا گراف نیچے لاکر پریشان حال لوگوں کو زیادہ سے زیادہ بہبود سے ہم کنار کرنا ہے۔ دونوں ممالک کے فرق کو بھی ذہن نشین رکھنا ہوگا۔ امریکا اور چین میں دو مختلف حکومتی سسٹم رائج ہیں میں اور یہ ایک الگ بحث کا موضوع ہے کہ چین میں رائے عامہ کی کچھ وقعت ہے بھی یا نہیں۔ امریکی صدر متوسط طبقے کی بہبود کا نعرہ لگاتے ہیں جبکہ چینی صدر پورے معاشرے کے مشترکہ مفاد کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

جو بائیڈن اور شی جن پنگ بڑی فرمز (بالخصوص ہائی ٹیک) کو کنٹرول کرنا چاہتے ہیں۔ یہ معاملہ غیر معمولی حد تک سیاسی ہو چکا ہے۔ امریکا میں ہائی ٹیک ایریا یعنی سلیکون ویلی اب بھی ڈیموکریٹس کی طرف جھکاؤ رکھتا ہے۔ اس کے باوجود کوشش کی جارہی ہے کہ قومی معیشت کیلئے شناخت کا درجہ رکھنے والے ادارے سیاسی معاملات پر اثرانداز نہ ہوں۔

مشکل یہ ہے کہ بائیڈن اور شی جن پنگ کی اپنی اپنی پالیسیوں کی پریسکرپشنز ایک دوسرے کے یکسر خلاف ہیں۔ بائیڈن چاہتے ہیں کہ مینوفیکچرنگ کی ملازمتیں گھر لائی جائیں۔ شی جن پنگ چاہتے ہیں کہ اندرونِ ملک ملازمتیں پروان چڑھائی جائیں۔ عدم مساوات ختم کرنے کے بائیڈن کے ایجنڈے میں ''سب سے پہلے امریکا'' کا ٹرمپ کا لگایا ہوا نعرہ نمایاں ہے۔ ڈیڑھ دو عشروں کے دوران امریکا کی بہت سی ملازمتیں آؤٹ سروس کردی گئی تھیں یعنی میں بیٹھے ہوئے تربیت یافتہ افراد امریکی اداروں کیلئے کام کررہے تھے اور امریکیوں کو بیروزگاری کا سامنا تھا۔ اب امریکی صدر اس امر کیلئے کوشاں دنیا بھر ہیں کہ ان ملازمتوں کو واپس لایا جائے یعنی امریکیوں کیلئے روزگار کے زیادہ مواقع پیدا کیے جائیں۔

اپنے ملک کے لوگوں کو اوّلیت دینے کیلئے کئے جانے والے اقدامات کہیں نمایاں ہیں اور کہیں چھپے ہوئے۔ بائیڈن انتظامیہ امریکی تجارت اور سرمایہ کاری کو بھی تحفظ فراہم کرنا چاہتی ہے گو کہ بہت سے امریکی سرمایہ کار اس پالیسی سے اتفاق نہیں کرتے۔ یہ متوسط طبقے کو ذہن میں رکھتے ہوئے تیار کی جانے والی خارجہ پالیسی کا حصہ ہے۔

عالمی سیاست و سفارت اور معیشت میں ایک دیرینہ سوال یہ ہے کہ امریکا اور چین میں متوسط طبقے کا فروغ ایک دوسرے کیلئے موزوں اور کارگر ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کے نتیجے میں بھی عالمی سیاست میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ عالمی سیاست میں بھارت کے بعد امریکا اور چین ایسی سب سے بڑی معیشتیں ہیں جن میں سماجی عدم مساوات نمایاں ہے۔ اس سلسلے میں جِنی انڈیکس بروئے کار لایا جاتا ہے، جس میں مکمل مساوات کیلئے صفر اور مکمل عدم مساوات کیلئے ایک ہوتا ہے۔ امریکا کا عمومی اسکور 0ء41، چین کا 0ء47، یورپی یونین کا 0ء38 اور او ای سی ڈی کا اسکور 0ء35 ہے۔ چین کی صورتِ صورتِ حال آبادی میں معمر افراد کی بڑھتی ہوئی تعداد کے باعث زیادہ پریشان کن ہے۔ پھر طبقاتی ڈھانچے کا معاملہ بھی ہے۔ معاملات اندر کی طرف

پلٹ رہے ہیں اور یہ کیفیت ایسی ہے جیسے اہرام کو الٹ دیا جائے۔

2022ء کے موسمِ خزاں میں چینی کمیونسٹ پارٹی کی بیسویں کانگریس سے قبل (جس میں وہ اپنے لیے ممکنہ طور پر صدر کا تاحیات عہدہ چاہتے ہیں) شی جن پنگ نے مشترکہ خوش حالی کا نعرہ دیا ہے۔ وہ ممکنہ طور پر اعلیٰ سطح کی ملازمتوں کیلئے وقت کی وہ پابندی یا قید ختم کرنا چاہتے ہیں جو چیئرمین ماؤزے تنگ نے عائد کی تھی۔

شی جن پنگ کی ٹول کٹ میں بلند شرح والے ٹیکس، زائد آمدن والے شہریوں کی طرف سے قومی خزانے میں زائد عطیات، سماجی بہبود اور تعلیم کے پروگرامات کیلئے زیادہ فنڈنگ، بڑی نجی اجارہ داری کے خلاف سخت پابندیاں اور نئی ٹیکنالوجی تک آسان رسائی شامل ہیں۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہے کہ چین میں فلاحی ریاست کے تصوّر کو وسعت دی جارہی ہے یا نجی کمپنیوں کو قومی تحویل میں لینے کی تیاری کی جارہی ہے۔ شی جن پنگ کی سوچ چینی معاشی نظام میں ایک نئے مرحلے کی نشاندہی کرتی ہے۔ اب کوئی چاہے تو اِسے ریاستی سرمایہ دارانہ نظام کہے یا پھر چینی خصوصیات کا حامل سوشل ازم قرار دے۔ چینی صدر چاہتے ہیں کہ بڑے کاروباری ادارے اپنی مارکیٹ ویلیو میں تھوڑی کمی کردیں۔ اس دوران شی جن پنگ ہاؤسنگ کے شعبے میں تھوڑی سی مہم جُوئی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تاکہ پراپرٹی جائنٹ ایورگرینڈ کے ہاتھوں پیدا ہونے والے بحران کے غبارے سے ہوا نکالی جاسکے۔ ہاں، یہ بات اب تک واضح نہیں کہ معیشت کو نئی سمت دینے کی کوشش میں وہ بحران کس طور ٹالا جاسکے گا، جو امریکا اور اسپین سمیت کئی معیشتوں میں دس پندرہ برس کے دوران ابھرا ہے۔ چینی صدر متوسط طبقے کو مضبوط تر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ طبقہ بھی کم و بیش 40 کروڑ نفوس پر مشتمل ہے۔ وہ اس طبقے کی مجموعی آبادی 2035ء تک 80 کروڑ کرنا چاہتے ہیں۔

جو بائیڈن نے کچھ ایسا ہی ہدف متعین کیا ہے۔ چین میں فرق صرف تعداد کا ہے۔

آسٹریلیا کے سابق وزیراعظم کیون رِڈ چینی اُمور پر خاصی گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ چینی صدر ایسی معاشی کیفیت چاہتے ہیں، جس میں لوگوں کو زیادہ سے زیادہ ملے یعنی وہ ہاؤسنگ اور دوسرے اہم شعبوں میں اجارہ داری کو برداشت کرنے کے موڈ میں نہیں اور وہ ہاؤسنگ سمیت کسی بھی شعبے میں سٹہ بازی کو بالکل پسند نہیں کرتے۔ اُن کے نزدیک یہ سب کچھ محض فرضی معیشت ہے۔ مینوفیکچرنگ، ٹیکنالوجی اور بنیادی ڈھانچے جیسے حقیقی شعبوں میں سٹہ بازی کے خلاف جانے کی سوچ محض چینی صدر اور کمیونسٹ پارٹی کی نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے خیال میں حقیقی معیشت ہی چین کو ہر اعتبار سے عالمگیر برتری دلائے گی۔ یہ بنیادی سوچ ہی سیاست پر بھی اثرانداز ہوگی اور رواں صدی کے دوران امریکا اور چین کے درمیان ٹیکنالوجی کے شعبے میں برتری یقینی بنانے کی دوڑ میں بھی فیصلہ کن کردار ادا کرے گی۔

چین میں حکومت نجی تعلیمی مراکز اور مختلف سطحوں پر پرائیویٹ کلاسز کے خلاف کریک ڈاؤن بھی کررہی ہے۔ اس معاملے میں ''علی بابا'' کے مالک جیک ما کو بھی استثنیٰ حاصل نہیں۔ شی جنگ پنگ تعلیم کے شعبے کو قابو میں رکھ کر اُسے ایک خاص سوچ یا نظریے کے ساتھ چلانا چاہتے ہیں۔ امریکی صدر بھی امریکا میں سماجی بہبود کے پروگرام کے تحت معیشت کا توازن بحال کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے جو ہدف مقرر کیا تھا وہ اب گھٹا کر 1750/ارب ڈالر

محدود کر دیا گیا ہے۔ اس میں مفت تعلیم کی بنیادیں وسیع کرنا، جامعات کے طلبہ کیلئے قرضے نرم بنانا اور چند ملازمین کیلئے کم از کم اجرت میں اضافہ شامل ہیں۔ یہ تمام اقدامات اب حقیقت سے دور دکھائی دے رہے ہیں۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ جو بائیڈن کا سماجی بہبود کا ایجنڈا ری پبلکنز کے حلق سے اتر نہیں رہا کیونکہ اس ایجنڈے کی کامیابی سے ڈیموکریٹس کی پوزیشن مستحکم ہو گی اور جو بائیڈن کے دوبارہ صدر منتخب ہونے کی راہ ہموار ہو سکتی ہے۔ حیرت کی بات اگر ہے تو یہ کہ جو بائیڈن کو خود اُنہی کی پارٹی کے بعض سرکردہ ارکان کی مخالفت کا سامنا ہے۔

عدم مساوات کے خلاف لڑائی اب یورپ میں بھی اہمیت حاصل کرتی جا رہی ہے۔ یہ لڑائی دراصل معاشی اور سماجی ڈھانچے میں تبدیلی کا حصہ بھی ہے۔ اس کے نتیجے میں چالیس سال سے چلا آرہا دولت نواز رویہ کھٹائی میں پڑتا دکھائی دے رہا ہے۔ یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ امریکا اور چین کے صدور کا ایجنڈا ایک ہے لیکن اگر انہوں نے اس ایجنڈے کو کامیابی سے ہم کنار کرنے پر زیادہ توجہ دی تو ان کے درمیان مخاصمت بڑھ جائے گی۔ اس لڑائی میں اب تک تو چینی صدر کامیاب دکھائی دے رہے ہیں کیونکہ امریکی صدر کو محض سیاسی دشمنوں کی طرف سے مشکلات کا سامنا نہیں بلکہ ان کی اپنی سیاسی پارٹی کے لوگ بھی ان کے خلاف کھڑے ہیں۔

بروز اتوار 13 جمادی الآخر 1443ھ 16 جنوری 2021ء

خفیہ اکاؤنٹس کی ہنڈیا

ہم سمجھتے ہیں جس کا چرمی بٹوا نوٹوں سے بھرا ہوا ہو اور اس میں ترتیب سے مختلف رنگوں کے کریڈٹ کارڈ سجے ہوں، وہ ہوتا ہے خوش قسمت۔ شاندار لشکارے مارتی نئی نکور گاڑی اور وردی پہنا ہوا شوفر گاڑی کے آگے اور پیچھے، کھلی گاڑیوں میں شعلہ اگلنے کو تیار چمک دار بندوقیں تھامے مستعد گارڈز، ہٹو بچو کا شور، اور پھر جب صاحب اتریں تو کھٹ سے دروازہ کھولنے والا اور فرمانبردار سر جھکائے ملازم، بہت بڑا مکان جس کے آہنی پھاٹک پر مسلح چوکیدار اور پورے مکان کے چپے چپے کی خبر لیتے متحرک کیمرے، قیمتی سیل فونز ہر دم مختلف سُروں سے اپنی جانب توجہ مبذول کرواتے ہوئے، ڈیل اور کاروباری ڈیل پلاٹوں کے سودے، ڈھیر ساری چیک بکس اور موٹے موٹے رجسٹر جن کے صفحات لین دین کے ہندسوں سے سیادہ ہوں پھر بہت بڑی سی لمبی میز جس پر ہر طرح کی نعمتیں سجی ہوں معدنی پانی کی سربمہر بوتلوں کی قطار، اشتہا انگیز خوشبوؤں سے مہکتا خواب ناک ماحول، نازک سے قیمتی برتنوں سے سجا دسترخوان، سفید نیپکنز اور پھر لین دین کی باتیں کرتے ہوئے لذتِ کام و دہن کی آزمائش، ایسے ہوتے ہیں خوش قسمت۔ خاک بسر لوگ ایسوں کو دیکھ کر خوش قسمت سمجھتے ہیں۔ ان جیسا بننے کی تگ و دو میں ہلکان اور آزردہ رہتے ہیں۔ وہ خود کو بدقسمت سمجھتے ہیں اور آہیں بھرتے ہیں، امیری، غریبی ہم نے معیار بنالیا ہے خوش قسمتی کا، خوش نصیبی کا۔ "انسان کا خیال امیر ہو تو وہ خوش نصیب ہوتا ہے اور اگر خیال غریب ہو تو دولت کی ریل پیل میں بھی بدنصیب"۔

انسان کیلئے سامانِ تعیش و آسائش ضرورت بن کے رہ جاتے ہیں اور دوسرے کیلئے رشتہ جاں اور تارِ نفس کی بقا سے زیادہ کوئی اہم ضروت نہیں ہوتی۔ انسان حریص ہے، انسان ناشکرا ہے، انسان ظالم ہے، انسان مسافر خانے میں ہمیشہ آباد رہنا چاہتا ہے، قبرستان میں کھڑے ہو کر اپنے ہمیشہ رہنے کا بے بنیاد دعویٰ کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس دنیا میں جو آیا اسے واپس جانا پڑتا ہے پھر دعویٰ کیا، قیام کیا، ضرورت کیا! اگر ٹھہرنا مقدم ہو تو رخصت کی کیا ضروت! اور اگر جانا ضرورت ہو تو ٹھہرنے کے منصوبے بے معنی ہیں۔ اگر ظاہری مرتبے قائم رہ جائیں تو انسان اندر سے قائم نہیں رہتا۔ باہر سے خطرہ نہ ہو تو بدن کی چہار دیواری اندر سے گلنا شروع ہو جاتی ہے انسان اپنے بوجھ تلے آپ ہی دب کر رہ جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو خواہشات کی دیواروں میں چنوا تا رہتا ہے اور جب آخری پتھر اس کی سانس روکنے لگتا ہے تو پھر وہ شور مچاتا ہے کہ اے دنیا والو! کثرت، خواہشات سے بچو، کثرت سہولت سے گریز کرو، مال کی محبت سے پرہیز کرو، کثرتِ مال تمہیں غافل کر دے گی۔

مال و دولت کے سہارے حکومتیں کرنے والے بالآخر کارندامتوں اور رسوائیوں کے حوالے کر دیئے گئے۔ دولت عزت پیدا نہیں کرتی، وہ خوف پیدا کرتی ہے، اور خوفزدہ انسان معزز نہیں ہو سکتا۔ غریبی محتاج رہنے کی وجہ سے خالق کے در پر سرنگوں رہتی ہے اور یوں غریبی قربِ حق کا ایک قوی ذریعہ ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسان غریب ہو جائے یا اسے غریب ہی رہنے دیا جائے۔ ایک سماج میں امیر اور غریب کے درمیان جتنا فاصلہ بڑھتا جائے گا، اتنی ہی سماج میں کرپشن بڑھے گی۔ وہ معاشرہ تباہ ہو جائے گا جہاں غریب کو نظرانداز کر دیا گیا۔

غریب ہی امیر کی سب سے بڑی آزمائش ہے۔ غریب سائل ہے اور امیر سخی نہ ہو تو اسے بخیل ہونے کی سزا دی جائے گی۔ غریب حقدار ہے اور اگر اس کو اس کا حق نہ دیا جائے تو حق غصب کرنے والے کو عذاب میں گرفتار کر دیا جائے گا اور عذاب کی انتہائی شکل یہ ہے کہ ان لوگوں کے دل سے دولتِ تسکین نکال لی جائے گی اور یوں ایک امیر انسان پیسے کی فراوانی کے باوجود پیسے کی شدت میں مبتلا ہو کر ایک اذیت ناک زندگی گزارنے پر مجبور ہو گا۔ امیر

آدمی کا خوف غریب کے خوف سے زیادہ ہوتا ہے۔ غریب کے پاس تو پھر بھی اچھا زمانہ آنے کی امید ہو سکتی ہے لیکن امیر کیلئے برے زمانے کے آجانے کا خوف ہمیشہ سر پر تلوار بن کر لٹکتا رہتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں پیسہ نہیں بچا سکتا بدناموں سے، بے عزتیوں سے، دشمنوں سے، موت سے، پھر پیسہ کیا کرتا ہے؟ صرف نگاہ کو آسودہ کرتا ہے اور یہ آسودگی دل کو مردہ کر دیتی ہے، بے حس بنا دیتی ہے اور آدمی کثرتِ مال کے باوجود تنگی خیال میں مبتلا ہو کر اذیت ناک انجام سے دوچار ہو جاتا ہے۔

میرا رب اُس وقت سے بچائے جب مظلوم اور بے زبان خطرہ گویائی کے طلسمات شروع کر دے۔ یہ خطرہ ایوانوں میں زلزلہ پیدا کر سکتا ہے، اس سے پہلے کہ غریب آپے سے باہر ہو اُس کی غریبی کو ٹالنے کی کوشش کی جائے اُس کا خیال رکھا جائے بڑے بڑوں کی بڑی بڑی خدمت کرنے کی بجائے غریبوں کی چھوٹی چھوٹی ضرورت پوری کر دی جائے۔ ان کے کچن سے بھی دھویں اور خوشبوئیں اٹھیں۔ ان کے دستر خوانوں پر بھی اللہ کا شکر ادا کرنے کا موقع موجود ہونا چاہئے۔ غریب کو خدا کیلئے صرف نصیحت اور دوا سے کلمے نہ پڑھاؤ، اس کا دکھ بانٹو، اُس کا غم بانٹو۔ اگر غریب کو مفت دوائی نہ ملی تو تمہارے بڑے بڑے ہسپتال بیمار ہو جائیں گے، تمہارے خزانوں میں کیڑے پڑ جائیں گے، دیمک لگ جائے گی۔ ابھی وقت ہے کہ سوچا جائے، سمجھا جائے ہوش کیا جائے۔ غریب قیمتی سرمایہ ہے بشرطیکہ اسے غریب نہ رہنے دیا جائے۔ کیا ہو رہا ہے ہمارے آس پاس !آپ اور میں روز دیکھتے ہیں کسی غریب کے پاس علاج کے پیسے نہیں ہیں اور اس کی معصوم بچی مر جاتی ہے اور پھر وہ اس کے کفن کیلئے بھیک مانگتا ہے ہم سب مر گئے ہیں کیا؟ ہاں ہم زندہ ہی کب تھے؟

حکومتی وزیر کی عقل پر ماتم کیا جانا چاہئے جن کا ارشادِ عالی ہے: "پاکستان کی خوش قسمتی ہے کہ اس نے آئی ایم ایف سے قرضہ طلب کیا اور کامیابی حاصل کی ہے۔ "یہودی مہاجنوں کے پاس پاکستان کو گروی رکھ کر قرضہ حاصل کرنے کو وہ کامیابی کہتے ہیں۔ وہ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ سود کی لعنت نے ہمیں برباد کر دیا۔ وہ رب سے جنگ کرنے نکلے ہیں۔ میرے رب سے تو کوئی بھی نہیں جیت سکتا۔ یہ جناب علی ہجویری کس وقت یاد آ گئے !اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ حج کے سفر میں تھے۔ ایک آدمی کو قافلے کا امیر بنا دیا گیا۔ راستے میں لٹیروں نے قافلے کو روک لیا اور اپنے سردار کے روبرو پیش کر دیا۔ سردار نے کہا: جو کچھ ہے نکالو۔ سب نے جو کچھ تھا وہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ سردار نے پوچھا: تم نے کچھ چھپایا تو نہیں؟ سب نے کہا: نہیں، اب ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ سردار نے سب کی تلاشی کا حکم دیا تو تلاشی لینے پر امیر قافلہ کی خفیہ جیب سے کچھ اشرفیاں برآمد ہوئیں۔ ڈاکوؤں کے سردار نے کہا: اسے قتل کر دیا جائے۔ جناب علی ہجویری نے مداخلت کی اور کہا: یہ نہیں ہو سکتا، وہ ہمارے امیر قافلہ ہیں۔ جاہل، اجڈ، وحشی ڈاکوؤں کے سردار نے کیسی عجیب بات کہی بولا "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سچے آدمیوں کا امیر جھوٹا ہو !" سالارِ کارواں کیلئے ضروری ہے کہ وہ صادق ہو، امین ہو، جھوٹے سالاروں نے ہی تو ملت کا بیڑہ غرق کر رکھا ہے۔ حیرت ہوتی ہے۔ ذرا اپنی خفیہ جیبیں پہلے ٹٹول لیتے تو اب بیچ چوراہے میں خفیہ اکاؤنٹس کی ہنڈیا تو نہ پھوٹتی۔ وہ تمام افراد یاد رکھیں کہ اگر انہوں نے اپنی خفیہ جیب سے پوشیدہ خزانے نہیں نکالے تو کوئی ان کی جیب سے خود نکال لے گا۔

نیند اک وقفہ بے طلب ہے یہاں حرفِ تعبیر کی جستجو ہے زیاں
چشمِ بیدار کو علم ہے ہر یقیں، ہر گماں صبح تک خواب ہو جائے گا
روشنی کا کٹورا لیے بام تاریک سے زرد سورج نکلنے کو ہے
اور کچھ صبر کر یہ سلگتا لہو میری جاں، صبح تک خواب ہو جائے گا

بروز سوموار 14 جمادی الآخر 1443ھ 17 جنوری 2021ء

خوش حالی یا خسارہ

یہ جو پیسہ ہے ناں کسی کے دماغ میں سما جائے تو مسئلہ کرتا تو ہے لیکن اتنا نہیں کرتا لیکن اگر کوئی دن رات اسی کے خواب دیکھنا شروع کر دے اور مایا کا حصول دماغ میں گھس جائے تو بس مت پوچھیں۔ وہ ایسا ہی ہے جیسے شیشے کے گھر میں بھینسا گھس جائے۔ پھر ہوتا کیا ہے اسے کیا بیان کرنا، آپ تو بہت سمجھدار ہیں، دانا ہیں بینا ہیں۔

وہ میرے ساتھ کالج میں پڑھتا تھا۔ میں تو انجینئرنگ کے مضامین سے دل لگا بیٹھا لیکن وہ کامرس میں چلا گیا کہ اس کا سارا خاندان کاروبار میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے مجھے بھی اپنے ساتھ گھسیٹنا چاہا لیکن میں اس لیے کامرس پڑھ نہ سکا کہ یہ حساب کتاب میرے بس کا روگ نہیں۔ اللہ جی بندے کو خوب جانتے ہیں ناں..... اس نے مجھے آج تک بچائے رکھا ہے۔ یہ حساب کتاب بہت جی دار لوگوں کا کام ہے۔ ایسے لوگوں کا جن میں تحمل ہو، برداشت ہو، صبر ہو، ٹک کر بیٹھنے اور لگ کر کام کرنے کی خو ہو۔ الحمدللہ میرا ان سب سے دور پار کا بھی واسطہ نہیں۔ اچھے اچھے ذہن اس کے سامنے کچھ نہیں بیچتے تھے۔ پڑھائی کا کیڑا ہر وقت ہندسوں کا جوڑ توڑ۔ بہت کم گو اور بہت سادہ۔ میں اکثر اس سے پوچھتا: یہ کیا بیماری ہے تمہیں ہر وقت ایک ہی دھن اور اس کا ایک ہی جواب: کام کرنے دو، پیسہ کمانا ہے مجھے اور وہ بھی بہت سارا۔

کالج سے لاہور چلا گیا، جامعہ پنجاب سے ایم بی اے کیا پھر امریکا چلا گیا اور بس یہی سے راستے بدل گئے۔ پھر ایک دن اچانک شادی کی ایک تقریب میں ملاقات ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد پتہ چل گیا کہ کچھ نہیں بدلا تھا.... پیسہ پیسہ اور پیسہ۔ لاکھ سمجھایا: او بے وقوف سب کچھ تو پیسہ نہیں ہے لیکن وہ پھر کہتا تجھ جیسے غریب کیا جانیں پیسہ کیا ہوتا ہے، تیرے آگے پیچھے تو کوئی ہے نہیں، مجھے تو بہت کچھ کرنا ہے۔ اس کی شادی بھی ایک عذاب مسکراتا اور سے کم نہ تھی۔ ظاہر ہے جب اتنا لکھا پڑھا لڑکا ہو اور کماؤ بھی، خوبصورت بھی تو ہمارا سماج تو بس یہی دیکھتا ہے ناں، اور تو کوئی خوبی نہیں دیکھتا۔ سب خوب سیرت، خوب صورت لڑکیوں کے ہاتھ پیلے ہو گئے لیکن اس کے دماغ میں کچھ اور ہی سمایا ہوا تھا۔

بہت رشتے آئے اس کے لیکن اس کے معیار پر کوئی نہیں اترا۔ باپ تو اس کا بچپن میں ہی فوت ہو گیا تھا لیکن اب اس کی ساری کائنات اس کی والدہ ہی تھی۔ ماں نے بہت کوشش کی کہ اپنے بھائی کی بیٹی کو اپنی بہو بنا لے لیکن یہ نہ مانا کہ اس نے اپنے ننھیال سے بہت زخم کھائے تھے۔ پھر اللہ اللہ کر کے اس کی شادی تو ہو گئی لیکن پہلے چند ہفتوں میں پتہ چل گیا کہ دونوں کے مزاج اور سوچ میں زمین آسمان کا فرق ہے لیکن ماں کی محبت کے سامنے اپنے دل کی بات کہنے کی گستاخی نہ کر سکا اور سوچ لیا کہ ساری عمر نبھا کر کے دکھاؤں گا کہ ماں کو کسی کے سامنے شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔ ملک سے باہر چلا گیا۔ دوستوں نے خبر دی کہ ایک امریکی بین الاقوامی فرم میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہے اور بڑی خوشحال زندگی گزار رہا ہے۔ سن کر اطمینان ہوا کہ شکر ہے جیسا میں سوچ رہا تھا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔

کبھی کبھار دل میں اس کی یاد ستاتی تو ذہن کو جھٹک دیتا کہ جب اس نے ملنے کی کوئی کوشش نہیں کی تو پھر میں اس کو کیوں یاد کروں؟ لیکن پتہ نہیں دل کے کسی کونے سے یہ آواز ضرور سنائی دیتی تھی کہ ایک دن وہ اچانک سامنے مسکراتا ہوا میرے گلے میں بانہیں ڈال کر مجھے آدبوچے گا۔ چینلز کی یلغار اور بہتات نے بھی ایک عجیب تماشہ کھڑا کر دیا ہے کہ کسی ایک چینل پر ہاتھ رکتا ہی نہیں۔ ریموٹ کنٹرول نے ویسے بھی بڑی آسانی پیدا کر دی ہے کہ انگلیوں کے

ہلکے اشارے ساری دنیا کی سیر پر مامور ہیں۔ایک دن جونہی ٹی وی آن کیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک پاکستانی چینل پر اپنی خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ مغرب کی ترقی سے مرعوب زمین آسمان کے ایسے قلابے ملا رہا تھا کہ مغرب کی ایسی تعریف میں نے تو کسی سے نہیں سنی حالانکہ میں خود بھی پچھلی پانچ دہائیوں سے اس معاشرے کے شب و روز کو بہت قریب سے دیکھ رہا ہوں۔

"مغرب نے ایسی عظیم الشان ترقی کی ہے کہ انسانیت نہال ہو گئی ہے،ان کی معیشت مضبوط ہے،ان کے ادارے عظیم ہیں ان کی تہذیب شاندار ہے۔اس کی نقالی کرتی ہے دنیا،وہاں کوئی بھوکا نہیں سوتا،امن کی فاختہ اترائے پھرتی ہے۔ہر طرح کی آزادی ہے،آخر کوئی تو وجہ ہو گی کہ ہمارے لوگ وہاں کا رخ کرتے ہیں۔ہمارا ریجن بالآخر ویسٹ کی ٹرین میں بیٹھے گا لیکن سب سے آخری ڈبے میں،اس لیے کہ اس میں اپیل ہے۔ہماری دنیا کی ساری خوبصورتی مغرب کی دین ہے۔کمپیوٹر کوئی معمولی ایجاد ہے کیا؟اور یہ ساری رعنائی یہ ساری ترقی انہوں نے اس لیے کی ہے کہ وہ مذہب کو چھوڑ بیٹھے ہیں۔وہ مذہب کو ہر جگہ نہیں لاتے،مذہبی جبر نہیں ہے وہاں۔ہم اس لیے ترقی نہیں کر سکے کہ ہم نے ہر جگہ مذہب مذہب کی گردان لگائی ہوئی ہے،مذہب ترقی کا سب سے بڑا دشمن ہے،مذہب انسانیت کی فلاح میں رکاوٹ ہے،مذہب غلامی سکھاتا ہے،آزادی کا ویری ہے مذہب....."۔اور نجانے کیا کیا۔

ذہین اینکر نے سوال تو بہت اچھا اٹھایا تھا کہ اگر مغرب نے اتنی ترقی کر لی ہے،وہاں سب کچھ دستیاب ہے جو تعمیر انسانیت کیلئے از بس ضروری ہے تو پھر وہاں اتنی تنہائی کیوں ہے؟اتنا خلا کیوں ہے؟جنسی آزادی کے باوجود زنا کی کثرت کیوں ہے؟وہاں پھر چھینا جھپٹی کی اتنی وارداتیں کیوں ہوتی ہیں،خود کشی فیشن کیوں بن گئی ہے؟تو جواب میں ارشاد فرمایا:یہ سب انفرادی معاملات ہیں۔وہاں پر دہشتگردی کی وارداتیں غیر ملکی کرتے ہیں،وہاں انسانیت آزاد ہے،وہاں اولڈ ہاؤسز ہیں۔اینکر نے بالآخر ان کی باتوں سے اتفاق کرتے ہوئے یہ مان لیا کہ ہمیں ان کی اچھی چیزیں تو ضرور اپنانی چاہئیں جیسے اولڈ ہاؤسز تو اس نے مسکراتے ہوئے فوری کہا:ان کے اولڈ ہاؤسز کو دیکھئے تو آپ کا دل چاہے گا کہ جوانی میں ہی اولڈ ہاؤسز میں داخل ہو جائیں۔

پروگرام ختم ہوا تو میں سوچ رہا تھا کہ اس نے مغرب کی صفات کا جو ذکر کیا ہے اس میں ایسا کوئی مبالغہ بھی نہیں لیکن اینکر کے چبھتے ہوئے سوالوں نے بھی تصویر کا دوسرا رخ صحیح دکھایا ہے۔خوب سے خوب تر کی تلاش میں انسان اسی طرح بھٹکتا رہتا ہے اور آخر مٹی کے ڈھیر میں جا کر مٹی ہو جاتا ہے۔میں نے اس کے چہرے کی بشاشت اور لہجے کی طمانیت سے یہ اندازہ لگا لیا کہ اس نے زندگی سے معاہدہ کر کے بالآخر پیسے کے بل بوتے پر اپنی دنیاوی منزل پا لی ہے لیکن نجانے کیوں کسی انجانی قوت نے مجھے مجبور کر دیا کہ اس چینل پر فون کر کے اس کا اتہ پتہ معلوم کروں۔میں نے جونہی اس کو ایک خصوصی نام سے بلایا تو ٹیلیفون پر اس کی آواز بھرا گئی اور اس نے فوری طور پر مجھ سے ملنے کی خواہش کا اس طرح ذکر کیا کہ میں باوجود مصروفیت کے تمام کام چھوڑ کر اس کا بے تابی سے انتظار کرنے لگا۔

وہ اس قدر جذباتی ہو کر ملا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے اپنی آنکھوں کے سمندر چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ایک دوسرے کے حال احوال سننے سنانے میں کئی گھنٹے بیت گئے لیکن اس ملاقات میں پتہ چلا کہ میں نے اس کے بارے میں

جو سوچ رکھا تھا وہ بالکل اس کے الٹ نکلا۔ اپنی ازدواجی زندگی کی ناکامی پر بہت دل گرفتہ تھا۔ ایک ہی سانس میں ڈھیر ساری باتیں اس نے اگل دیں جیسے وہ ایک مدت سے میرا منتظر تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ جلد ہی مزاج کے اختلاف کی بناء پر ایک دوسرے کی شکل سے بھی بیزار ہو گئے، جیسے وہ اپنی گفتگو کا بھی حساب کتاب رکھتے تھے۔ یہ کیا بات ہوئی بھلا..... ایسا ہی تھا۔ پھر چار بیٹے اللہ نے عطا فرما دیئے۔ ایک بڑا سا مکان، پیسہ ہی پیسہ لیکن بچوں کی دیکھ بھال پر عدم توجہ کی بناء پر اختلاف میں شدت پیدا ہو گئی۔ چاروں بچے حالات کے رحم و کرم پر اور وہ خود پیسہ کمانے کی مشین بنا ہوا تھا۔ بچوں کے اچھے اسکول کالج کیلئے اخراجات کی تو کوئی فکر نہیں تھی لیکن بیگم کو فیشن اور شاپنگ سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی۔ اکثر شام ڈھلے دونوں گھر پہنچتے، چائے اور کھانے پر ملاقات اور بس ہیلو ہائے۔ پھر اگلے دن کی میٹنگز کی تیاری۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کسی ہوٹل میں قیام ہے جہاں خود ہی اپنے تمام احوال کا خیال رکھنا ہے۔

بسا اوقات ہفتوں ملاقات نہ ہوتی بھلا گھر کے باہمی معاملات کیسے حل ہوتے۔ بچوں کی تعلیم و تربیت پر مشورہ کرنے سے بھی قاصر۔ اسکول کے ہیڈ ٹیچر کا فون آیا کہ وہ میرے بڑے بیٹے کے متعلق کوئی اہم بات کرنا چاہتا ہے جس کیلئے مجھے اسکول آنا پڑے گا۔ اہلیہ کو فون کیا تو پتہ چلا کہ اسی نے ہیڈ ٹیچر کو میرا فون دیکر بلانے کا کہا تھا کیونکہ اسے اپنی ایک خاص سہیلی کی شادی میں شرکت کیلئے جانا ہے۔ میں نے بیٹے کے مستقبل کا جب احساس دلایا تو اس نے بڑے تلخ انداز میں جوابی وار میں مجھے بھی اپنی اولاد کے ان گنت فرائض یاد دلا دیئے۔ اس کج بحثی سے بچنے کیلئے فوری طور پر اپنے سارے کام چھوڑ کر سینکڑوں میل دور سے بھاگا ہوا پہنچا کہ بڑے بیٹے کے مستقبل کا معاملہ تھا جن کیلئے میں شب و روز اپنی جان کھپا رہا تھا۔

بالآخر ہیڈ ٹیچر سے ملاقات پر عندیہ کھلا کہ بڑا بیٹا پڑھائی میں دل لگانے کی بجائے زیادہ تر خاموش اور کھویا ہوا رہتا ہے اور تعلیمی ٹیسٹ میں بھی عدم دلچسپی کی بناء پر نتائج غیر تسلی بخش کی طرف گامزن ہیں جبکہ اس سے پہلے وہ کلاس میں ہونہار بچوں میں شمار ہوتا تھا اب اسکول کی سپورٹس سے بھی جی چراتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ کسی انجانے خوف کی وجہ سے پریشان ہے۔ کیا آپ کے گھر میں کوئی ایسا معاملہ چل رہا ہے جس کی بناء پر اس بچے کی یہ حالت ہو گئی ہے؟ ہیڈ ٹیچر کی گفتگو مجھے کسی اندھے غار میں دھکیل رہی تھی اور میری حالت ایسی تھی کہ کاٹو تو جسم میں لہو نہیں۔ میری حالت غیر ہوتے دیکھ کر ٹیچر نے میرے سامنے پانی کا گلاس بڑھا دیا اور باوجود میرا گلا سوکھ رہا تھا لیکن میں خود میں اتنی طاقت محسوس نہیں کر رہا تھا کہ گلاس کو اپنے لبوں تک لا سکوں۔ میں جو خود کو بڑی سی بڑی مشکل کو چند منٹوں میں حل کرنے کا فن جانتا تھا، میٹنگز میں اپنے کلائنٹس کو اپنی گفتگو سے مسحور کر کے اپنی مرضی کے شیشے میں اتار لیتا تھا، یہاں میرے الفاظ میرے حلق سے باہر نہیں آ رہے تھے کیونکہ میں اپنے بیٹے کے استاد کو اپنے گھر کے حالات سے کیسے آگاہ کرتا کہ اس بربادی میں اس بچے کا نہیں بلکہ بے جوڑ شادی کے بعد ماں کا اس مغربی کلچر کا فائدہ اٹھانا ہے کہ یہاں کی مادر پدر آزادی نے اسے اس قدر دلیر کر دیا ہے کہ بات بات پر بچوں کے سامنے الجھنا اس کا محبوب مشغلہ بن چکا ہے اور اپنی بیجا فرمائشوں اور نت نئے ماڈرن فیشن کیئے اسے ہر مہینہ ایک وافر رقم درکار ہوتی ہے۔ اگر اسے اخراجات پر نظر ثانی کیلئے کہا جائے تو آسمان سر پر اٹھا لینا اس کا وطیرہ بن چکا ہے اور مجھے بچوں کے سامنے ہونے والی لڑائی سے بچنے کیلئے مجبوراً اس کے مطالبات پر سر جھکانا پڑتا ہے اور اسی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آج حالات اس نہج پر پہنچ گئے کہ میرا بیٹے کا مستقبل تباہی کی طرف چل نکلا ہے۔

میں نے ہیڈ ٹیچر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس سے وعدہ کیا کہ میں خود اپنے بیٹے سے بات کر کے اس شکائت کا حل نکالوں گا۔ اس کے بعد میں نے حتی المقدور اپنے بچوں کے ساتھ وقت گزارنے کی کوشش کی کیونکہ میں جانتا تھا کہ برا بیٹا گاڑی کے انجن کے مصداق ہوتا ہے اور باقی اس کے چھوٹے بھائی اس گاڑی کی بوگیوں کی مانند ہوتے ہیں۔ اگر خرابی پر قابو نہ پایا گیا تو زندگی کی کامیاب ٹرین پٹری سے نہ صرف اتر جائے گی بلکہ ناقابل تلافی نقصان پہنچائے

گی۔ میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ بیوی کو لاکھ سمجھانے کے باوجود اس کے مزاج میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی لانے میں کامیاب نہ ہو سکا لیکن بچوں پر میری پوری توجہ ان کی تعلیم و تربیت اپنے سیدھے ٹریک پر آ گئی۔

دوران ملازمت کبھی میں ملک سے باہر تو کبھی بیگم اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کے ساتھ دوسرے شہر چلی جاتی، یہ تھی زندگی۔ کسی کو بخار ہے، کسی کو کھانسی ہے، کسی کی سالگرہ کا دن گزر گیا اور وہ انتظار کرتا رہ گیا، اکثر شکایت کرتے: اسکول کی تقریب تھی لیکن ممی پپا آپ دونوں نہیں آئے۔ جوں جوں بچے بڑے ہوئے، تو اب انہوں نے ہم سے شکائت کرنا ہی چھوڑ دیا بلکہ ہم سے کوئی بات ہی نہیں کرتے تھے۔ تنہائی کا شکار معصوم بچے۔ وقت تو کبھی نہیں رکتا۔ بہتا دھارا ہے وقت۔ پل گزر گیا بس گزر گیا آپ اسے امر کر سکتے تھے، نہیں کیا۔ کتنا خسارہ ہو گیا، ایسا خسارہ جس کا گوشوارہ بھی نہیں بن سکتا۔ ہم پاگل لوگ جذبات کو بھی ڈیبٹ کریڈٹ کرتے رہتے ہیں۔ ان کی بھی جمع تفریق کرتے رہتے ہیں..... نہیں وقت کبھی نہیں رکتا۔ ماں نے بھی اپنے رب کے پاس جانے میں بہت جلدی کی اور میرے پاس رونے کیلئے نہ ہی کوئی کندھا اور نہ کوئی گود بچی جہاں اپنے دکھ غم کو ہلکا کر سکوں۔ بس وہ دن آن پہنچا کہ ہمارے درمیان قانونی طور پر علیحدگی ہو گئی اور میں خالی ہاتھ اس گھر سے اس طرح رخصت ہوا کہ ماسوائے تن کے دو کپڑوں کے اور کچھ میرے پاس نہ تھا۔

لیکن ٹی وی پر مغرب کی جو تعریف..... اس نے میرے بات کاٹتے ہوئے کہا "مجھے میری زندگی کے اصولوں نے ایسا دھوکہ دیا ہے کہ اب اس تصنع کے دھوکے ہی زندگی کا سرمایہ بن گئے ہیں۔ میرے پاس دھن دولت کی اب بھی کمی نہیں لیکن مغرب میں مجھ جیسے بہت سے لوگ دھن دولت ہونے کے باوجود قلاش ہیں۔ چھوڑیں باقی باتیں میرے کانوں میں ایک جملہ سیسے کی طرح اتر گیا "یار بچے تو سب اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنے بہترین مستقبل کی طرف گامزن ہیں لیکن زندگی کا سب سے بڑا خسارہ یہ ہوا ہے کہ اب تو بچے ہمیں اپنے ماں باپ ہی نہیں سمجھتے، میں نے کیا کچھ نہیں کیا ان سب کیلئے"۔ تم نے بھی تو سب کچھ پیسے کو سمجھ لیا تھا ناں..... میں اس کی بھیگی ہوئی پلکیں اب تک نہیں بھول پایا۔ مجھے آپ سے کچھ نہیں کہنا کہ مغرب کی ایک یہ تصویر بھی آپ کو دکھانا تھی۔ کچھ بھی تو نہیں رہے گا بس نام رہے گا میرے رب کا۔

جو جھوٹ بول کر مطمئن کرتا ہے سب کو
وہ جھوٹ بول کر خود مطمئن نہیں ہوتا

بروز منگل 15 جمادی الآخر 1443ھ 18 جنوری 2021ء

وقت اب آن پہنچا ہے

چنگیز خان سے کسی نے سوال کیا کہ تم نے آدھی دنیا کو تاخت وتاراج کیا، تمہارے سپاہی جب کسی شہر پر حملہ کرتے تو ظلم وستم کی انتہا کر دیتے، جیتنے کی سرشاری میں بوڑھوں پر تشدد کرتے، بچوں کو ذبح کرتے اور عورتوں سے زیادتی کے بعد گھروں سے تمام اشیاء لوٹ کر انہیں آگ لگا دیتے۔ تم تو اس قدر ظالم تھے کہ ایک دفعہ کسی شہر میں فتح کے بعد تمہیں علم ہوا کہ کچھ لوگوں نے اپنے آپ کو لاشوں کے ڈھیر میں چھپا کر زندہ بچ جانے کی کوشش کی تھی تو تم نے انہیں ڈھونڈ نکالنے کا حکم دیا اور ان کے سر قلم کروا دیئے لیکن اس کے بعد تمام منگولوں کو یہ حکم دے دیا گیا کہ ہر مارے جانے والے کا سر قلم کر دیا جائے تاکہ زندہ اور مردہ کی شناخت ہو سکے۔ خود تمہارا قول ہے کہ مجھے اپنے دشمنوں کو نیست ونابود کرنا، ان کو اپنے قدموں میں گرتے دیکھنا، ان کے گھوڑے اور ساز وسامان چھین لینا اور ان کی عورتوں کے نوحے اور بین سننا میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے لیکن سوال کرنے کہاہاں والے نے پوچھا کہ تمہاری زندگی میں کبھی کوئی ایسا موقع بھی آیا کہ تمہیں کسی پر ترس آیا ہو، تم نے رحم کھایا ہو۔ چنگیز نے اثبات میں سر ہلایا اور ایک دفعہ ایک شہر کو لوٹنے کے بعد جب میں وہاں سے نکل رہا تھا تو میرے خوف سے عورتیں اپنے بچوں کو گود میں لئے بھاگ رہیں تھیں کہ اچانک ایک عورت کا شیر خوار بچہ اس کے ہاتھوں سے دریا میں گر گیا اور اس نے دردمندانہ طریقے سے رونا پیٹنا شروع کیا کہ مجھے اس پر ترس آگیا۔ میں نے اس بچے کو دریا میں سے اپنے نیزے پر اچھالا، نیزہ اس کے جسم کے آر پار ہو گیا اور پھر میں نے اسے روتی ہوئی ماں کے حوالے کر دیا۔

ظالموں کا جذبۂ رحم ایک اور لمحے میں بھی ابھر کر سامنے آتا ہے جب لاشوں کے انبار میں انہیں اپنے سب سے پیارے شخص کی لاش نظر آجائے۔ تیمور جو شہروں کو فتح کرتا تو اپنے ظلم کی نشانی کے طور پر مرنے والوں کی کھوپڑیوں کو اکٹھا کرتا اور ان کے مینار بنواتا، پھر ان پر انہی انسانوں کی چربی کا لیپ کرواتا اور رات کو ان کھوپڑیوں کو آگ دکھا کر روشن کیا جاتا کہ دور دور تک لوگوں کو علم ہو سکے کہ تیمور نے یہ شہر فتح کر لیا لیکن اس کی آپ بیتی پڑھی جائے تو ایک مقام ایسا آتا ہے جب وہ پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ دیواروں سے سر ٹکراتا رہا، لاشوں کے انبار کو دیکھ کر بین کرتا رہا۔ اس سے کچھ بن نہیں پا رہا تھا۔ بس سپاہیوں کو اکٹھا کیا اور کوچ کا حکم دے دیا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب دلی میں کشت وخون جاری تھا کہ اس کے سامنے اس کے چہیتے اور لاڈلے بیٹے کی لاش لائی گئی۔

ظالموں اور ان کی فوج کے سپاہیوں کے دل پتھر کے نہیں ہوتے لیکن ان کے مفادات اور حکم نامے انہیں پتھر کا بنا دیتے ہیں۔ ان تک چونکہ کوئی تلوار، کوئی گولی، کوئی بم نہیں پہنچ رہا ہوتا اس لئے انہیں یقین سا ہونے لگتا ہے کہ موت ان کے دروازے پر دستک نہیں دے گی۔ وہ اور ان کے پیارے اسی طرح بربریت اور ظلم کے مقابلے میں اٹھنے والی نفرت سے بچتے رہیں گے لیکن پھر بھی اگر چنگیز خان کے سپاہیوں سے لیکر آج تک کے میدان کارِ زار کے کہنہ مشق انسانوں کو دیکھیں تو ان کے اندر جیتا جاگتا انسان انہیں ظلم پر سرزنش ضرور کرتا رہتا ہے، انہیں چین کی نیند نہیں سونے دیتا۔ انہیں مدتوں ضمیر کی ملامت کا شکار ضرور کرتا ہے۔ میرے سامنے اس وقت موجودہ دور کے چنگیز، تیمور اور ہلاکو کی نعم البدل امریکی فوج کے ادارے پینٹاگون کی ایک رپورٹ ہے جس میں انہوں نے عراق اور افغانستان میں کام کرنے والے فوجیوں کیلئے کچھ سکون بخش ادویات لازم قرار دی ہیں۔ یہ ادویات مستقل طور پر 29 فیصد فوجی استعمال کر رہے ہیں جبکہ 78 فیصد فوجی اپنی ذہنی بیماری اور نفسیاتی بے سکونی کیلئے ماہرین دماغی امراض سے علاج کروا رہے ہیں۔

ان سپاہیوں کی کہانیاں اور مرض کی وجوہات بہت ملتی جلتی ہیں۔ مثلاً انہیں حکم ملا کہ فلاں گھر میں دہشتگرد چھپے ہوئے ہیں، انہوں نے بمباری کر کے گھر کو نیست و نابود کر دیا۔ اندر گھسے تو چاروں جانب بچوں کے کھلونے، گڑیاں، گھر کا ساز و سامان اور ننھے ننھے جسموں کے پرخچے ملے۔ ان میں کوئی تو کئی راتوں تک سو نہ سکا اور کسی کو فوری طور پر ذہنی بریک ڈاؤن ہو گیا۔ رپورٹ کے مطابق 374 سپاہیوں اور آفیسرز نے اس ذہنی کرب اور ضمیر کی اذیت سے چھٹکارا پانے کیلئے خودکشی کی۔ ان میں سے آدھے ایسے تھے جو مستقل دوائیاں لے رہے اور "زولوفٹ" یہ دوایسی مسکن دوائیاں ہیں جو یہ سپاہی مستقل کھاتے ہیں اس ذہنی اذیت کے علاج کیلئے تھے۔ "پروزیک" لیکن پھر بھی ان کی آنکھوں کے سامنے سے لٹے پٹے، اجڑے اور تباہ شدہ ملبوں میں معصوم بچوں اور عورتوں کی لاشیں نہیں بھول پاتیں۔

مجھے یہ رپورٹ پڑھنے کے بعد نجانے کیوں جولائی 2007ء کی وہ ظالم و سفاک صبح یاد آگئی جب لال مسجد میں رات بھر بم برسانے، فاسفورس کی بوچھاڑ کرنے، گولیوں سے جسم چھلنی کرنے والے ان فاتح نوجوانوں کا بہادری کا معرکہ یاد آگیا کہ جب وہ اندر داخل ہوئے ہوں گے تو ہو سکتا ہے انہیں کہیں ماں سے لپٹی ہوئی کسی معصوم بچی کی لاش ملی ہو، جامعہ حفصہ کے کسی کمرے میں خوف میں دبکی آپس میں چمٹی ہوئی ننھی ننھی بچیوں کی لاشوں کا ڈھیر نظر آیا ہو، کسی باورچی خانے میں اوندھے برتن اور ٹوٹے گلاس ہوں، کسی کی ماں کا جلا ہوا خط ہو، کسی کی پھٹی ہوئی ڈائری، کسی کا اپنے ہاتھوں سے کروشیئے کی کڑھائی ہو۔ وہ ان سب کو روندتے ہوئے کیسے گزر گئے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے انہیں اپنے گھروں میں ہنستی کھیلتی، مسکراتی، باپ کو فرمائشوں کے والا حجاب یا چادر خط لکھتی بچیاں تو ضرور یاد آئی ہوں گی لیکن انہیں ضبط کے اس عالم میں اس سارے ملبے کو صاف کرنا پڑا۔ کوڑے کے ڈھیر کی طرح سب کچھ ایک جانب اکٹھا کرنا پڑا، وہ سب ثبوت تلف کرنے پڑے لیکن اس سارے واقعے کا کوئی مقدمہ دائر نہیں ہوا لیکن ان یتیم و بے آسرا بچیوں کی آہ و بکا سے ایک ایف آئی آر تو درج ضرور ہوئی ہو گی اور اسے ایک خاص دن تک کیلئے سیل کر دیا ہو کہ اس کا حساب تو دینا ہو گا لیکن یہ سب مناظر ان کے ذہنوں پر تو نقش ہوں گے۔ کاش کوئی جا کر ان سے پوچھے کہ کون کیسے جی رہا ہے، کس سے علاج کروا رہا ہے، کون سی دوا استعمال کر رہا ہے لیکن اس سب سے دور قمقموں کی روشنی میں حکم دینے والا، مکے لہرا کر قوم کو ڈرانے والا مفرور جو آج بھی سمجھتا ہے کہ کوئی بندوق کی گولی یا کوئی بم اس تک نہیں پہنچ سکتا بلکہ آج بھی بڑے تفاخرانہ انداز میں ٹی وی پر اس بہادری کا اعتراف کر رہا ہے۔

مجھے ایک اور وقت بھی یاد آرہا ہے جب گیارہ ستمبر کے بعد پاکستان کے بہت سے نوجوان افغانستان میں امریکی فوجوں کا مقابلہ کرنے کیلئے چل کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں ایوان صدر میں بیٹھے ہوئے ایک انتہائی اہم شخص کا بیٹا اور پنجاب کی ایک مقتدر شخصیت کا صاحبزادہ بھی شامل تھا۔ پوری رات وزارت داخلہ کی ذمہ داری تھی کہ سرحدیں سیل کر کے انہیں واپس لایا جائے۔ صبح تک دونوں کو اپنے گھروں میں واپس لوٹا دیا گیا تھا۔ اگر لال مسجد کی راہداریوں میں کسی ایسی ہی بڑی شخصیت کا صاحبزادہ یا صاحبزادی ہوتی تو میں دیکھتا کہ کیسے رحم، ترس اور انسانیت کوٹ کوٹ کر بھر جاتی، کون تھا جو کہتا کہ جو ہے کر گزرو، بے شک میرا بیٹا ہی زد میں کیوں نہ آجائے؟ مذاکرات ہوتے، راتیں جاگی جاتیں، ایسے لمحے کسی شوکت عزیز کو بلیو ایریا میں قلفی کھانے کی ہمت نہ ہوتی۔

اگر تیمور کی زندگی میں ظلم کے انجام کی تصویر اپنے بیٹے کی موت کی صورت میں ظاہر ہو سکتی ہے، امریکا کی فوج کی 78 فیصد نفری عراق و افغانستان میں نفسیاتی علاج پر مجبور ہو سکتی ہے تو اس دھرتی اور اس ملک پر کسی اور رحمن و رحیم کی بادشاہی نہیں؟ وہ تو صرف مہلت دیتا ہے اور اس مہلت کی مدت کے ختم ہونے کا انتظار کرتا ہے۔ پھر نہ معافی کام آتی ہے، نہ رونا دھونا۔ پھر بددعاؤں، آہوں، سسکیوں، چیخوں اور مظلوموں کی فریادوں کی قبولیت کا راج شروع ہو جاتا ہے۔ بس اس وقت کا انتظار ہے اور لگتا ہے کہ وہ وقت اب آن پہنچا ہے۔

بروز جمعرات 17 جمادی الآخر 1443ھ 20 جنوری 2021ء

ریکوڈک: معدنیات کا شوکیس

ریکوڈک ایران اور افغانستان سے طویل سرحد رکھنے والے صوبے بلوچستان کے ضلع چاغی میں واقع ہے۔ بعض رپورٹس کے مطابق ریکوڈک کا شمار پاکستان میں تانبے اور سونے کے سب سے بڑے جبکہ دنیا کے چند بڑے ذخائر میں ہوتا ہے۔ ریکوڈک کے قریب ہی سیندک واقع ہے جہاں ایک چینی کمپنی ایک دہائی سے زیادہ عرصے سے تانبے اور سونے کے ذخائر پر کام کر رہی ہے۔ تانبے اور سونے کے دیگر ذخائر کے ساتھ ساتھ چاغی میں بڑی تعداد میں دیگر معدنیات کی دریافت کے باعث ماہرین ارضیات چاغی کو معدنیات کا "شوکیس" کہتے ہیں۔

حکومت بلوچستان نے یہاں کے معدنی وسائل سے استفادہ کرنے کیلئے ریکوڈک کے حوالے سے 1993 میں ایک امریکی کمپنی بروکن ہلز پراپرٹیز منرلز (بی ایچ پی ایم) کے ساتھ معاہدہ کیا۔ یہ معاہدہ بلوچستان ڈیولپمنٹ کے ذریعے امریکی کمپنی کے ساتھ جوائنٹ وینچر کے طور پر کیا گیا تھا۔ چاغی ہلز ایکسپلوریشن کے نام سے اس معاہدے کے تحت 25 فیصد منافع حکومت بلوچستان کو ملنا تھا۔ اس معاہدے کی شقوں میں دستیاب رعایتوں کے تحت بی ایچ پی ایم نے منکور کے نام سے اپنی ایک سسٹر کمپنی قائم کر کے اپنے حصص اس کے نام منتقل کیے تھے۔ منکور نے بعد میں اپنے شیئرز ایک آسٹریلوی کمپنی ٹھیتیان کاپر کمپنی (ٹی سی سی) کو فروخت کر دیئے۔ نئی کمپنی نے علاقے میں دریافت کا کام جاری رکھا جس کے دوران یہ بات سامنے آئی کہ ریکوڈک کے ذخائر معاشی حوالے سے سود مند ہیں۔ بعد میں کینیڈا اور چلی کی دو کمپنیوں کے کنسورشیم نے ٹی سی سی کے تمام شیئرز کو خرید لیا۔ اب سوال یہ ہے کہ ٹی سی سی اور حکومت بلوچستان کے درمیان تنازع کب پیدا ہوا؟

ریکوڈک کے حوالے سے بلوچستان کے بعض سیاسی حلقوں میں تحفظات پائے جاتے تھے۔ ان حلقوں کی جانب سے اس رائے کا اظہار کیا جاتا رہا کہ ریکوڈک کے معاہدے میں بلوچستان کے لوگوں کے مفاد کا خیال نہیں رکھا گیا۔ اس معاہدے کو پہلے بلوچستان ہائی کورٹ میں چیلنج کیا گیا مگر ہائی کورٹ نے اس حوالے سے مقدمے کو مسترد کر دیا اور بعد میں ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ سے رجوع کیا گیا۔ سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کی سربراہی میں ایک بینچ نے قواعد کی خلاف ورزی پر ٹی سی سی کے ساتھ ہونے والے معاہدے کو کالعدم قرار دے دیا۔ سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد ٹی سی سی نے مائننگ کی لائسنس کے حصول کیلئے دوبارہ حکومت بلوچستان سے رجوع کیا۔ اُس وقت کی بلوچستان حکومت نے لائسنس کی فراہمی کیلئے یہ شرط رکھی تھی کہ کمپنی یہاں سے حاصل ہونے والی معدنیات کو ریفائن کرنے کیلئے بیرون ملک نہیں لے جائے گی۔ حکومت کی جانب سے چاغی میں ریفائنری کی شرط رکھنے کے ساتھ ساتھ بلوچستان کے حصے کو بھی بڑھانے کی شرط بھی رکھی گئی۔

سیندک پراجیکٹ سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہ ملنے کے باعث حکومت بلوچستان کی جانب سے یہ شرائط بلوچستان کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کیلئے رکھی گئی تھیں۔ کمپنی کی جانب سے ان شرائط کو ماننے کے حوالے سے پیشرفت نہ ہونے اور محکمہ بلوچستان مائننگ رولز 2002 کی شرائط پوری نہ ہونے کے باعث معدنیات کی لائسنس دینے والی اتھارٹی نے نومبر 2011 میں ٹی سی سی کو مائننگ کا لائسنس دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس فیصلے کے خلاف ٹی سی سی نے سیکرٹری مائنز اینڈ منرلز حکومت بلوچستان کے پاس اپیل دائر کی تھی جسے سیکرٹری نے مسترد کر دیا تھا۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ ٹھیتیان کاپر کمپنی کینیڈا کی بیرک گولڈ اور چلی کی انٹافگوستا کمپنی کا ایک جوائنٹ وینچر تھا۔ نواب اسلم رئیسانی کے دور حکومت (2008 سے 2013) میں مائننگ کا لائسنس نہ ملنے پر ٹی سی سی نے ثالثی کے دوبین الاقوامی فورمز سے رجوع کیا تھا جن میں سے انٹرنیشنل سینٹر فار سیٹلمنٹ آف انسویٹمنٹ

ڈسپیوٹس (ایکسڈ) نے کمپنی کے حق میں فیصلہ دیتے ہوئے پاکستان کو مجموعی طور پر 6/ارب ڈالر کا جرمانہ عائد کیا تھا چونکہ اس خطیر رقم کی ادائیگی پاکستان کی موجودہ معاشی حالات میں کسی طرح ممکن نہیں اس لیے حکومت نے ٹی سی سی کے شراکت داروں سے مذاکرات کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ان مذاکرات کے دوران شراکت داروں میں سے بیرک گولڈ بعض شرائط کے تحت دوبارہ منصوبے پر کام کرنے کیلئے آمادہ ہوا جبکہ دوسری کمپنی اس کیلئے تیار نہیں۔ یہاں اس کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ بیرک گولڈ کن شرائط پر آمادہ ہوا اور اس سے پاکستان کو کیا ریلیف ملے گا؟ ممبران اسمبلی کو دی گئی بریفنگ کے مطابق جرمانے کے 6/ارب ڈالر میں سے تین، تین ارب ڈالر دونوں شراکت داروں کے حصے میں آنے تھے۔انٹافوگسٹا کمپنی چاہتی ہے کہ اسے اس کے جرمانے کی رقم کی ادائیگی کی جائے چونکہ اس رقم کی ادائیگی بھی ممکن نہیں جس پر بیرک گولڈ سے کہا گیا کہ وہ نئے معاہدے کے تحت دوسرے شراکت دار کے حصے کی رقم کی ادائیگی اپنے ذمہ لے کہ بیرک گولڈ اپنے حصے کی جرمانے کی رقم نہیں مانگے گی اور دوسرے شراکت دار کی 3/ارب ڈالر کی ادائیگی اپنے ذمے لینے پر آمادگی کا اظہار کیا تاہم اس کے نتیجے میں حکومت پاکستان سے ٹیکسوں کی مد میں رعایتیں مانگی ہیں۔

بلوچستان اسمبلی کے اراکین کی جانب سے یہ شرط سامنے آئی ہے کہ بلوچستان کے جو ٹیکسز بنتے ہیں ان میں کوئی رعایت نہیں دی جائے تاہم وفاقی حکومت اپنی ٹیکسوں میں رعایت دے۔ منصوبے میں 50 فیصد سرمایہ کاری کی بنیاد پر منافع میں سے 50 فیصد بیرک گولڈ کو ملے گا۔ اگر حکومت بلوچستان سرمایہ کاری کا بقیہ 50 فیصد دینے پر آمادہ ہوئی تو منافع کا بقیہ 50 فیصد حکومت بلوچستان کا ہوگا اگر حکومت بلوچستان کیلئے سرمایہ کاری ممکن نہیں ہوئی تو بقیہ 50 فیصد کی سرمایہ کاری وفاقی حکومت کرے گی۔ دوسری صورت میں کسی سرمایہ کاری کے بغیر بقیہ 50 فیصد منافع میں سے 25 فیصد بلوچستان اور 25 فیصد حصہ وفاقی حکومت کا ہوگا۔ معاملہ آگے بڑھانے سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ نئے معاہدے کے تحت بلوچستان کو ریکوڈک سے مجموعی طور پر کتنی آمدن ملنے کی توقع ہے؟

بلوچستان کو منافع میں سے 25 فیصد ملے گا وہاں اس کے علاوہ بلوچستان کو رائلٹی کی مد میں پانچ سے چھ فیصد ملنے کی توقع ہے۔ مقامی کمیونٹی کو سہولیات کی فراہمی کی مد میں آمدن میں سے ساڑھے تین فیصد ملے گا جبکہ بلوچستان ریونیو اتھارٹی بھی مختلف مد میں 6 فیصد تک آمدن اکٹھا کر کے دے گی۔ اگر ان سب کو ملایا جائے تو بلوچستان کی مجموعی آمدنی 39 فیصد تک ہوگی۔

اب معاملہ پھر سے ایک مشکل حل کی طرف بڑھ رہا تھا کہ 29 دسمبر کو اچانک عمران خان کے ایک ٹویٹ نے اسے ایک موڑ دے دیا ہے۔ایک ٹویٹ میں اعلان کیا کہ "حکومت بلوچستان کی خاطر وفاقی حکومت ریکوڈک پراجیکٹ پر اٹھنے والا تمام مالی بوجھ اٹھائے گی "اس ٹویٹ کے آنے کے بعد فوری طور پر ایک منصوبے کے تحت وزیر اعلیٰ بلوچستان میر عبدالقدوس بزنجو نے وزیر اعظم کے اس اعلان کا خیر مقدم اپنے ایک جوابی ٹویٹر میں جاری کر دیا کہ "وزیر اعظم کا ریکوڈک منصوبے میں بلوچستان کا مالی بوجھ اٹھانے کا اعلان تاریخی ہے۔ یہ فیصلہ بلوچستان کے عوام کیلئے امن، خوشحالی اور استحکام کا آغاز ثابت ہوگا۔ "یاد رہے کہ وزیر اعظم کی جانب سے یہ ٹویٹ ایک ایسے وقت میں کی گئی ہے جب بلوچستان میں ریکوڈک کا موضوع زیرِ بحث ہے اور اس کی وجہ بنی تھی پیر 27

دسمبر کو ہونے والا صوبائی اسمبلی کا وہ "اِن کیمرا اجلاس، جس میں اراکین اسمبلی کو اس پراجیکٹ کے حوالے سے تفصیلی بریفنگ دی گئی۔ اس اجلاس میں شامل بلوچستان اسمبلی کو آگاہ کیا گیا ہے کہ پاکستان کو 6/ارب ڈالر کی ادائیگی سے بچانے کیلئے اس منصوبے کا ایک شراکت دار بعض شرائط پر معاہدے پر آمادہ ہے۔

ایک رکن اسمبلی کے مطابق صوبے میں سونے اور تانبے کے سب سے بڑے ذخائر ریکوڈک منصوبے کے حوالے سے حکومت پاکستان 6/ارب ڈالر کے جرمانے کی ادائیگی سے بچنے کیلئے ٹھیتیان کاپر کمپنی (ٹی سی سی) کے دو شراکت داروں میں سے ایک شراکت دار سے دوبارہ معاہدہ کرنے کی تجویز زیر غور ہے۔ اراکین بلوچستان اسمبلی اور بالخصوص حزب اختلاف کے مطالبے پر بلوچستان اسمبلی کے اراکین کو اسی مجوزہ معاہدے کے بارے میں بریفنگ دی گئی تھی مگر اسے خفیہ رکھا گیا تھا جو کہ بلوچستان اسمبلی کی تاریخ میں پہلی بار ہوا تھا۔ مجوزہ معاہدے کے نکات کے حوالے سے ایک حکومتی رکن نے ریکوڈک کے سوال پر بات کرنے سے معذرت کی جبکہ دوسرے نے بھی تبصرہ کرنے سے انکار کیا۔ تاہم ایک حکومتی رکن سمیت تین دیگر اراکین نے مجوزہ معاہدے کے نکات کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ انہیں آگاہ کیا گیا ہے کہ ٹی سی سی کے ایک شراکت دار نے ان شرائط کے تحت کام کرنے پر آمادگی ظاہر کی ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں سوال یہ ہے کہ وہ کون سے خفیہ ہاتھ تھے جنہوں نے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت بیرونی ممالک کی ان کمپنیوں کے ساتھ ڈیل کی؟ کیا اس بات کی تحقیق ہونی ضروری نہیں کہ اس سودے میں بیک ڈور چینل پر کن کن افراد نے کمیشن لیکر ارضِ وطن کو خطیر نقصان پہنچایا؟ سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس کے پاس یہ مقدمہ اس وقت کیوں نہیں لایا گیا جب اس معاہدے پر دستخط ہو رہے تھے؟ اس پراجیکٹ پر کام کرنے والی کمپنیوں نے اس قدر عجلت میں اپنے حصص دوسری غیر ملکی کمپنیوں کو کس کی اجازت سے فروخت کئے جبکہ عالمی تجارتی معاہدوں کے قوانین کی رو سے وہ اس کی مجاز نہیں تھیں اور ایسا کرنے کیلئے انہیں مجوزہ اتھارٹی سے اجازت مطلوب تھی تو اس مجوزہ اتھارٹی میں کن افراد نے ایسا کرنے کی اجازت دی؟ وہ کون سے خفیہ ہاتھ اور قوتیں ہیں جو بلوچستان میں دریافت شدہ تیل کے ذخائر کی کھدائی میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں؟ ہمارے ملک کے مایہ ناز سائنسدان نے تو میڈیا پر انہی گیس کے ذخائر کو قیمتی ڈیزل میں تبدیل کرنے کے کامیاب تجربے کا عملی مظاہرہ بھی قوم کے سامنے پیش کر کے دکھا دیا لیکن ان کو اس عمل کو بڑھانے کیلئے کن قوتوں نے سختی سے روک دیا اور مزید فنڈنگ کا راستہ روک دیا گیا؟ جبکہ سرحد پار بھارت نے اسی علاقے سے اس تیل کے بہاؤ کو اپنی طرف موڑتے ہوئے کامیابی سے اس کا اب تک فائدہ اٹھا رہا ہے۔

آج رک ڈیک کے معاملے پر ایسے بلوچ قوم پرست نے جو ایک طرف تو حکومت سے اپنا کمیشن کھرا کرنے کیلئے اپنے حواریوں سے بلوچستان کی حق تلفی کا نعرہ بلند کر کے اپنا کردار ادا کرتے ہیں اور دوسری طرف اگلے متوقع انتخابات پر ان کی نظر ہے۔ بلوچستان میں حقیقی تبدیلی کا سویرا تو اس دن طلوع ہوگا جب اس صوبے کو سرداروں سے نجات ملے گی جس کیلئے ایک بہت بڑی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ جونہی اس تبدیلی کی طرف کام شروع ہوتا ہے تو یہ گروہ جس کو باقاعدہ غیر ملکی طاقتوں کی آشیر باد حاصل ہے، وہ درپردہ اپنی کاروائیوں کو تیز کر دیتے ہیں۔ کیا ہم بھول گئے ہیں کہ مشرف کے زمانے میں جب شپنگ کا وفاقی وزیر ایم کیو ایم کا غوری تھا، اور افغانستان کیلئے امریکی کمک کے کنٹینرز کا روٹ تبدیل کر کے براستہ بلوچستان کر دیا گیا تھا اور اسی روٹ کی آڑ میں پانچ سالوں کے دوران امریکی دو ہزار کے قریب کنٹینرز غائب ہو گئے تھے۔ ہماری تمام ایجنسیوں کو اس روٹ سے دور رہنے کا حکم دے دیا گیا تھا لیکن جب معاملہ اس حد تک بگڑ گیا کہ کہ چار امریکی سینیٹرز نے بلوچستان علیحدگی کی کھل کر نہ صرف حمائت کی بلکہ ایک قرارداد بھی سینیٹ میں پیش کی

گئی جس کے بعد پاکستان کی پانچ بلین کی وہ مدد روک لی گئی جس کو پاکستان نے ایک امریکی معاہدے کے تحت علاقے میں خرچ کیا تھا اور آج تک امریکا نے اس کی ادائیگی نہیں کی اور اپنے تحریری معاہدے کی بھی دھجیاں اڑادیں۔

اس کے بعد 26 نومبر 2011ء کو رات 2 بجے قبائلی ضلع مہند میں پاک افغان بارڈر پر سلالہ چیک پوسٹ پر پاکستان فوج کے موجود سپاہیوں پر بمباری کی وجہ سے ہمارے 24 جوان شہید اور 13 زخمی ہوگئے تھے۔ سلالہ اس پہاڑ کا نام ہے جس پر یہ دو "آتش فشاں" اور "بولڈر" نام سے چیک پوسٹیں قائم تھیں۔ امریکی جنگی جہاز پاکستان کی حدود میں تقریباً دو کلو میٹر تک داخل ہوگئے تھے اور انہوں نے سلالہ کے مقام پر دو پاکستانی فوج کی چوکیوں پر حملہ کیا ۔ پاکستانی فوجی تحقیق کاروں کے مطابق پاکستان کے خلاف اس حملے کی سازش افغان اور بھارتی انٹیلی جنس کی ایماء پر تیار کی گئی۔ پاکستان اور امریکا کے سفارتی تعلقات میں یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ کسی امریکی حملے میں اتنے زیادہ تعداد میں پاکستانی سکیورٹی اہلکار ہلاک ہوئے تھے اور اس پر پہلی مرتبہ پاکستان کی جانب سے بہت سخت اور غیر معمولی ردِّ عمل آٹھ ماہ تک نیٹو سپلائی کی بندش افغانستان میں جاری جنگ کے دوران سب سے بڑا تعطل پیدا کر دیا تھا۔ پینٹاگون نے روس، قازقستان، ازبکستان اور تاجکستان کے ذریعے متبادل راستے تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن یہ پاکستان سے گزرنے والے راستوں سے زیادہ طویل، مہنگے اور کم مؤثر ثابت ہوئے۔ روس کے ذریعے نیٹو کی سپلائی لائن پہلے ہی میزائل دفاعی منصوبوں پر کشیدگی کی وجہ سے بند ہونے کے خطرے سے دوچار تھی۔ پاکستان نے احتجاجاً بون میں افغانستان کے مستقبل سے متعلق کانفرنس میں بھی شرکت سے بھی انکار کر دیا تھا۔ جس کے بعد امریکی کمک پر پابندی لگادی گئی۔ بالآخر 8 مہینے کی پابندی کے بعد جب امریکا کی کے کونوں سے دھواں نکلنے لگا تو نیٹو نے اس واقعے پر اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے افسوس کا اظہار تو کیا مگر پاکستان سے غیر مشروط معافی مانگنے سے گریزاں رہے۔ صدر اوباما نے اس حملے کو المیہ قرار دیتے ہوئے تعزیت کی اور پینٹاگون کا یہ مؤقف رہا کہ تعزیت اور افسوس اب آگے بڑھنے کیلئے کافی ہے لیکن بعد ازاں امریکا کی سیکریٹری آف سٹیٹ ہیلری کلنٹن نے ذاتی طور تو پر حملے کی معافی مانگ لی لیکن امریکی ریاست کی طرف سے کوئی معافی نامہ نہیں آیا۔ گویا ایک ڈھیلا ڈھالا معافی نامہ جاری کیا گیا۔ تقریباً آٹھ ماہ کے بھرپور پاکستانی جواب کے بعد 12 جولائی 2012 کو طورخم اور چمن کے راستے نیٹو سپلائی دوبارہ بحال ہوئی اور اسی حملے کے بعد پاکستانی حکومت نے امریکا کے زیر نگرانی پاکستان میں چلنے والا شمسی ائیر بیس بھی خالی کروالیا۔

حالات و واقعات اس بات کے شاہد ہیں کہ امریکا اور نیٹو جو خود کو دنیا کے آقا و مالک سمجھتے ہیں، وہ ان رسوائیوں کو بھولتے نہیں بلکہ اپنے مفادات کی تکمیل کیلئے وقتی طور پر سمجھوتہ کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ اپنی ان سازشوں کو عملی جامہ پہناتے ہوئے کڑی سزا دینے سے باز نہیں آتے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اپنے حکمرانوں کی غلطیوں، کرپشن اور دیگر حماقتوں کا الزام بھی امریکا اور مغرب پر ڈالا جائے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارے ہاں ہر آنے والا حکمران امریکا کی نظرِ التفات کو ہی اپنے لئے ایک بڑا اعزاز سمجھ کر ساری قوم کو بھیڑ بکریوں کا ریوڑ سمجھ کر فروخت کرنے کیلئے ہمہ وقت تیار ہوتا ہے۔

بروز جمعۃ المبارک 18 جمادی الآخر 1443ھ 21 جنوری 2021ء

وقتِ منادی

عجیب بندۂ رب تھا وہ۔ بہت گہرا، بہت پرت تھے اس کے، ہر پل نیا رنگ لئے..... کبھی موسیقی کی محفل میں، کبھی مسجد میں، کبھی کسی درگاہ آخری عمر میں وہ پی پر اور کبھی کسی خانقاہ میں، کبھی تلقین شاہ اور کبھی گڈریا..... رنگ ہی رنگ، پرتیں ہی پرتیں..... نیا پل نیا روپ اور نیا آہنگ، اور ٹی وی کا مشہور پروگرام "زاویہ" کرنے لگا۔ یہ زاویہ کیا ہوتا ہے؟ پھر کبھی بات کریں گے۔ اپنی ایک کتاب "باباصاحبا" جو بڑی محبت سے مجھے ایک نصیحت کے ساتھ عنائت کی تھی، اس میں اپنے ایک بابے جناب سائیں فضل شاہ کا تذکرہ بہت عقیدت اور انتہائی محبت سے کیا ہے۔ جی! بالکل صحیح پہچانا آپ نے، میں بابا اشفاق احمد ہی کی بات کر رہا ہوں، داستان سرائے والے اشفاق احمد، جن کے ارد گرد ہر وقت ایک مجمع لگا رہتا تھا، جو ہر وقت دنیا کی مثالیں دیکر عاجزی کا درس دیتے رہتے تھے۔

ثمود کے لوگ اپنے تئیں تکبر کے مارے ہوئے لوگ تھے جو پہاڑوں کو تراش کر ان میں نہائت خوبصورت محلات تعمیر کرتے تھے۔ وہ ایک بگڑی ہوئی قوم تھی، دولت کی فراوانی اور سرسبز و شاداب علاقے کے مالک ہونے نے ان میں بڑی خرابی پیدا کر دی تھی۔ ان تک اللہ کا پیغام پہنچانا اور ان کو راہِ راست پر لانا حضرت صالح علیہ السلام کو سونپا گیا۔ اُن کی قوم کو اعتراض تھا کہ ان جیسا انسان جو بازاروں میں چلتا پھرتا ہے اور اوپر سے یہ کہ غریب آدمی ہے، کس طرح اللہ کا نبی ہو سکتا ہے! وہ یہی بات بار بار دہراتے تھے: اگر تم سربلند ہوتے اور تمہارے ہماری طرح اونچے محلات ہوتے، تم نے بھی ہماری طرح کوئی شاندار عمارت بنائی ہوتی تو شاید ہم تمہیں اپنا پیغمبر مان لیتے، لیکن تمہاری اقتصادی حالت چونکہ بہتر نہیں اس لئے تمہاری دعوت ناقابلِ قبول ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے ہم بار بار ہر چیز کی وجہ اقتصادیات کو بتاتے ہیں۔ ہر بار پلٹ کر اکنامکس.....! ہماری اکانومی کمزور ہے اس لئے کام نہیں کر سکتے، نیک نہیں بن سکتے، اچھا انسان نہیں بن سکتے، وغیرہ وغیرہ۔

حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا: "میں اس ہدائت کے کام کا اجر صرف اللہ سے چاہتا ہوں، تم سے نہیں"۔ مگر ان کی بد بختی، انہوں نے پیغمبر سے کوئی معجزہ چاہا کہ کوئی معجزہ دکھائیں۔ حضرت صالح علیہ السلام نے شرط قبول کر لی مگر ساتھ ہی تنبیہ کی کہ معجزہ آجانے کے بعد بھی اگر وہ ایمان نہ لائے اور اپنی روش نہ بدلی تو عذاب آجائے گا، اس لئے اگر معجزہ مانگ لیا جائے اور وہ نمودار بھی ہو جائے اور پھر بات بھی نہ مانی جائے تو عذاب طے شدہ بات ہے۔ ان ظالموں نے چاہا کہ کروڑوں برسوں سے کھڑے چٹیل اور چکنے مضبوط پہاڑوں سے حضرت صالح علیہ السلام کا رب اونٹنی پیدا کر دے اور وہ اونٹنی اُن کے ساتھ بستی میں رہے، تب وہ آپ کو اللہ کا پیغمبر مان لیں گے۔

حضرت صالح علیہ السلام نے اللہ سے دعا فرمائی کہ شاید یہ معجزہ ان لوگوں کی ہدائت اور فائدے کا سبب بن جائے، اور پھر یہی ہوا، پہاڑوں کے قد کاٹھ والی چاندی جیسی اونٹنی رب کریم کے حکم سے نمودار ہوئی اور لوگوں کے درمیان چلنے پھرنے لگی، لوگ حیرانی سے اسے دیکھنے لگے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا "تمہاری خواہش کے مطابق پہاڑوں سے یہ اونٹنی اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمادی ہے مگر یہ چونکہ اللہ کی مہمان ہے لہٰذا اللہ نے یہ شرط عائد کی ہے کہ بستی کے کنوئیں سے ایک دن یہ پانی پیئے گی اور کوئی دوسرا انسان، چرند پرند کنوئیں سے پانی نہیں لے سکے گا، دوسرے دن تمام بستی کے لوگ لے سکیں گے۔" انہوں نے مزید یہ فرمایا کہ "یہ ہماری معزز ترین مہمان ہے اور اس لئے اس کی دیکھ بھال ہماری ذمہ داری اور فرض ہے۔" بستی والوں نے یہ شرط قبول کر لی مگر تھوڑے ہی دنوں میں اس شرط سے بیزار ہو کر گویا اللہ سے کئے گئے وعدے سے مکر گئے کہ اس اونٹنی کی کیا حیثیت ہے کہ ہم اس سے بندھ

کر رہ گئے اور انہوں نے طے کیا کہ کس طرح اس اونٹنی کا قلع قمع کر دیں۔ پھر ایک رات انہوں نے اس کی کونچیں کاٹ کر اپاہج کر دیا اور اگلے دن پانی پینے نہ جا سکی۔

حضرت صالح علیہ السلام کو جب اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ یہ بہت برا ہوا، تم نے نہ صرف معجزے کو جھٹلایا بلکہ اس اللہ کے مہمان کے ساتھ بھی اچھا سلوک نہیں کیا، اب تین دن کے اندر اندر تمہارا قلع قمع اور تم نیست و نابود ہو جاؤ گے، پھر آنے والی تاریخ میں لوگ انگلیاں اٹھا اٹھا کر بتایا کریں گے کہ "یہ ثمود کے رہنے کی جگہ تھی اور یہ ان کے محلات تھے جو ویران پڑے ہیں اور قیامت تک ویران پڑے رہیں گے۔" چنانچہ جیسا فرمایا گیا، ویسے ہی ہوا۔ پہلے دن ان کے منہ پیلے ہوئے، اگلے دن سرخ اور اس کے بعد کالے سیاہ پڑ گئے۔ پھر ایک زبردست چنگھاڑ سنائی دی اور وہ سارے اوندھے منہ گر گئے اور نیست و نابود ہو گئے۔

ایک دن سخت تیز دھوپ تھی، پہاڑی علاقہ تھا، میں گلے میں صافہ ڈالے سائیں فضل شاہ کے روبرو کھڑا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے: میں نے تمہیں تنبیہ کرنے کیلئے بلایا ہے، تم لوگوں نے بڑی خوفناک منزل کی طرف رجوع کر لیا ہے، لوگوں کو بڑی بڑی ٹھار ٹھار کر باتیں سناتے ہو، ہم نے یہ کیا، ہم نے وہ کیا، ایسی سیاست کی، ایسے قائد کے پیچھے چلے، ہم نے بڑی قربانیاں دی ہیں۔ میں تم کو بتاتا ہوں یہ پاکستان ایک معجزہ ہے، یہ جغرافیائی حقیقت نہیں ہے۔ میں تمہیں تنبیہ کرتا ہوں اس طرح مت کرو، پاکستان کا وجود میں آنا اتنا بڑا معجزہ تھا جیسے قومِ عاد و ثمود کیلئے اونٹنی کا پیدا ہونا۔ اگر تم اس پاکستان کو حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی سمجھنا چھوڑ دو گے تو نہ تم رہو گے اور نہ تمہاری یادیں۔" انہوں نے میرے صافے کو جو گلے میں موجود تھا، کس کر پکڑ رکھا تھا بلکہ کھینچ رہے تھے، پھر انہوں نے فرمایا:

تم نے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا، باون برس گزر گئے (اب 2021ء میں تو 74 سال ہو گئے ہیں) اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک روا رکھا ہے جو قومِ ثمود نے کیا تھا۔ اندر کے رہنے والوں اور باہر کے رہنے والوں دونوں کو تنبیہ کرتا ہوں کہ سنبھل جاؤ، ورنہ وقت بہت کم ہے۔ اس اونٹنی سے جو کچھ لوٹا اور چھینا ہے، اسے واپس لوٹا دو، اور میں باہر کے رہنے والوں اور ساؤتھ ایشیا میں سارے ملکوں کو تنبیہ کرتا ہوں کہ وہ پاکستان کو کوئی عام چھوٹا سا جغرافیائی ملک سمجھنا چھوڑ دیں، پاکستان حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی ہے، ہم سب پر اس کا ادب و احترام واجب ہے، اس کو معمولی ملک نہ سمجھو، اس کی طرف رخ کر کے کھڑے رہنا اور اب تک جو کوتاہیاں ہوئی ہیں اس کی معافی مانگو اور اس کوتاہی کا ازالہ کرنے میں کوئی تاخیر نہ کرو۔"

میں ان کی کسی بات کا جواب نہ دے سکا، خوفزدہ ہو کر کھڑا رہا اور سلام کر کے، سر جھکا کر واپس چلا آیا۔ مملکتِ خداداد پاکستان کو مٹانے والے انشاءاللہ خود مٹ جائیں گے، جس سے جو کوتاہی ہوئی ہے وہ موت سے پہلے اس کا ازالہ کرے ورنہ اللہ کے حضور جواب دہی کیلئے تیار رہے۔ سدا خوش رہیں، آباد و شاداب رہیں۔ منادی کا کام کر رہا ہوں، شاید کسی کے دل پر کوئی اثر پڑ جائے اور میرا بھی بھلا ہو جائے۔

بروز اتوار 20 جمادی الآخر 1443ھ 23 جنوری 2021ء

وقت کا تمسخر

اسلام آباد کے کسی خوبصورت علاقے کی رنگارنگ مارکیٹ میں سرِشام نکل جائیں، لاہور کے گلبرگ اور ڈیفنس میں رات گئے تک آباد ایم ایم عالم روڈ کے ریستورانوں میں گھومیں، بڑے بڑے شاپنگ سنٹرز اور مالز کے ائرکنڈیشنڈ ماحول کا چکر لگائیں، کراچی میں کلفٹن کا پل اترتے ہی ارد گرد آباد دنیا کی رنگینیوں کو ملاحظہ کریں۔ آپ کو یہاں ایک اور ہی دنیا آباد ملے گی۔ سخت گرمی کے عالم میں ائرکنڈیشنڈ کاروں کے بند شیشوں سے جھانکتی ہوئی، ٹھیک اس دروازے پر اترتی جہاں صرف چند قدم اٹھانا پڑیں اور دروازے کے دوسری جانب ویسا ہی موسم سرد موسم ان کا انتظار کر رہا ہو جیسا وہ گاڑی کے کے اندر چھوڑ کر آئے تھے۔ اس دنیا میں آباد لوگوں کے معمولات پر میرے ملک کے عام انسانوں پر آنے والی کسی آفت، پریشانی یا افتاد کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ جس ہوٹل میں کھانا کھا رہے ہوتے ہیں وہاں اگر لوڈشیڈنگ کی وجہ سے بجلی چلی جائے تو ایک لمحے کے توقف کے بغیر سارے کا سارا انظام جنریٹر پر چلا جاتا ہے اور ان نازک اندام لوگوں کو چند قطرے پسینہ گرانے کی بھی زحمت گوارا نہیں کرنا پڑتی۔ ان لوگوں کے گھر کسی بڑے جنریٹر یا پھر ''یو پی ایس'' سے آراستہ ہوتے ہیں تاکہ رات گئے اگر بجلی چلی جائے تو کہیں ائرکنڈیشنڈ بند ہونے کی وجہ سے نیند میں خلل نہ آجائے۔

میرے ملک کی یہ مخلوق گزشتہ چند سالوں میں اس قدر بڑھی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ اگر کہیں کسی مزار پر مفت کھانا تقسیم ہو رہا ہو یا پھر کسی نے کوئی خیرات کرنی ہو، آٹا یا کپڑے تقسیم کرنے ہوں تو ایک ہجوم وہاں اکٹھا ہو جاتا، لائن لگتی یا پھر ضرورت مند لوگ اس خیرات کی آمد کا گھنٹوں انتظار کرتے لیکن اب ان بڑے ہوٹلوں میں بنی انتظار گاہوں میں آپ کو لوگ انتظار کرتے ہوئے نظر آئیں گے کہ کب میز خالی ہو تو یہ لوگ اندر جا کر کھانے سے لطف اندوز ہو سکیں۔ بعض دفعہ تو یہ لوگ گاڑی میں ایک ہوٹل سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے کی جانب سفر کرتے رہتے ہیں اور گھنٹوں انہیں مناسب ہوٹل میں جگہ میسر نہیں آتی۔ ان لوگوں کا انتظار، تردد اور جگہ نہ ملنے پر پریشانی ویسے ہی ہوتی ہے، جیسے کھانا مفت مل رہا تھا اور وہ وقت پر نہیں پہنچ سکے اور ان کے حصے میں خیرات نہ آسکی، ان لوگوں کے مسئلے بھی عام لوگوں سے مختلف ہوتے ہیں۔

آج کل کون سا فیشن چل رہا ہے۔ کون کون سی برانڈ کے ملبوسات مارکیٹ میں آئے ہیں۔ موبائل کا کون سا ماڈل آج کل نیا ہے اور اسے کہاں سے خریدا جا سکتا ہے۔ گاڑی کونسی آرام دہ ہے اور اس میں کون سی نئی چیزیں ڈال کر جاذب نظر بنا دیا گیا ہے۔ کون سی نئی فلم مارکیٹ میں آئی ہے۔ کس قسم کی میوزک البم مقبول عام ہے۔ کنسرٹ کہاں ہو رہا ہے اور اس کی ٹکٹیں یا پاس کہاں سے مل سکتے ہیں۔ ہالی وڈ نے کونسی فلم ریلز کی ہے اور اس کی اصل ڈی وی ڈی کہاں میسر ہو گی۔

آپ ان لوگوں کی محفلوں میں جا نکلیں تو یوں لگے گا جیسے اس ملک میں کوئی دکھ، پریشانی، مصیبت یا آفت نہیں ہے۔ کوئی اپنے تازہ ترین بیرونی سفر کے قصے سنا رہا ہو گا اور پھر واپسی پر اپنے ملک کی بدتہذیبی، عام آدمی کی جہالت اور وسائل کی کمی، ٹریفک کے بے ہنگم پن پر تبصرہ کرے گا اور ساتھ ایک سیاسی قسم کا بیان بھی جاری کر دے گا کہ ہم سب چور ہیں، ہم اپنے ملک کے ساتھ مخلص نہیں۔ ان کی محفل کی دوسری بڑی تفریح غیبت اور سکینڈل ہوتے ہیں۔ یہ سکینڈل کسی کی نوکری میں ذلت سے لے کر اس کی گھریلو زندگی اور معاشقے تک چلے جاتے ہیں۔ گالف کے میدانوں سے گھوڑوں کی ریس اور سٹاک ایکسچینج کے اتار چڑھاؤ ان کے موضوعات ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اخبارات کے بھی وہی صفحات زیادہ شوق سے دیکھتے ہیں جہاں کوئی ایسی خبر نہ مل سکے جن سے ان کا فشار خون بلند ہو جائے، ان پر پژمردگی چھا جائے یا ان کی پرسکون زندگی میں بے اطمینانی آنے لگے۔

یہ لوگ گزشتہ سالوں میں میرے ملک کے کونے کونے میں کیوں نظر آنے لگے۔ کیا ہم اچانک بہت امیر ہو گئے۔ ہم پر ہن برسنے لگا۔ ہم نے ترقی کی منازل طے کر لیں۔ نہیں، دراصل آج سے 13 سال پہلے تک ہم پر ایک بینکار نے 8 سال تک حکومت کی اور اپنا یہ منحوس کاروباری خونی دھندہ پاکستانیوں کی رگوں میں اتار کر چلا گیا جو ابھی تک جاری وساری ہے۔ بنک کا ایک ہی اصول ہوتا ہے کہ اس کا سرمایہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچے تاکہ اسے سود کی رقم وصول ہو سکے ۔کارخانے اور ملیں تو نہ لگیں لیکن اس ملک کے خواب دیکھنے والے اور امیر بننے یا امیروں کی طرح زندگی گزارنے کا شوق اور لگن رکھنے والوں کیلئے قرض کا دروازہ کھول دیا گیا۔ قرض لو اور گاڑی، فریج، ائر کنڈیشنڈ خریدو اور پھر اپنی محدود آمدنی میں سے پیٹ کاٹ کر سود سمیت قسطیں ادا کرو۔ جو پیٹ کاٹنے کی اہلیت ہی نہ رکھتا ہو وہ بے ایمانی سے، رشوت سے اور کسی بھی ناجائز ذریعے سے اس معیارِ زندگی کا بوجھ اٹھائے جو وہ اٹھانے کے قابل نہیں تھی مگر قرض کی فراہمی نے اس پر راستہ کھول دیا۔

لیکن ان سب لوگوں میں خواہ وہ بنیادی طور پر صاحب حیثیت ہوں یا اب نقلی ثروت اور قرض سے اس صف میں آ کھڑے ہیں۔ ایک بات مشترک ہو گئی ہے۔ یہ عام آدمی کے دکھ درد، آلام اور پریشانی سے بہت دور ہو گئے ہیں۔ انہیں اندازہ ہی نہیں ہو پاتا کہ گاؤں، محلوں اور کوچوں قریوں میں بجلی جاتی ہے تو کیا قیامت برپا ہو جاتی ہے۔ آٹا مہنگا ہوتا ہے تو کتنے فاقے آتے ہیں۔ نوکری نہ ملے تو کیسے بچوں کو سکول سے اٹھانا پڑتا ہے۔ نالیوں کی صفائی نہ ہو تو مچھر کیسے کاٹتے ہیں اور کونین کی گولی کتنے کی ملتی ہے، انہیں تصور تک نہیں ہو پاتا کہ لوگ معاشی پریشانی کی وجہ سے خودکشی بھی کرتے ہیں اور اپنے بچوں سمیت نہر میں چھلانگ بھی لگا دیتے ہیں۔ یہ لوگ ان سب دکھوں اور پریشانیوں اور لوگوں کی مصیبتوں سے بے بہرہ ہوٹلوں میں کھانوں کی خوشبوؤں میں رچے ہوتے ہیں۔ پلازوں میں خریداریاں کر رہے ہوتے ہیں اور محفلوں میں خوش گپیاں لیکن تاریخ ایسے ماحول کو "وقت کے تمسخر" کا نام دیتی ہے اور ملکوں ملکوں یہ کہانی بیان کرتی ہے کہ جب ایک خاص طبقہ بہت زیادہ امیر اور ظاہری ٹھاٹھ باٹھ سے رہنے لگے اور دوسری جانب انتہائی غربت وافلاس ہو تو پھر بس ایک چنگاری لگنے کی دیر ہوتی ہے۔ کسی حکمران کے منہ سے تضحیک کا کوئی فقرہ نکلا، کسی نے کہا "روٹی نہیں ملتی تو کیک کیوں نہیں کھاتے" یا پھر "دال نہیں ملتی تو مرغی کھایا کرو" بس یہ چنگاری غربت کی دھوپ میں جلے ہوئے انسانوں کے ڈھیر میں آگ لگا دیتی ہے۔ یہ بس چند لمحے سلگتی ہے اور ایک دم دھماکے سے سارا کھیت جل اٹھتا ہے۔

ایک نوجوان بے بس ماں نے اپنے نوزائیدہ بچے اور تین سال کی بچی کو اپنے ہاتھوں سے تیسری منزل سے اچھال کر خود بھی ان کے پیچھے کود کر خوفناک خونی موسم کا آغاز کر دیا ہے۔ ان لمحوں کو روکنے کیلئے خدارا کچھ کرو وگرنہ..... بات آگے بڑھ گئی تو کچھ نہیں بچے گا!

بروز سوموار 21 جمادی الآخر 1443ھ 24 جنوری 2021ء

موت کی خاموشی

ہماری حالت تو ایسے جاں بلب مریض جیسی ہو گئی ہے جو بڑی مشکل سے رینگتا ہوا اپنے معالج کے پاس تو پہنچ جاتا ہے لیکن اس میں اتنی ہمت باقی نہیں کہ وہ یہ بھی بتا سکے کہ اس کو کیا تکلیف یا کیا بیماری ہے؟ معالج کے پوچھنے پر اس کی آنکھوں سے آنسو رواں دواں ہوں اور زخموں سے چور جسم کے ہر اعضاء کی طرف اشارہ کرے۔ سالوں پرانی بیماریوں کا کرب اور سارے جہاں کا درد سمٹ کر اس کے چہرے سے عیاں ہو لیکن بتانے کیلئے اس کی اپنی زبان اس کا ساتھ چھوڑ دے۔ ماسوائے سسکیوں، آہوں اور کراہوں کے درمیان صرف اشارے سے کبھی سر کی طرف، کبھی دل پر ہاتھ رکھ کر اور کبھی دونوں ہاتھوں کو اپنی آنکھوں پر رکھ کر زور سے رونا شروع کر دے۔ جب معالج تھوڑا حوصلہ دلائے تو پھر اس کی جانب ایک عجیب سی امید اور آس کے ساتھ آنکھوں ہی آنکھوں میں امید اور رحم کی درخواست کرے۔

جن کے سینے میں اس مملکت خداداد پاکستان کا درد آبلہ بن کر ایک ناسور کی شکل اختیار کر چکا ہے اور درد کی شدت سے ان کو ایک پل چین میسر نہیں اور دکھ کی بنا پر ان کی آنکھوں سے نیند اڑ چکی ہے۔ نیم شب جب وہ اپنے اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوتے ہیں تو ان کی ہچکی بندھ جاتی ہے۔ اللہ سے رحم اور امید کے ساتھ پاکستان کیلئے شفاء اور سلامتی کی عاجزانہ دعاؤں کے ساتھ اپنے ان شہداء کا واسطہ دیتے ہیں جو اس ملک کی خاطر قربان ہو گئے۔ میرا وجدان تو اس وقت مجھ کو شدید بے چین کر دیتا ہے اور سانس لینا دشوار ہو جاتا ہے جب کبھی یہ سوچتا ہوں کہ ان سوا لاکھ بے گناہ بیٹیوں اور بہنوں کو روز قیامت کیا جواب دوں گا جن کو اس مملکت پاکستان کی خاطر مشرقی پنجاب اور بھارت کے دیگر علاقوں میں ہم چھوڑ آئے تھے، جو آج بھی آسمان کی طرف منہ کر کے اپنا قصور پوچھتی ہوں گی! صرف مشرقی پنجاب کے ان پانچ ہزار سے زائد کنوؤں کا حال کس قلم سے کیسے لکھوں جن میں مسلمان بچیاں اپنی آبرو بچانے کیلئے کود گئیں۔ ان ہزاروں بچوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے جن کو ان کے ماں باپ کی آنکھوں کے سامنے تلواروں اور بھالوں کے ساتھ ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔ آج بھی لاکھوں افراد اپنے پیاروں کو یاد کر کے چپکے چپکے اپنے اللہ کے حضور اشک بار ہو کر اس پاکستان کیلئے ان کی قربانی کی قبولیت کی دعائیں کرتے ہیں!

یہ حالت صرف ان لوگوں ہی کی نہیں جنہیں میرے رب نے واقعات و حالات کا ادراک دیا ہے۔ وہ کسی بڑی آندھی یا طوفان کے آنے سے پہلے ہی خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور فوری طور پر اپنے تئیں ان خطرات سے آگاہ کرنا شروع کر دیتے ہیں، منادی کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ دن رات اپنے تمام وسائل بروئے کار لاتے ہوئے دامے درمے اور سخنے اسی کام میں لگ جاتے ہیں کہ کسی طرح ان خطرات کا تریاق کیا جائے۔ آج کل ذرا سی سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص بھی حیرت میں گم چہرہ لئے ایک دوسرے سے یہی سوال کرتا پھر رہا ہے، کیا ہونے والا ہے اور اب کیا بنے گا؟ ہمارا مستقبل کیا ہے، ہم کہاں کھڑے ہیں؟ ایک دوسرے سے کوئی اچھی خبر کی تمنا دل میں لئے ہوئے، ایک امید کی شمع آنکھوں میں سجائے جیسے بستر مرگ پر پڑے مریض کے لواحقین کسی معجزے کی آرزو میں کسی حکیم، حاذق سے مرض کے تریاق ملنے کی نوید کیلئے بے تاب ہوتے ہیں یا کسی صاحب نظر کی دعا کے محتاج جس سے مریض کی جاں بچنے کی آس ہو جائے لیکن شائد اب مریض کو کسی حکیم کے تریاق، کسی ڈاکٹر کی دوا یا پھر کسی صاحب نظر کی دعا سے زیادہ کسی ماہر سرجن کی ضرورت ہے اور شائد آپریشن میں جتنی دیر ہو گی مریض کی جان بچنے کے امکانات اتنے ہی مخدوش ہو جائیں گے، مریض کی حالت اتنی ہی بگڑتی چلی جائے گی، مرض اتنا ہی پھیلتا جائے گا، آپریشن اتنا ہی لمبا اور تکلیف دہ ہو جائے گا۔

پوری دنیامیں مسلم ممالک کی نمائندہ تنظیم کے طور پر "او آئی سی" وہ کردار ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے جو دوسرا کوئی بھی بین الاقوامی یا عالمی ادارہ ادا نہیں کر سکتا لیکن اس صلاحیت کے باوجود اس کا مسلمانوں کے بڑے بڑے اور اہم مسائل کے لیے کردار نہ ادا کرنا دنیا کی مسلم آبادی کیلئے تشویش کا باعث ہے۔ افغانستان میں طالبان کے اقتدار میں آنے کے بعد سے دو لاکھ 90 ہزار افغان شہری پاکستان منتقل ہوئے ہیں۔ پاکستان میں پہلے بھی لگ بھگ 30 لاکھ افغان پناہ گزین آباد ہیں جن میں سے زیادہ تر 1980 میں سوویت یونین کے افغانستان پر حملے کے بعد آئے تھے لیکن اس سے بڑی ستم ظریفی اور کیا ہو گی کہ پاکستان کی سرزمین پر او آئی سی کے اجتماع میں پہلے سے یہ طے کر لیا گیا کہ اس اجلاس میں مسئلہ کشمیر کا بالکل ذکر نہیں کیا جائے گا۔ یقیناً اگر او آئی سی واقعی اپنا کردار ٹھیک سے ادا کرتی تو فلسطین، کشمیر، یمن، شام، لیبیا، عراق اور افغانستان سمیت ایسے کئی مسلم علاقوں کے مسلمان سنگین مسائل کا شکار نہ ہوتے۔ فلسطین اور کشمیر کے مسائل کا سات دہائیوں سے زائد عرصہ گزرنے کے بعد بھی مستقل اور پائیدار حل نہ ملنا جہاں اس ادارے کی ناکامی کا اظہار ہے وہاں عمران خان کے پاس کشمیر کے وکیل ہونے کا کیا جواز باقی رہ گیا ہے؟ کہاں ہیں وہ سیاستدان جو ایسے غیر انسانی ظالمانہ اور منحوس کرتوتوں پر اپنی زبانوں کو بند رکھے ہوئے ہیں؟ کیا اب وہ وقت نہیں آ گیا کہ ایسے ظالموں کے منہ پر پڑے ہوئے نقاب تار تار کر دیئے جائیں تاکہ قوم کو ان کی اصلیت کا پتہ چل سکے؟

مجھ سے مایوسی کا گلہ بالکل نہ کریں اور نہ ہی میرا مقصد بلاوجہ آپ کو ڈرانا ہے لیکن آپ ہی مجھے یہ بتائیں کہ آپ کا کوئی عزیز جو آپ کو بہت ہی پیارا ہو وہ کسی خطرناک مرض میں مبتلا ہو جائے، آپ اس کے بہتر علاج کیلئے دنیا کے بہترین ڈاکٹر، بہت ہی سمجھدار طبیب یا بڑا نامور حاذق تلاش کرنے میں دن رات ایک کر دیں گے اور اس کی زندگی بچانے کیلئے اپنی توفیق سے بڑھ کر خرچ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے۔ یہ تمام وسائل مہیا ہونے کے بعد آپ سجدے میں رو رو کر اپنے عزیز کی شفایابی کیلئے اپنے معبود کو اس کی تمام جملہ صفات کا واسطہ بھی دیں گے تب جا کر آپ کے دل کو اطمینان آئے گا کہ وہی شفا کا منبع ہے اس سے بہتر کون ہے جو ہماری دعاؤں کو شرف قبولیت دے گا لیکن ہمارا حال یہ ہو گیا ہے کہ اپنی سیاست کو چمکانے کیلئے خود کو کشمیر کا وکیل بتاتے ہیں لیکن جب مقدمہ لڑنے کی باری آتی ہے تو آپ پر موت کی خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر
لہو پکارے گا آستیں کا

بروز منگل 22 جمادی الآخر 1443ھ 25 جنوری 2021ء

اندر کی آنکھ

نہیں، نہیں یہ جو نظر آرہا ہے دھوکا ہے فریبِ نظر ہے اور کچھ نہیں۔ یہ ایسا نہیں ہے جیسا نظر آرہا ہے، اندر کی آنکھ کھول تب نظر آئے گا۔ وہ جو تیرے اندر کی آنکھ کھل سامنے بیٹھا ہے، جو کہہ رہا ہے وہ ایسا نہیں ہے، ہاں! جو کہہ رہا ہے، وہ ایسا نہیں ہے۔ جو کہہ رہا ہے بس سن لے ایسا ہے نہیں، اور اگر جائے، نظر آنے لگے تو شکر کرنا کہ یہ توفیق ہے، رب کی عنایت ہے۔ مداری مت بن جانا کہ ہر ایک کو کہتا پھرے جھوٹ بولتا ہے تُو، اندر سے تو تُو یہ ہے ۔پردہ پوشی کرنا، مرض سے لڑنا ہے مریض سے نہیں، پھر جب اندر کی آنکھ بینا ہو جائے تو اشکوں سے دھوتے رہنا کہ یہی ہے اسے مطہر کرنے کا پانی۔ آنکھ کو ناراض مت کرنا کہ اگر یہی ناراض ہو گئی تو سب کچھ برباد ہو جائے گا۔ آنکھ خفا ہو جائے تو برے مناظر دکھاتی ہے۔ برے مناظر تو ہوتے ہی برے ہیں، ،وہ تو اچھے منظر کو، اچھے چہرے کو بھی میلا کر دیتی ہے۔ تیرے اندر کی آنکھ کھلے تب تو تُو پہچان پائے گا ناں! کھلے گی کب؟ جب رب راضی ہو جائے۔ رب کرم کر دے تو اندر کی آنکھ کو بینا کر دیتا ہے۔ نہیں، نہیں..... جو نظر آرہا ہے دھوکا ہے، فریبِ نظر۔

بس رب سے جڑے رہنا ہر حال میں..... غربت میں بھی اور تونگری میں بھی۔ صحت مند ہو جب بھی اور بیمار ہو تب بھی۔ ہر حال میں سراپا تسلیم رہنا۔ راضی برضائے الٰہی رہنا کہ یہی ہے بندگی اور کچھ نہیں۔ اپنا دامن بچانا کمال نہیں، دوسروں کو بچانا اصل ہے۔ دوسروں کی مدد کر تو وہ تیری مدد کو آئے گا، اوروں کا دکھ بانٹ تو سکھی رہے گا۔ اندر کا سکون چاہیے تو دوسروں کے آنسو پونچھ۔ احسان کر کے مت جتلانا لیکن خبردار رہنا۔ بہت نازک ہے یہ کام۔ اپنے ذاتی مقصد کیلئے یہ سب مت کرنا، اس لئے کرنا کہ رب کی مخلوق ہے اور مخلوق رب کو بہت پیاری ہے۔ تصویر کی تعریف مصور کی تعریف ہے تخلیق کو سراہنا خالق کو سراہنا ہے۔ مخلوق میں رہ اور رب تک پہنچ۔ جنگل، بیاباں میں کچھ نہیں رکھا، مرنا تو بہت آسان ہے، زندہ رہنا کمال ہے۔ اپنے لئے نہیں، پابرہنہ مخلوق کیلئے، خاک بسر بندگانِ خدا کیلئے جی، ٹوٹے دلوں سے پیار کر، بے آسرا کیلئے سایہ بن شجرِ سایہ دار، پھول بن، خوشبو بن خلوص بن، وفا بن، جب رب خوش ہو تو مخلوق کے دلوں میں اُتارتا ہے تیری محبت۔ تجھے کیا خبر کتنے ہاتھ رب کے حضور اٹھتے ہیں تیرے لئے۔

دیکھ رب خفا ہو جائے تو سب کچھ برباد ہو جاتا ہے۔ ہاں انسان کے اپنے اعضا بھی خفا ہو جاتے ہیں۔ کان خفا ہو جائیں تو بری باتیں سنتے ہیں ٹوہ میں لگ جاتے زبان خفا ہو جائے تو غیبت کرنے لگتی ہے مخلوق کی برائیاں بیان کرتی ہے، چغلی کرتی ہے بہتان طرازی کرتی ہے، لوگوں کو آپس میں لڑاتی ہے حق ہیں، کو چھپاتی ہے خوبیاں چھوڑ کر کوتاہیاں بیان کرتی ہے دلوں کو اجاڑتی ہے فساد برپا کرتی ہے۔ یہ زبان بہت کڑوی بھی ہے اور میٹھی بھی۔ یہ دلوں کو جوڑتی بھی ہے اور توڑتی بھی۔ خفا ہو جائے تو اس کے شر سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ کوئی بھی نہیں۔ جھوٹے وعدے کرتی ہے بس رب ہی اس کے فساد سے بچا سکتا ہے۔ پاؤں خفا ہو جائیں تو دوسروں کو آزار پہنچانے کیلئے اٹھتے ہیں، برائی کی جگہ جاتے ہیں۔ ہاتھ خفا ہو جائیں تو لوٹ مار کرتے ہیں، قتل وغارت گری کرتے ہیں، چھینا جھپٹی کرتے ہیں۔ مار پیٹ کرتے ہیں، خلق خدا کے حق میں تو نہیں اٹھتے بس مخلوق کو تباہ کرنے والوں کا ساتھ دیتے ہیں ان کے ہاتھ اور بازو بن جاتے ہیں۔ ذہن خفا ہو جائے تو بری باتیں سوچتا ہے۔ بیہودہ خیالات کی آماجگاہ بن جاتا ہے، سازشیں کرتا ہے منصوبہ بندی کرتا ہے فساد کی اور دیکھ اگر دل خفا ہو جائے تو مردہ ہو جاتا ہے اور تجھے معلوم ہے مُردہ شے سڑنے لگتی ہے اس کی بدبو سے رب بچائے۔ بے حس ہو جاتا ہے، نیکی قبول ہی نہیں کرتا، برائی کی طرف بڑھتا ہے، تفرقہ پھیلاتا ہے جوڑتا نہیں توڑنے لگتا ہے بس رب بچائے ان امراض سے اور رب ہی تو بچا سکتا ہے۔ کچھ ہی لمحے تو جینا ہے۔ ابھی آتے ہوئے اذان ہوئی تھی اور پھر جاتے ہوئے نماز، وہ بھی اگر نصیب ہو جائے تب۔

دو پل کے جینے کیلئے اتنے منصوبے، اتنی جان ماری، اتنی ذلت در در کی بھیک، خوشامد اور چاپلوسی، کس خسارے میں پڑ گیا میں ۔رب توفیق دے، کرم کر دے، تب ہی تو میں پہچان پاؤں گا چیزوں کی اصل کو۔انسان کے اندر دیکھنا عنایت ربی ہے۔ پھل پھول تو سب کو نظر آتے ہیں، جڑ کون دیکھے گا؟ وہ نظر کہاں سے لاؤں! بس یہ توفیق پر ہے، رب سے جڑنے میں ہے۔جناب رسالت مآب ﷺ نے فرمایا ہے ناں: مومن کی بصیرت سے ڈرو وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

کب پہچانوں گا خود کو، اپنے رب کو، اپنے پالن ہار کو..... کب انکار کروں گا جھوٹے خداؤں کا..... کب سہارا بنوں گا خاک بسر مخلوق کا.... کب دوست بنیں گے میرے اپنے اعضا۔ موت سے پہلے رب سے کیوں نہیں مانگتا تو یہ سب کچھ، کیوں آہ وزاری نہیں کرتا؟ کب ہوش آئے گا مجھے ؟میرا رب بچائے اُس وقت سے جب مجھے ہوش آئے اور وقت پورا ہو گیا ہو۔ کوئی چارہ نہ ہو بے بسی ہو۔ دیکھئے وہ میرا ساتھ نہیں چھوڑتے، پھر آ گئے کیا خوبصورت بات کی ہے، واہ میرے مالک کیسے نادر و نایاب بندے پیدا کئے۔ نہ کرتا تو ہم کتنے محروم رہ جاتے۔

ہم ایک سجدہ کو گراں سمجھ بیٹھے اور اب ہر جگہ ذلت و رسوائی کے ساتھ سر بسجود ہیں۔ایک کو چھوڑا تو جہاں کے محتاج ہو گئے، ایک کی نہیں سنی اب ہر ایک کی جلی کٹی بھی سننی پڑ رہی ہیں، ایک کی نہیں مانی اور اب زمانے بھر کی ماننی پڑ رہی ہیں، اسی ایک در سے نہیں مانگا اور اب ڈونر انٹر نیشنل کانفرنسوں میں جھولی پھیلائے کھڑے ہیں۔اس ایک شعائر کی توہین کی، اب ہر جگہ مردود ہیں۔ یہ سب کچھ کیا دھرا ہمارا اپنا ہے، اب تو یہ فصل کاٹنی ہی پڑے گی، وہ ایک تو ہم پر ہمیشہ مہربان رہا تو قدر نہ کی لیکن ہم نے یاری لگائی عیاروں سے مکاروں سے۔ بہت سنا ہو گا آپ نے، بے قدروں سے یاری لگانا ایک نازک چوڑی کی طرح ہوتا ہے جس کا مقدر بالآخر ان گنت ٹکڑوں کے سوا کچھ نہیں لیکن نہیں مانے ہم۔اپنی تگڑم لڑائی، جی ہم تو فلاں یونیورسٹی کے فاضل ہیں۔اب پتہ چلا وہ تو جہالت کا پروانہ تھا جسے ہم ڈگری سمجھ کر نہال ہو گئے تھے۔ بس ایک در ہے، وہی تھا، وہی رہے گا! بندہ کے دینے سے کبھی پیٹ نہیں بھرتا اور پھر اس کے سامنے نگاہیں بھی نیچی رہتی ہیں لیکن وہ تو بے حساب دیتا ہے اور پھر طعنہ بھی کوئی نہیں لیکن اب کون سمجھائے ان کو! یہ تو پاکستان کے اعلیٰ مناصب پر بیٹھ کر بھی اپنے آقا کو نہیں پہچان سکے۔

"نصیحت کرنے والوں کا، ڈرانے والوں کا انجام یہی کیا ہے دنیا نے، کبھی صلیب پر چڑھا دیتے ہیں، کبھی دار پر، کبھی اس پر کربلائیں نافذ کر دیتے ہیں، کبھی وادیٔ طائف سے گزار دیتے ہیں، کبھی کوئی صعوبت، کبھی کوئی.... لیکن سلام و درود ہو نصیحت کرنے والوں پر جن کے حوصلے بلند اور عزائم پختہ ہوتے ہیں۔ جو گالیاں سن کر دعائیں دیتے ہیں اور جو غافلوں سے غفلت کی چادریں اتار دیتے ہیں اور انہیں بے حسی کی نیند سے جگاتے رہتے ہیں۔ کوئی نصیحتوں سے بھری ہوئی کتابیں پڑھ لینا ہی کافی ہے؟ نہیں! اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے بہت کچھ۔ دنیا وقت کا عبرت کدہ ہے، یہاں آنکھیں کھول کر چلنا چاہئے۔اپنی من مانی نہیں کرنی چاہئے پہلے من مانیاں کرنے والے کہاں گئے؟ عشرت کدے، عبرت کدے کیوں بن گئے؟ محلات کھنڈرات کیوں ہو گئے؟ دنیا میں جھوٹ بولنے والے کیا کیا نشانیاں چھوڑ گئے۔ ویرانیاں ہی نشانیاں ہیں "عنقریب جھوٹ کی منڈلی سجنے والی ہے، وعدوں کے انبار لگا دیئے جائیں گے اور ووٹوں کی سیڑھی سے اقتدار حاصل کرنے کی بھرپور کوشش ہو گی۔

کوئی تو ہو جوان نشانیوں سے سبق حاصل کرے۔ زندگی تو برف کی مانند ہے، اس کو اللہ کے حکم کے مطابق گزار لو کیونکہ یہ پگھل تو رہی ہے، ختم بھی ہو جائے گی۔ پہلے کون رہا ہے یہاں، جواب رہے گا۔ کچھ بھی تو نہیں رہے گا، بس نام رہے گا میرے رب کا۔

بروز بدھ 23 جمادی الآخر 1443ھ 26 جنوری 2021ء

روح میں گھاٹا

چلئے آج لمبی چوڑی کہانی کو چھوڑ دیتے ہیں، جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ جو کچھ پڑھتا اور سنتا ہوں، آپ سے کہہ سن لیتا ہوں۔ جرأت بھی دل سوزی، شفقت اور رحم دلی کی طرح انسانی معراج کا ایک زینہ ہے۔ آج تک کوئی جرأت اور بہادری کے بغیر ترقی کی منازل طے نہیں کر سکا۔ جرأت اس تین منزلہ مکان کا نام ہے جس کے اندر انسان بستا ہے۔ انسانی وجود کے تین حصے ہیں: پہلا جسمانی، دوسرا ذہنی اور تیسرا روحانی، ان تینوں حصوں یا منزلوں کا ہونا بہت ضروری ہے کہ اس کے بغیر انسان کی زندگی کا آگے بڑھنا، اس کا نشو و نما پانا ناممکن ہے۔ جرأت آپ سے تقاضہ کرتی ہے کہ آپ اپنے اور دوسروں کے حقوق کیلئے کھڑے ہو جائیں اور انہیں منوانے کیلئے سینہ سپر ہو جائیں۔ جرأت آپ کو مجبور کرتی ہے کہ آپ اپنے آپ کو، اپنے معاشرے کو، اپنے ملک کو تعمیر کرنے کیلئے سختی اور شقاوت کی بجائے محبت اور شفقت سے کام لیں، تشکیک کی بجائے ایمان کے اندر زندہ رہیں۔ مایوسی کے مقابلے میں امید کے سہارے، مشکلات کے نیچے دبنے کی بجائے ان پر حاوی ہو کر خود اعتمادی کی جرأت پیدا کریں۔ غلطیاں تسلیم کرنے کی جرأت اور خود کو کامل نہ پا کر رونے بسورنے سے احتراز کریں۔ یہ ہیں صحیح جرأت کے مظاہر!

باوجود اس کے کہ آپ اپنے اندر ایک جزیرہ ہیں، لیکن یہ جزیرہ انسانوں کی دنیا میں آباد اور ان کے درمیان واقع ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ہم فکر مند نہیں ہوں گے تو بھوکے مر جائیں گے اور اگر فکر کرتے رہیں گے تو پاگل خانے میں جا کر فوت ہو جائیں گے۔ زندگی ان دنوں اس قدر مشکل ہو گئی ہے کہ ہمیں ڈھنگ سے فکر کرنا بھی نہیں آتا۔ ہم دشمن حملہ آوروں کی فکر کرتے رہیں گے اور اپنے پڑوسی کی کار کے نیچے آ کر دب کر مر جائیں گے۔ ہم ہوائی جہاز کے کریش سے خوفزدہ رہیں گے اور سیڑھی سے گر کر فوت ہو جائیں گے۔ ہم دوسروں سے ورزش نہ کرنے کی شکائت کرتے رہیں گے اور گھر کے سامنے لگے ہوئے لیٹر بکس میں خط ڈالنے کیلئے گیراج سے کار نکالیں گے۔ ہم فکر مندی کے فن سے بھی ناآشنا ہو گئے ہیں اور ہم صحیح فکر کرنا بھی بھول گئے ہیں۔ فکر کرنا ایک اچھی بات ہے اور اس سے بہت سے کام سنور جاتے ہیں۔ بچے پل جاتے ہیں، گھر چلتے ہیں، دفتر کا نظام قائم ہوتا ہے، بزرگوں کی نگہداشت ہوتی ہے۔ فکر مندی ایک صحت مند اقدام ہے، یہ کام کرنے پر اکساتی ہے، لیکن سب سے ضروری فکر اپنی روح کی ہونی چاہئے اور سب سے اہم فیصلہ یہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنا ابد کہاں اور کیسے گزار رہے ہیں۔ کبھی سوچا کہ اگر ہمیں ساری دنیا کی دولت مل جائے اور ہماری روح میں گھاٹا پڑ جائے، تو پھر یہ کیسا سودا ہے؟

ضرورت سے زیادہ فکر اس وقت شروع ہوتی ہے جب انسان خود کو خدا سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ یہ سمجھنا شروع کر دیتا ہے کہ اب ہر شئے کا بوجھ میرے کندھوں پر ہے۔ انسان خدا کا بوجھ بھی اپنے کندھے پر اٹھانا چاہتا ہے جو وہ کبھی بھی نہیں اٹھا سکتا۔ اس فکر مندی کے وجود میں آنے کی وجہ ایک چھوٹا سا لفظ "اگر" ہوتی ہے۔ اگر یہ ہو گیا، اگر وہ ہو گیا، اگر اس نے یہ کہہ دیا، اگر لوگوں نے باتیں بنانا شروع کر دیں!!! اعلیٰ عہدے پر فائز میرا ایک عزیز اپنے اندیشوں اور فکر مندیوں کی ڈائری لکھا کرتے تھے جن سے وہ خوفزدہ رہتے تھے۔ سال بعد جب ڈائری دیکھی تو ان ہزارہا اندیشوں اور فکروں میں سے کوئی ایک آدھ ہی ان کو چھو کر گزری تھی۔ اس کے مقابلے میں ایک دنیاوی طور پر ان پڑھ عورت، جو بھرپور جوانی میں بیوہ ہو گئی۔ چھ معصوم بچوں کا بوجھ، کام نہ کاج.....! کہنے لگی کہ میں نے صرف دو روپے کے کاغذی نوٹ سے اپنے اللہ سے شراکت نامہ کر لیا۔ ایک بھوکے آدمی نے صدا لگائی، جیب میں

دو ہی روپے تھے، نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ اس طرح میرے رب سے میری شراکت شروع ہو گئی اور کہا کہ کام میں کرتی جاؤں گی، فکر میری جگہ تم کرنا۔ میرا کریم ورحیم رب راضی ہو گیا، بس اسی دن سے ہمارا شراکت کا کاروبار بڑی کامیابی سے چل رہا ہے۔

رات کو سونے سے پہلے میں یہ ضرور دعا کرتا ہوں: یااللہ! دن میں نے پورا زور لگا کر تیری مرضی کے مطابق گزار دیا، اب میں سونے لگا ہوں، رات کی شفٹ اب تو سنبھال، بڑی مہربانی ہو گی۔ جب ہم ایسا کچھ کرتے ہیں کہ ہمارا اندر بتاتا ہے کہ یہ تو گناہ ہے، تو ہم اپنی عزتِ نفس سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ پھر اپنے ساتھ رہنا بھی مشکل ہو جاتا ہے پھر ہم ندامت کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتے۔ زندگی مشکل ہو جاتی ہے، ضمیر ہر وقت ملامت کرتا رہتا ہے۔ اب ہم تو یا اس کو بھول جائیں، یا اسے دماغ سے نکال دیں، لیکن یہ دونوں کام ہی مشکل ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس ایک فعلِ ندامت، پشیمانی، اور توبہ ہے۔ جب ہم اپنے کریم رب کے سامنے اپنی تمام بے بسی، ندامت کے احساس کے ساتھ سجدے میں گر کر توبہ کی درخواست اپنے آنسوؤں کی تحریر کی شکل میں، اس کی عدالت میں اس کی رحمت کا استغاثہ دائر کرتے ہیں، تو نہ صرف توبہ قبول ہو جاتی ہے بلکہ اگر اس مناجات میں اخلاص بھی ہو تو ہم بھی قبول ہو جاتے ہیں۔ پھر زندگی آسان ہو جاتی ہے۔ بابا اقبال نے تو اپنی منظوم زندگی کا آغاز ہی اس پہلے شعر سے کیا تھا:

موتی سمجھ کر شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اعزاز ہے کہ ہم نے دنیا کے بڑے بڑے مشہور، لائق فائق اعلیٰ درجے دوستی کیا ہے؟ اگر ہم ایک دوسرے کے دوست ہیں، تو یہ ہمارے لئے ایک بڑا کے لوگوں کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو پسند کیا۔ کیا پاکیزہ رشتہ باندھا، واہ واہ۔ دوستی کا رشتہ عمر بھر چلتا ہے۔ جوان ہوئے تو شادی ہو گئی۔ بہن بھائی، عزیز رشتہ دار، گھر، محلہ، شہر

رشتہ دار، گھر۔ محلہ، شہر چھوٹ گیا۔ بوڑھے ہوئے تو اولاد چھوڑ گئی، لیکن دوستی میں یہ تبدیلی نہیں آئی، دوستی کا رشتہ بے لوث ہوتا ہے، یا یوں کہئے کہ یہ روحانی ہوتا ہے۔ دیگر رشتوں میں تو کچھ جسمانی ضرورتوں کو پورا کرنا پڑتا ہے، مگر دوستی میں صرف روح کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا تقاضہ ہوتا ہے۔ روحیں ایک دوسرے کے ساتھ ہم آغوش ہو جاتی ہیں اور جسمانی تقاضہ ایک بھی نہیں ہوتا۔ والدین بچپن میں ملتے اور پھر ساتھ رہتے ہیں۔ پھر وہ ہمیں یا پھر ہم ان کو چھوڑ دیتے ہیں۔ بیوی یا شوہر جوانی کی عمر میں ملتے ہیں۔ بچے شادی کے بعد کی عمر میں نصیب ہوتے ہیں۔ اسی طرح بہن بھائی بھی ہوتے ہیں مگر وقت کے ساتھ ساتھ ہر کوئی اپنی ذمہ داریوں کے بوجھ میں مگن ہو جاتے ہیں۔

بدن کے شور میں گم تھی سماعت نہ سمجھی روح کی فریاد ہم نے
تلاش شادمانی میں شب و روز رکھا خود کو بہت ناشاد ہم نے

لیکن دوستی کیلئے عمر کی کوئی قید نہیں۔ آپ 8 کے ہوں یا 80 کے، 9 کے ہوں یا 90 کے، 16 کے ہوں یا 60 کے.....آپ میں اگر اخلاص ہے، اور اگر آپ دوستی کا مطلب جان گئے ہیں تو پھر آپ کسی بھی عمر میں دوستی کر سکتے ہیں، دوست بن سکتے ہیں۔ ایمان کیا ہے؟ ایک اختیار ہی تو ہے۔ ایک "چوائس" ہی تو ہے۔ کوئی مباحثہ یا مکالمہ نہیں، یہ ایک فیصلہ ہے، قطعاً مباحثہ نہیں ہے۔ ایک کمٹمنٹ ہے، کوئی زبردستی نہیں ہے۔ یہ ہمارے دل کے خزانوں کو بھرتا ہے اور ہماری ذات کو مالا مال کرتا رہتا ہے۔ بالکل ایک پر خلوص دوست کی طرح۔ پھر دوستوں میں تحائف کے تبادلے بھی ہوتے ہیں۔ یادیں ایک بہترین اور خوبصورت تحفوں کی طرح ہر دم آپ کو گھیرے رکھتی ہیں، اور وہ تحفہ جس میں کچھ قربانی شامل ہو جائے، وہ تحفہ جس نے آپ کو جینے کا ڈھنگ سکھایا ہو، جس نے آپ کو سر اٹھا کر چلنے کا فخر عطا کیا ہو، وہ تحفہ تو پھر سرمایہ حیات بن جاتا ہے۔ پھر ایسے تحفے کی حفاظت کیلئے ایک جان تو بہت کم محسوس ہوتی ہے۔ اگر ربّ کریم دوست ہیں تو پاکستان اس رحیم دوست کا سب سے بڑا قیمتی اور نایاب تحفہ ہے۔ ایک ایسا انمول ہیرا ہے جس نے آپ کے سر پر رکھے ایمانی تاج کو باقی دنیا سے ممتاز کر رکھا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آج کسی کمہار کے ہاتھ لگ گیا ہو اور وہ اس کی قدر نہ پہنچانتے ہوئے اس کو اپنے گدھے کے گلے کی زینت بنا دے؟ جلدی کریں، وقت بہت کم ہے۔ اپنے دوست کے تحفے کی قدر نہ کی تو پھر دوستی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

اجازت دیں۔ میں تو منادی کرنے آیا تھا۔ ملتے رہیں گے جب تک سانس کی ڈور بندھی ہوئی ہے۔ کچھ بھی تو نہیں رہے گا، بس نام رہے گا میرے رب کا جو الحیی القیوم ہے۔

یہ بازی عشق کی بازی ہے، جو چاہو لگا دو، ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

بروز جمعرات 24 جمادی الآخر 1443ھ 27 جنوری 2021ء

ہجوم میں تنہا

امید پر قائم ہے یہ دنیا۔ امید ہی تو امنگ ہے جینے کی امید ہی تو خوشخبری ہے اور امید ہی آمادہ کرتی ہے انسان کو..... شکست دیتی ہے مایوسی کو۔ میرا رب کہتا ہے ناں، امید کا دامن تھامے رہو۔ میں کروں گا تمہاری مرادوں کو پورا، میں ہی تو کر سکتا ہوں تمہاری آرزوؤں کی تکمیل میں ہی تو کر سکتا ہوں، تمہیں آسودہ میں ہی تو بنا سکتا ہوں، تمہیں تونگر اور میں ہی تو بدل سکتا ہوں حالات کو مخلوق کے دلوں کو، میں ہی تو کارسازِ حقیقی ہوں، میں ہی ہوں دلوں کا پھیرنے والا چراغِ محبت روشن کرنے والا تمہارے دوستوں کو بڑھاوا دینے والا اور تمہارے دشمنوں کے چہروں کو خاک آلود کرنے والا، انہیں نابود کر دینے والا۔ میں ہی ہوں ہر شے پر قادر، قادرِ مطلق..... سب ہیں میرے محتاج، میں تو کسی کا بھی محتاج نہیں ہوں۔ مجھ سے کون پوچھ سکتا ہے؟ میں جسے عزت دینا چاہوں کون اس کی تذلیل کر سکتا ہے؟ اور میں ہی کسی کو ذلیل کر دوں تو کون ہے جو اس کی تکریم کرے؟ ہاں جو میرے لیے ذلت برداشت کرے تب اُس کا مقام بلند ہے جو میرے لیے ٹھکرا دیا جائے اس کا کیا کہنا جو میرے لیے محروم کر دیا جائے اس کی شان مت پوچھو۔

رب امید ہے اور شیطان ناامیدی۔ تم جانتے ہو شیطان کا نام ابلیس ہے۔ ابلیس مایوس کر دینے والا، مایوسی کو پھیلانے والا، تنہا کر دینے والا، خوف دلانے والا، وسوسے پیدا کرنے والا، ہر طرح کا خوف..... رزق کا خوف، موت کا خوف، بھوک و پیاس کا خوف، جب نام ہے ابلیس تو مایوسی پھیلائے گا ناں، مگر بندگانِ رب کبھی مایوس نہیں ہوتے، کسی بھی حزن میں خوف کا شکار نہیں ہوتے۔ تو بس بندۂ رب بن اور شیطان ابلیس کو دھتکار دے، لعنت بھیج دے اس پر۔

ہمارے بابا بہت دکھ سے کہتے تھے۔ مجھے اس غریب پر حیرت ہوتی ہے، بہت رحم آتا ہے جو غریب ہو کر بھی رب کی طرف نہ پلٹے، رب کا دامن نہ تھامے۔ امیر کا تو سمجھ میں آتا ہے کہ وہ دولت کے نشے میں مدہوش ہو کر بھول جائے رب کو، غریب کیوں نہیں رب سے مانگتا، کیوں نہیں اپنے رب کا در پکڑتا، کیوں آہ وزاری نہیں کرتا؟ مجھے حیرت ہے ایسے غریب پر، ہاں مجھے یاد ہیں ان کی باتیں، آبِ زر سے لکھی ہوئی باتیں، میرے ارد گرد بھی حالات بہت بگڑ گئے ہیں۔ زمین نے اناج اگانا چھوڑ دیا ہے، آسمان نور برسانے سے انکاری ہو گیا، میرے دریا پانی کو ترس گئے، خاک بسر روٹی ڈھونڈ رہے ہیں..... رشتے ناتے ٹوٹ گئے، دلوں کی دنیا اجڑ گئی، موت کا ہرکارہ ہر طرف گھوم رہا ہے۔ بم دھماکے ہو رہے ہیں، نوجوان مایوس ہیں میری بچیاں گھروں میں بیٹھی ہوئی بوڑھی ہو رہی ہیں، نام و نمود عام ہے، میری آنکھوں کا پانی مر گیا ہے، گھر میں رہتے ہوئے بھی اجنبی ہو گئے سب..... کسی سے مسئلہ پوچھو تو وہ "یہ میرا اذاتی مسئلہ ہے" کہہ کر بیٹھ جاتا ہے اور وہ بتاتا اس لیے نہیں کہ اعتبار ہی نہیں رہا۔ بندہ اعتبار کرے بھی تو کس پر؟ اندر کچھ باہر کچھ۔ کتنے بڑے عذاب میں آ گئے ہم، کتنے دکھی ہو گئے تنہا ہو گئے، بے یار و مددگار ہو گئے، بے دست و پا ہو گئے..... ہمارے شہر اجڑ گئے، بستیاں ویران ہو گئیں..... اداسی اور تنہائی اوڑھے ہوئے ہیں ہم، اتنے بڑے ہجوم میں ہر ایک تنہا۔

بابا نے بتایا تھا: یہ سب کچھ رحمت ہے۔ یہ سب اس لیے ہے کہ ہم اپنی اصل کی طرف لوٹ جائیں۔ اپنے مالکِ حقیقی کو پہچان لیں اسے منائیں آہ وزاری کریں..... ہم سے بہت بڑا ظلم ہو گیا ہم گمراہ ہو گئے تھے، ہم سے گناہ عظیم ہو گیا تو ہمیں معاف کر دے، ہمارے گناہوں کو نہ دیکھ اپنی رحمت کو دیکھ، اپنے پیارے حبیب ﷺ کے صدقے اپنی رحمت کے طفیل ہمیں معاف کر دے، ہم سے درگزر فرما دے ہم بے سہارا ہیں، بس تو ہی تو ہے ہمارا سہارا، اور دیکھ تو ہمیں معاف نہیں کرے گا تو ہم ظالموں میں سے ہو جائیں گے ہم پر رحم کر دے۔

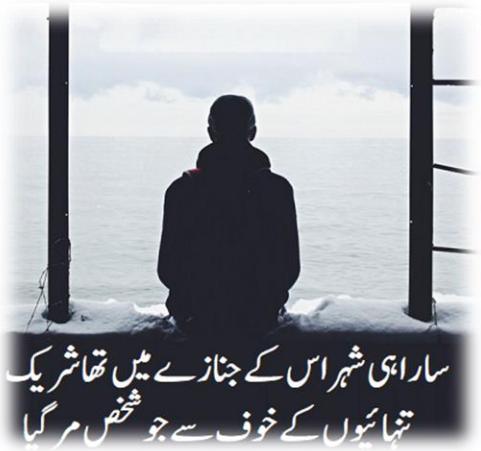

ہاں ہمیں وعدہ کرنا چاہئے تھا کہ آئندہ نہیں ہوگا اس طرح، ہم نہیں چھوڑیں گے تیرا دامن، ہم در در کے بھکاری بن گئے اپنے غیبی خزانے ہم پر کھول دے ہمیں رسوا نہ کر، ہاں ہم آئندہ تیرا در نہیں چھوڑیں گے لیکن کتنے دکھ کی بات ہے، کتنی محرومی ہے کہ ہم اس مصیبت میں بھی اسے بھول گئے ہیں۔ ہم کیا کر رہے ہیں، در در کی بھیک مانگ رہے ہیں..... ہماری مدد کرو آئی ایم ایف والو، امریکا والو! ہمارا پانی چھوڑ دو مہربانی ہوگی، ہمارے مزدوروں کو روزگار دے دو، گندم دے دو، روٹی دے دو، ہم پر بمباری نہ کرو، ہم خود اپنے لوگوں کو ماریں گے بس ہمیں ڈالر دے دو..... یہی کر رہے ہیں ناں ہم!

ہم نے اپنی تنگ دست عوام کو وہ خواب دکھائے جو صرف تیرے اختیار میں ہیں، ہم نے روٹی کپڑا اور مکان کا لالچ دیا لیکن جواب میں بھوک، کفن اور سر کی چھت سے محروم کر کے دنیا کے ہر ملک میں اپنی اولاد کیلئے پر تعیش محلات کھڑے کر لئے لیکن اس میں رہنا خود بھی نصیب نہیں ہوا، مختلف اور خطرناک عوارض میں مبتلا ہو گئے۔ تیری عطا کی ہوئی معجزاتی ریاست کے حصول کیلئے جو "اوفو بالعہد" کیا تھا، اس سے منہ پھیر لیا۔ اس ملک کو دولخت کرنے کے بعد بھی اپنی غلطیوں سے سیکھنے کو تیار نہیں جبکہ کھلی آنکھوں نے یہ مشاہدہ کیا کہ جن کرداروں نے اس کو محض اپنے اقتدار کیلئے دولخت کرنے میں کردار ادا کیا، تو نے ان سب کو باعثِ عبرت بنا دیا۔ ان سمیت ان کی اولادوں سمیت اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ بڑے متکبر انداز میں اس نے دو قومی نظریے کو خلیج بنگال میں ڈبونے کا دعویٰ کیا لیکن خود اپنے ہی گارڈ کے ہاتھوں واصل جہنم ہو گئی۔ اقتدار کی مسند پر فائز اور پہرے داروں کی بھیڑ میں دونوں بیٹے بھی باعثِ عبرت بنا دیئے گئے۔ دوسرا کردار بھی اپنی ہی فوج کے ہاتھوں گولیوں کا شکار ہو گیا اور دو دن اس کی لاش سیڑھیوں میں پڑی رہی، ایک بیٹی بچی جو ملک میں موجود نہیں تھی اور یہی معاملہ تیسرے کردار سے پاکستان میں ہوا۔ اپنی کرسی کو مضبوط بتانے والا رسی کے پھندے کا حق دار ٹھہرایا گیا اور ساری اولاد بھی غیر طبعی موت سے ہمکنار کر دی گئی لیکن اب بھی عبرت پکڑنے کو تیار نہیں۔ نئے پاکستان کو مدینہ ریاست بنانے کا نعرہ بھی بالآخر سودی قرضوں میں غرق ہوتا جا رہا ہے جبکہ سود کو تو اپنے ساتھ کھلی جنگ قرار دے رکھا ہے۔

ہاں مجھے پھر وہ یاد آئے سچ کہا تھا انہوں نے۔ جب ان سے میں نے پوچھا تھا: آزمائش اور عذاب میں فرق کیسے کریں؟ کیسے پتا چلے کہ یہ آزمائش ہے یا عذاب؟ تو مسکرا کر کہا: بہت آسان ہے یہ معلوم کرنا، جب کوئی مصیبت کوئی آفت کوئی بیماری تنگ دستی تجھے تیرے رب سے قریب کرتی چلی جائے تو خوش ہونا کہ یہ آزمائش ہے، دعا کرنا کہ ہمیں اس آزمائش میں پورا اتار۔ میرے مالک تیری رضا میں ہماری رضا ہے۔ بس تو خوش رہنا اور جب کوئی دکھ، تکلیف، مصیبت، تنگ دستی تجھے اپنے رب سے بھی دور کرتی چلی جائے تو سمجھ لینا یہ عذاب ہے، دھتکار ہے۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا۔ میرا مالک عذاب سے بچا لے، میرا مالک تنہا اور بے یار و مددگار نہ چھوڑ، مالک ہم پر رحم کر اور مجھے یہ سمجھ دے، یہ توفیق دے کہ مالکِ حقیقی کو پہچانوں زمینی خداؤں کا انکار کر دوں اور اپنے رب سے اپنا رشتہ جوڑ لوں۔

دو پل کا جینا ہے اور پھر اندھیری رات سجنو۔ کچھ بھی تو باقی نہیں رہے گا، بس نام رہے گا اللہ کا۔ مجھ کو اپنا دوست بنا دے ایسا ایک اشارے پر جو سب کچھ دھر دے کانوں کو مہمل کلمہ سننے کا، اور میرے دل کو خواہش سے مفر دے، وہ ذہن عطا کر تجھ کو سوچ سکوں، ایسی نظر دے کہ تجھ کو دیکھ سکوں، عذاب گہہ دنیا سے نجات دے میرے مولا! مجھ پر رحم کر دے، بس رحم کر دے، نہیں تو میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔

فوج حق کو کچل نہیں سکتی فوج چاہے کسی یزید کی ہو
لاش اٹھتی ہے پھر علم بن کر لاش چاہے کسی شہید کی ہو

بروز جمعۃ المبارک 25 جمادی الآخر 1443ھ 28 جنوری 2021ء

غسلِ خون کا اندیشہ بڑھ گیا ہے

اسے پہلے بھی اپنے ہی خون میں نہلایا گیا تھا تب بغداد واقعی عروس البلاد تھا۔ مشہور مورخ فلپ کے ہٹی تاریخِ عرب میں لکھتا ہے کہ جب ہلاکو خان اسماعیلی حشیشین جو حسن بن صباح کے پیروکار تھے کی سرکوبی کیلئے قلعہ الموت کی طرف بڑھ رہا تھا تو اس نے خلیفہ جو حسن بن صباح کے پیروکار تھے کی سرکوبی کیلئے قلعہ الموت کی طرف بڑھ رہا تھا تو اس نے خلیفہ المستعصم (1258-1242) کو اس مہم میں شامل ہونے کی دعوت دی تھی۔ خلیفہ نے اس کا جواب دینا بھی مناسب نہیں سمجھا تھا۔ ہلاکو نے نہ صرف قلعہ الموت فتح کر لیا تھا بلکہ جس بستی نے بھی مزاحمت کی اس کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی تھی۔ ستمبر 1257ء میں وہ شاہراہ خراساں پر بغداد کی طرف بڑھ رہا تھا، اب اس نے خلیفہ کو الٹی میٹم بھیجا کہ وہ ہتھیار ڈال دے، اپنے آپ کو فاتح کے حوالے کر دے اور شہر کی بیرونی فصیل گرا دے۔ تسلی بخش جواب نہ پا کر منگولوں نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔

جنوری 1257ء میں حملہ آور فوج کی منجنیقیں بغداد کی فصیل پر گولہ باری کر رہی تھیں، جلد ہی ایک مینار ٹوٹ چکا تھا اور فصیل ٹوٹ گئی تھی۔ حملہ آور شہر میں داخل ہو رہے تھے۔ اب ہلاکو خان کو "شہر امن" میں خلل نہ ڈالنے کا صائب مشورہ دیا گیا۔ اسے بتایا گیا کہ "اگر خلیفہ مارا گیا تو ساری کائنات دگرگوں ہو جائے گی، سورج اپنا چہرہ چھپا لے گا، بادل برسنا چھوڑ دیں گے اور سبزہ اگنا بند ہو جائے گا۔" ہلاکو خان نے ان خدشات پر ذرّہ بھر دھیان نہیں دیا۔ دس فروری تک منگول بغداد پر قابض ہو چکے تھے۔ خلیفہ اپنے تین ہزار درباریوں کے ہمراہ غیر مشروط طور پر فاتح کے حضور پیش ہوا۔ دس دنوں میں وہ سب تہہ تیغ ہو چکے تھے۔ شہر لوٹ مار کی نذر ہوا پھر اسے آگ لگا دی گئی۔ نصف سے زیادہ آبادی قتل ہوئی، لاشوں کی سڑاند اور بدبو اتنی تیز تھی کہ ہلاکو خان کو چند روز کیلئے بغداد سے باہر جا کر رہنا پڑا۔

سیّد امیر علی نے ابن خلدون کے حوالے سے لکھا ہے کہ چھ ہفتوں پر محیط قتل و غارت میں سولہ لاکھ انسان رزقِ خاک ہو گئے۔ خدا معلوم تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے یا نہیں، بعض واقعات تو گزرے ہوئے سانحات کا عکس نظر آتے ہیں۔ موجودہ بغداد کا حشر دیکھئے، ہلاکو خان دور دراز سے وارد ہوا تھا، اسے بغداد سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ تاخت و تاراج، لوٹ مار اور ہوس گیری ہی چڑھائی کے اسباب تھے۔ اکیسویں صدی کا ہلاکو خان سات سمندر سے تشریف لایا ہے۔ اس نے صرف بغداد اور کابل کو تاراج نہیں کیا بلکہ اسلام آباد میں بھی ڈیرے ڈال لئے۔ بغداد اور کابل والوں کے میزائل کیا آہیں بھی وہاں نہیں پہنچ سکتیں تھیں مگر پھر بھی گرجتا برستا چلا آیا۔ ویسا ہی الٹی میٹم دیا۔ صدام نے بھی حاکمِ وقت خلیفہ المستعصم کی طرح لیت و لعل سے کام لیا۔ ہو سکتا ہے میدانِ کربلا میں برپا ہونے والے معرکہ حق و باطل کا منظر بھی اس کے پیشِ نظر رہا ہو، خلیفہ کو زندگی سے پیار تھا، کسے نہیں ہوتا، زندگی کا تو تقاضہ ہی جئے جانا ہے مگر شرفِ انسانی کا اپنا معیار ہے۔ اس کی میزان میں شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہوتی ہے۔ اگر یوں نہ ہوتا تو ٹیپو سلطان شہید کا نام کب سے مٹ چکا ہو۔ وہ نہ صرف آج بھی تاریخ کی کتابوں میں زندہ اور کروڑوں مسلمانوں کے دلوں میں بس رہا ہے بلکہ ان کی قبر بھی زندۂ جاوید ہے۔ حضرت سلطان باہو نے فلاح اور کامیابی کی پہچان ہی یہ بتائی ہے کہ ہاتھ انہیں کے کچھ لگا "قبر جنہاں دی زندہ ہو" سرنگاپٹم کے قریب چھوٹی سی ندی کے کنارے واقع مزار شہید پر جنہیں حاضری دینے کی سعادت نصیب ہوئی ہے ان کے دل گواہی دیتے ہیں کہ شہید نے طوقِ غلامی کے عوض طوالتِ عمر کا سودا نہ کرتے ہوئے صحیح فیصلہ کیا تھا۔

یہ سنہری روایت بھی کتنی شاندار تھی۔ نواسہ رسول اکرم ﷺ نے اپنے اور اپنے خانوادۂ کے خونِ مطہر سے قرطاسِ عالم پر یہ فرمان لکھ دیا تھا کہ جان جاتی ہے تو جائے، مومن کا ہاتھ "یزید کے ہاتھ "میں نہیں جائے گا۔ سچ ہی تو ہے کہ اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد۔ کربلا کیا ہے، یہ فیصلے کی وہ گھڑی ہے جو غیور انسانوں سے اپنی جان اور اس سے بھی عزیز تر متاع کی قربانی مانگتی ہے تاکہ سب کچھ دینے والے کا حق ادا ہو سکے۔ فنا ہو جانا بچوں کا کھیل نہیں، زندگی دوام چاہتی ہے۔ ہر ایک چاہتا ہے کہ وہ ہزاروں سال جیئے اور ہر سال کے دن ہوں پچاس ہزار۔ 4 مئی 1799ء کی صبح سرنگاپٹم کے قلعے میں محصور ٹیپو سلطان نے بھی یہی چاہا ہو گا۔ اس کی عمر ہی کیا تھی! اس وقت 48 سال 5 ماہ اور 14 دن، جوانی بھی نہیں ڈھلی تھی، بہار جوبن پر تھی۔ ہنگامِ سفر ٹل بھی سکتا تھا۔ جنرل ہارس نے 22 اپریل 1799ء کو سرنگاپٹم پر گولہ باری شروع کرنے سے پہلے مصالحت کی پیشکش کی تھی، شرائط البتہ کڑی تھیں۔ سلطان سے کہا گیا تھا کہ "آدھی سلطنت چھوڑ دو، دو کروڑ تاوان ادا کرو، چار بیٹے اور چار جرنیل یرغمال دو۔" جواب چوبیس گھنٹے کے اندر مانگا گیا تھا۔ طاقت کے نشے میں چور حملہ آور ہمیشہ ہوا کے گھوڑے پر سوار آتے ہیں جو شکار کو چند سانسوں کی مہلت دینا بھی گوارہ نہیں کرتے۔ تہذیب و تمدن نے لاکھ ترقی کی ہو مگر نہ طاقت کے نشہ میں کوئی کمی آئی ہے اور نہ اس کے طور طریقے بدلے ہیں۔

سلطان کی غیرت نے گردن جھکا دینے کی اجازت نہ دی، مردانہ وار مقابلہ کیا۔ انگریز چومکھی لڑتا تھا، جنگ میں سب کچھ روا تھا۔ دشمن کے عمائدین پر ڈورے ڈالنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ بشری کمزوریوں کا جائزہ لینے کے بعد وہ طے کرتا کہ کس کس پنچھی پر جال پھینکا جائے۔ ان کی چالیں بالکل اسی طرح کامیاب رہتیں جس طرح آج کے دور میں امریکا بہادر کی بڑے لوگوں کو خرید لینے کی مہم کامیابی سے ہمکنار ہوتی ہے۔ 4 مئی کی صبح کو بھی یہی ہوا، "پورنیا" دشمن کے پاس بک گیا تھا۔ انگریزی فوج قلعے میں داخل ہو گئی تھی۔ سلطان دوپہر کے کھانے کیلئے ابھی بیٹھا ہی تھا، کہتے ہیں پہلا لقمہ اٹھایا تھا کہ دشمن کے قلعے میں داخل ہونے کی اطلاع ملی۔ ہاتھ کھینچ لیا اور فرمایا "ہم بھی عنقریب جانے والے ہیں"۔ اٹھے اور چند جانبازوں کے ہمراہ حملہ آوروں پر ٹوٹ پڑے۔ طاقت کے غیر معمولی عدمِ توازن سے کیسے نپٹا جا سکتا ہے۔ دفاع کرتے کرتے جامِ شہادت نوش کیا۔ اِنا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون۔

بے پناہ ننگی جارحیت ایک ایسا سیلابِ بلا ہے جس کا دھارا رکے نہیں رکتا جب تک اس کے مدمقابل اس سے بڑی طاقت خم ٹھونک کر کھڑی نہ ہو جائے۔ مستقبل قریب میں ایسا ہوتا نظر نہیں آتا۔ جن میں دم خم ہے وہ اپنی اپنی مصلحتوں کے پیشِ نظر خطرہ مول لینا نہیں چاہتے۔ تیسری دنیا بیچاری تو بھیڑ بکریوں کا ریوڑ ہے جس پر مغربی استعمار نے چند "گڈریئے" مقرر کر رکھے ہیں جن میں سے کئی ایک رکھوالوں کے روپ میں بھیڑیئے ہیں۔ ریوڑ میں سے جو بھیڑ بکری ذرا سا بھی سر اٹھائے اس کی وہ درگت بنتی ہے یہ آنے والی نسلوں کیلئے بھی نشانِ عبرت بن جاتی ہے۔ یہی الزام پہلے افغانستان پر تھا پھر عراق اس الزام میں دھر لیا گیا اور در پردہ ابھی تک پاکستان پر اپنے خوں آشام دانت گاڑنے کے منصوبے جاری و ساری ہیں۔ کہنے کو توفاتحین کرام ببانگ دہل یہ ارشاد فرما کر افغانستان میں داخل ہوئے تھے کہ عالمی امن کو ان دہشت گردوں سے خطرہ ہے اور عراق میں داخل ہوتے وقت یہ نعرہ لگایا تھا کہ وہ محکوم و مجبور اہلِ عراق کو آزادی کا تحفہ عطا کرنے آئے ہیں، حکومت بدلتے ہی وہ آزاد شہری ہونگے، ان کی اپنی حکومت ہو گی، وہ عراق کی دولت کے خود مالک

ہونگے، اپنی تقدیر خود بنا سکیں گے، اپنے بچوں کا مستقبل خود سنوار سکیں گے اور جبکہ پاکستان کو اس بات سے ڈرایا گیا کہ یہ دہشت گرد کہیں پاکستان کی ایٹمی تنصیبات پر قبضہ کر کے ساری دنیا کا امن نہ تباہ کر دیں۔ ہم جہاں پاکستان کو اس خطرے سے نکلنے میں مدد کریں گے وہاں پاکستان کے غریب عوام کی تقدیر بدلنے میں بھی ان کی مدد کریں گے۔ آہ! کتنے شیریں ہیں تیرے لب؟ پھول ہی پھول جھڑتے ہیں ان سے!

تاریخ کی گواہی البتہ ایسے خوشنما وعدوں پر اعتبار کر لینے میں مانع ہے۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد فاتح انگریز جرنیل نے بھی بغداد میں مژدہ سنایا تھا کہ وہ عراق پر قبضہ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ فقط اس پر موقوف نہیں ہے، جس فاتح نے بھی وہاں قدم رنجہ فرمایا اس نے وہیں اپنے خونی پنجے گاڑ دیئے۔ کون جابر اپنی مرضی سے کبھی مفتوحہ علاقوں سے گیا ہے؟ ہاں، حالات اور مقامی آبادی کا جذبۂ حریت انہیں تشریف لیجانے پر مجبور کر دے تو اور بات ہے؟

بڑی پریشانی کا دور ہے، بے گناہوں کو تڑپ تڑپ کر جان دیتے بھی نہیں دیکھا جا سکتا۔ یہ سوچنا بھی گوارا نہیں کہ وہ اپنے وطنِ عزیز کا دفاع نہ کریں۔ الجھن ہی الجھن ہے، بیکس انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر کیا کرے؟ کدھر جائے؟ حالیہ انتخابات میں مشمول بلوچستان کروڑوں لوگ سڑکوں پر امڈ آئے اور اپنی اس ناکامی کے بعد اب ان مٹھی بھر ملت فروش اور عیار دشمن کے مسلط کردہ ایجنٹوں کو ایک نئے ایجنڈے کے ساتھ سرگرم کر دیا گیا ہے۔ حافظ شیرازی کا بھی ایسے ہی حالات میں دل دکھا ہوگا۔ وہ لسان الغیب بڑے غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ "رموز مملکت خویش خسرواں دانند" (اپنی سلطنت کے راز بادشاہ ہی جانتے ہیں) اس لئے کسی "گدائے گوشہ نشیں" (جھگی والے فقیر) کو شور و غوغا نہیں کرنا چاہئے لیکن ہم کب تک جھگی والے فقیر بنے بیٹھے رہیں گے۔ بیداری کا احساس جن مربی دوستوں کو ہے وہ تو برملا ان سانپوں کا سر کچلنے کا مشورہ دے رہے ہیں بہر حال اشرافیہ اگر اب بھی نہیں سمجھتی تو جان لے کہ ''تیری بربادی کے مشورے ہیں آسمانوں میں''۔

اب تو یہ بھی طشت از بام ہو چکا ہے کہ را، سی آئی اے اور موساد نے کس تیزی کے ساتھ عراق اور افغانستان کے بعد بالخصوص بلوچستان میں عراق اور افغانستان سے کہیں زیادہ سرمایہ کاری کر کے کن خطرناک ارادوں سے اپنے مذموم ارادوں کی تکمیل کیلئے خونی پنجے گاڑنے کی ازحد کوشش کی تھی اور بعض اوقات تو یوں لگ رہا تھا کہ اس بار جو میدانِ جنگ سجنے جا رہا ہے اس میں ان بے سروسامان پاکستانیوں کو شائد خود ہی اس سیلاب کے سامنے بند باندھنا پڑے، انہیں خود ہی ان بن بلائے مہمانوں کو دربدر کرنا پڑے اور فلوجہ، نجف، بغداد اور کابل 'قندھار اور غزنی کے عوام کی طرح لڑنا ہمارا مقدر ٹھہرے گا۔ بلوچستان میں دہشتگردی کی لہر نے جہاں وطن دشمن طاقتوں کے عزائم کا پول کھول دیا وہاں ان کی ناکامی بھی نوشتۂ دیوار پر لکھی جا چکی ہے لیکن اس کے باوجود اب ضروری ہو گیا ہے کہ اس سے پہلے کہ شکاری اپنی مچان بنانے میں پوری طرح کامیاب ہو جائے، اسے پوری قوت کے ساتھ اس دھرتی سے دربدر کرنا ہوگا ورنہ پھر کسے علم اس کے نشانے کی زد پر کس کا گھر ہو، کس کا بیٹا ہو، باپ، ماں یا بہن ہو۔ یاد رہے کہ وطن عزیز غیر ملکی قرضوں کی شکل میں معاشی جال میں جکڑا جا چکا ہے کہ پاکستان دیوالیہ کے کنارے کھڑا کر دیا گیا ہے۔ ماتم کرنے سے پہلے سیلاب کو روکنا بہت ضروری ہے کہ وگرنہ وہی سحر جو خونِ صد ہزار انجم سے پیدا ہوتی ہے، ڈر ہے کہیں یہ غسلِ خون بھی رائیگاں نہ چلا جائے!!!

بروز ہفتہ 26 جمادی الآخر 1443ھ 29 جنوری 2021ء

انسانوں کی تلاش!

وطن عزیز میں پند و نصائح کی مجالس میں اگر موجودہ حالات کے تناظر میں آئینہ دکھانے کی جسارت محض اس خوش گمانی کی نیت سے بھی کی جائے کہ چہرہ کے بگاڑ کو ذرا بنا سنوار لیں تو ہر طرف سے اس آئینے کے ساتھ ساتھ آپ پر بھی پتھروں کی بارش شروع ہو جاتی ہے۔ بے شمار بودے دلائل کا سہارا لیکر نیچا دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے اور بالآخر تان اس پر ٹوٹتی ہے کہ غیروں کے خورشید کا سہارا لیکر ہماری ظلمتوں کا مذاق مت اڑائیں۔ لیکن جو بات صحیح ہے ۔مجھے اپنی تمام تر خامیوں کا اعتراف اس کو غلط کیسے کہوں؟ گمراہوں کیلئے راستے کی کیا قید! جب اپنی گمراہی کو ہی سیدھا رستہ سمجھ لیا جائے تو سمجھانا بیکار ہے اور میں اس کا برملا اعتراف بھی کرتا رہتا ہوں لیکن کیا سچ اور حق بات کہنے اور لکھنے سے بھی منہ موڑ لوں؟ مجھے اپنے بارے میں ایسا کوئی عارضہ بھی لاحق نہیں کہ آپ میری تحریروں کو پڑھ کر میرے بارے میں یہ گمان کریں کہ مجھے کسی داد و تحسین کی خواہش ہے لیکن دل میں یہ آرزو ہر وقت تڑپائے رکھتی ہے کہ وطن عزیز کی قسمت بدل جائے۔

ان گنت تعداد میں ٹیلیفون، ای میلز اور خطوط کا تانتا اس بات کی ہمت دلاتا رہتا ہے کہ یہ مشن جاری و ساری رہنا بہت ضروری ہے۔ میں یہ تمام خطوط اور ای میلز پڑھنے کی بھی پوری کوشش کرتا ہوں اور کچھ کے جوابات بھی دیتا ہوں لیکن کچھ مراسلے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو بار بار پڑھنے کے باوجود ان کا جواب دینے سے قاصر رہتا ہوں لیکن شاید آپ کے پاس اس کا کوئی جواب ہو! دن اور رات عجیب و غریب واہموں میں کٹ رہے ہیں۔

"بہت سمجھایا آپ کو، بے شمار دلائل بھی سامنے رکھے لیکن آپ کسی کی سنتے اور مانتے کب ہیں! شاید ہماری آواز میں اتنا زور نہیں کہ جس میں آپ کی آواز دب کر رہ جائے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی آپ کو ہماری صدا سننی پڑے، نہ ہمارے قلم کی وہ رفتار اور برق بازی جو آپ کے ارادوں کا منہ موڑ سکے اور آپ کے ضمیری طوفان کو روک سکے۔

جانتے ہیں کیوں روکنا چاہتا ہوں آپ کو؟ آپ کی آواز کو؟ آپ کے الفاظ کی آتش سے بچنے کیلئے۔ بارہا چاہا کہ آپ کی چیخوں سے بے بہرہ رہوں مگر کیسے؟ کچھ دنوں کیلئے آپ کے مضامین پڑھنے پر خود ساختہ پابندی لگائی لیکن اس ارادہ پر بھی قابو نہ رکھ سکی کہ بازگشت سے اب پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا ہے۔

خود تو آپ مضطرب بھی ہیں، طوفان بھی، کرب کا میدان بھی اور باضمیر بھی، انہی امراض کا نتیجہ آپ کی تحریریں بھی ہیں مگر.....!!! آپ کیوں نہیں سمجھتے؟ بھینسوں کے آگے بین بجانے سے کیا حاصل؟ برسوں سے لکھنے کا مرض پال رکھا ہے آپ نے، بے شمار مضامین اور کتابیں بھی لکھ ڈالیں، لوگوں کو بے کل کیا اور خود بھی ہوئے، قلم کو دن میں چین آیا نہ رات کو..... مگر اونٹ نہ اس کروٹ بیٹھا نہ اس کروٹ۔

میرا مشورہ اب تو مان لیں! چھوڑیئے، اب الفاظ کے زہر نے اپنا کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ آپ کچھ بھی کہیں، بے ضمیروں پر اثر نہیں ہوتا اور باضمیروں پر اثر کا کیا فائدہ! میرا یہ سچ آپ کو بھی کڑوا لگے گا ورنہ کوئی تو بدلا ہوتا۔ کیا کہا "بدلا ہے"! دن یا رات کا موسم یا نظام؟ انسانوں کو بدلئے ناں.....ہاں یہ بھی سچ کہا! بھلا انسان ہیں کہاں؟ ورنہ خالد بن ولید سے لیکر محمد بن قاسم تک انسان ہی تو تھے۔ ہاں آدمیوں کی بھیڑ ضرور ہے کہ دم لینا یہاں محال ہو رہا ہے! بھیڑ بھی ہے اور مرے ہوئے ضمیروں کی لاشوں کا تعفن بھی! اب اسی تعفن سے مزید اموات کا سلسلہ چل نکلا ہے۔

آدمیوں کی بھیڑ سے انسانوں کی تلاش؟ کیا خوب ہیں آپ! نمک کی کان سے شہد کی تلاش کر رہے ہیں!!! ہاں آپ جیسے اہل قلم جو بے چین روحوں کی مانند ہیں وہ بھی تو پورے انسان نہیں، آدھے ضرور ہیں۔ پورا انسان تو عافیہ صدیقی کو کہتے ہیں جس نے قلم کی بجائے تلوار کو اپنے ہاتھوں کی زینت بنایا۔ ہاں وہی عافیہ صدیقی جس کیلئے آپ کے کئی مضامین نے ہم کو ہلکان کر دیا، خود بھی بے چین رہے اور ہم سب کو بھی رلاتے رہے، جانتے ہیں ناں آپ۔۔۔اس پتلی دھان پان کی لڑکی کو یہ پیغام بھیجنا مت بھولئے کہ اب محمد بن قاسم کا خواب دیکھنا چھوڑ دے۔ عافیہ صدیقی کو یہ پیغام بھی ضرور دیں کہ جب قصر سفید کے گھمنڈی فرعون کی جیل سے تمہاری روح کو اپنے جسم سے رہائی ملے تو اس مردوں کی زمین پر مت آنا، ہاں یہی پاکستان جو اب مردوں کی زمین ہے۔ کیا کریں گی یہاں آکر؟ وہ زندہ لاش ہی سہی، مگر یہ تو خود مردوں کی بستی ہے.... ہم انہیں وہ ماہ و سال، زندگی کی وہ بہاریں، جو انہوں نے سسکتے بلکتے ہوئے تنہا گزار دیں، کہاں سے لا کر دیں گے؟ خدارا! آپ وہاں سے آزاد ہوتے ہی روح کو بھی آزاد کروالیجئے گا!!!

مجھے رنگینی صحن چمن سے خوف آتا ہے
یہی ایام تھے جب لٹ گئی تھی زندگی اپنی

ہمارا فاسق کمانڈو ہماری آنکھوں کے سامنے پاکستان کو کیسے کیسے تحائف دیتا رہا۔ کیسے اسے بھول جائیں؟ جامعہ حفضہ کی مسخ شدہ لاشیں، کبھی وزیرستان اور باجوڑ میں 80 بیگناہ معصوم بچوں کو ڈرون حملے میں پرخچے اڑا دیئے گئے، پاکستان کی ایک اجڑی ہوئی بیٹی کی داستان اور بربادی کا افسانہ.... بتائیں ناں کیسا لگا، کیسا لگا یہ تحفہ؟ عدلیہ کی بحالی میں سڑکوں کو خون سے رنگ دیا گیا، کراچی میں قیامت صغریٰ بپا کر دی گئی اور اسی شام مکے لہراتے ہوئے قوم کو اپنی طاقت سے ڈرایا گیا اور یہی شیخ رشید اس سٹیج پر کھڑا اس آمر کی تعریفوں میں قلابے ملا رہا تھا اور آج شب و روز اس شخص کی قدم بوسی کرنے میں عافیت سمجھتا ہے جس کو میڈیا میں بیٹھ کر حقارت سے تانگے کی سواریوں کا طعنہ دیتا تھا۔ ان سب کی غیرت کو تو سانپ سونگھ گیا اور مردہ ضمیروں کے ساتھ دانشوری اور حب الوطنی کا درس دیتے نظر آتے ہیں، ان حالات میں تاحال آپ کا قلم تو بحال ہے، اسی کے کرتب دکھائیں، شاید عوام اسی سے بہل جائیں اور چپ چاپ مہنگائی، ناانصافی اور عریانی و فحاشی کے سیلاب میں ڈوب جائیں..... بے فکر رہیں بڑا اجر و ثواب ملے گا اس کا....!!!

فقط آپ کا خوابیدہ ضمیر

آنکھ کھلی تو پسینے سے شرابور کانپتا جسم دیکھ کر بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ خواب تھا۔

گردش دہر ہی کیا کم تھی جلانے کو
تو بھی آپہنچا ہے دہکتے ہوئے رخسار کے ساتھ

"بہت سادہ ہو تم! میں کہاں سے باضمیر ہو گیا ہوں، کہاں کی بے چینی اور بے کلی، کون سا کرب! میں تو ایلیٹ کلاس سے ہوں، مزے اڑا رہا ہوں، دنیا کی تمام آسائشوں سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ کبھی ایک لمحے کیلئے بھی ایسے کسی کرب سے نہیں گزرا جس سے تم ہر روز وطن عزیز پاکستان میں گزرتے ہو۔ ہاں! یہ تم نے صحیح کہا، الفاظ کی بازی گری آتی ہے مجھے اور میں مداری کی طرح قلم سے ہر روز کرتب دکھاتا ہوں۔ اور ہاں! مجھ میں تو خود آگ نہیں تو پھر میرے الفاظ میں کہاں سے آگئی یہ آگ! بہر حال آئینہ دکھانے پر تم بڑے خوش نظر آرہے ہو، میں بھی تمہارا بڑا ممنون ہوں" بہادر ہمیشہ باوقار موت کا سامنا کرتے ہیں" اور میں کہاں سے باوقار ہو گیا۔ ہاں! میں نے کہیں یہ ضرور پڑھا تھا کہ: جوگی کسی کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور نہیں کرتے، وہ

صرف خواہشات دریافت کرتے ہیں، کسی کو محل بنانے کی خواہش ہو تو منع نہیں کرتے۔اپنے اگلے پھیرے میں بھی صرف خواہش جاننا چاہتے ہیں، کسی بھی خواہش کا اظہار کیا جائے تو کامیابی اور خوش رہنے کی دعائیں دیکر اپنا راستہ لیتے ہیں، لیکن اگر کوئی ان کا دامن تھام کر خود ہی چیخ چیخ کر کہے کہ میری ساری خواہشیں تو پوری ہو گئیں مگر میں اب بھی بے چین ہوں، پہلے سے کہیں زیادہ مضطرب!.....تو اسے سکون کا راستہ دکھا دیتے ہیں۔

میں کہاں جاؤں؟ میں کیا کروں؟ کائنات لامحدود ہے۔میں یہاں لمحے بھر کو چمکنے کے بعد بجھنے والا ہوں، اب میں کچھ کرنا چاہتا ہوں لیکن.....اس طرف سے زمین کھود کر ادھر نکل جاؤں، اس طرف سے کھود کر واپس اس طرف نکل آؤں.....اپنی موجودہ حالت سے نجات ممکن نہیں! اس لئے براہ کرم میرے سہانے خوابوں کو تو برباد مت کرو!

یہ آنکھ کا بادل تو برستا ہی نہیں ہے
اور عمر کے دریا میں روانی ہے بہت کم
وہ دن جو گزرنے تھے، گزر ہی گئے آخر
اب مہلت گریہ ہے نہ ہے فرصتِ ماتم

بروز سوموار 28 جمادی الآخر 1443ھ 31 جنوری 2021ء

مالک الملک کی تنبیہ

سپر طاقت کا میجر جنرل کرسٹوفر ڈوناہو جس نے 1992ء میں کمیشن لیکر اپنے ملٹری کیریئر کا آغاز کیا۔ چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کے سپیشل اسسٹنٹ کے عہدے کے ساتھ ساتھ سپورٹ آپریشنز میں 17 مرتبہ افغانستان، عراق، شام، شمالی افریقہ اور مشرقی یورپ بھی گئے، ان کی تازہ ترین پوسٹنگ افغانستان میں تھی۔ بالآخر ڈھیر ساری کامیابیاں سمیٹنے والا 30 اگست 2021ء کیرات افغانستان سے نکلنے والے آخری فوجی کے اعزاز کے ساتھ اب تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا، یہ اعزاز صرف یہاں تک محدود نہیں بلکہ یہ دنیا کے تمام پسے ہوئے ملکوں اور طبقوں کے نام ایک پیغام بھی ہے۔ جنرل کے امریکی جہاز سی 17 کی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی سپر پاور کا جونہی افغان سرزمین سے تعلق ختم ہوا، ساری دنیا میں یہ پیغام نشر ہو گیا، یہ زمین صرف اور صرف اللہ کی ہے اور اللہ جب چاہتا ہے یہ ہاتھیوں کو بھی کنکریوں سے بھس بھرے گدے بنا دیتا ہے، یہ امریکا کو بھی اپنے قدم بوریا نشینوں کے ملک سے سمیٹنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

میں نے 2010ء میں پاکستان میں طالبان کے آخری سفیر ملا عبدالسلام ضعیف کی کتاب "اژدھا کے منہ میں چار سال" پڑھی تھی، ملا عبدالسلام 2002ء سے 2006ء تک چار سال امریکا کی قید میں رہے تھے، یہ 2006ء میں گوانتاناموبے سے رہا ہوئے، کابل آئے اور گم نامی میں زندگی گزارنے لگے، انہوں نے 2007ء پشتو زبان میں اپنے چار سال کی روداد لکھی تھی، اس کتاب کو نوشہرہ میں "ہیومن رائیٹس پبلی کیشنز" نے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کیا، جنرل پرویز مشرف کا دور ختم ہو چکا تھا، پیپلز پارٹی کی حکومت تھی لہٰذا یہ کتاب شائع ہوئی اور اس نے درد دل رکھنے والوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ میں نے طالبان کی واپسی کے بعد یہ کتاب دوبارہ پڑھی اور دیر تک افسردہ بیٹھا رہا۔

ملا عبدالسلام ضعیف نے لکھا "میں افغان ایمبیسی کے مہمان خانے میں آیا، وہاں تین افراد بیٹھے تھے، ان میں سے ایک پٹھان تھا جس نے گلزار کے نام سے اپنا تعارف کرایا جب کہ دیگر دونوں اردو بولنے والے تھے، ان میں سے ایک انتہائی بدصورت، کالے کلوٹے اور بھدے ہونٹوں والے نے طنزیہ انداز میں کہا "آپ جانتے ہیں امریکا اس وقت سپر پاور ہے، پاکستان جیسا کمزور ملک اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اس سپر پاور کو آپ کی ضرورت ہے اور ہم آپ کو گرفتار کر کے امریکا کے حوالے کرنے آئے ہیں تاکہ امریکی خوش ہو سکیں اور پاکستان کو کوئی گزند نہ پہنچے"۔ عبدالسلام ضعیف نے جواب دیا "امریکا ایک سپر پاور ہے لیکن اس کے باوجود دنیا کے معاملات چلانے کے لیے کچھ قوانین اور اصول ہیں، آپ مجھ سے کن اسلامی، غیر اسلامی اور بین الاقوامی اصولوں کے تحت یہ سلوک کر رہے ہیں، آپ مجھے زیادہ سے زیادہ ملک چھوڑنے کا حکم دے سکتے ہیں"۔

ملا ضعیف کے مطابق "اس شخص نے توہین آمیز لہجے میں کہا، ہماری نظر میں اس وقت اسلام کی کوئی اہمیت ہے اور نہ کسی قانون اور اخلاقی قدر کی، صرف پاکستان کے مفادات اہمیت کے حامل ہیں اور بس"۔ ملا ضعیف کے مطابق "مجھے اسلام آباد سے گرفتار کر کے پشاور لایا گیا اور پھر منہ پر پٹی باندھ کر امریکیوں کے حوالے کر دیا گیا اور امریکیوں نے مجھ پر لاتوں، گھونسوں، تھپڑوں اور مکوں کی بارش کر دی، مجھے زمین پر پٹخ دیا گیا، چاقوؤں سے میرا لباس پھاڑ کر مجھے بالکل ننگا کر دیا گیا، اس دوران میری آنکھوں کی پٹی سرک گئی تو میں نے دیکھا، پاکستانی اہلکار فوجی انداز میں صف بستہ کھڑے تھے، ان میں غالباً کوئی جرنیل بھی تھا، دوسری طرف چند امریکی فوجی منظم انداز سے کھڑے تھے جب کہ باقی امریکی میرے ساتھ وحشیانہ اور ظالمانہ سلوک کر رہے تھے"۔

ملا ضعیف نے لکھا "میں مان لیتا ہوں کہ پاکستان مجھے امریکیوں کے حوالے کرنے پر مجبور تھا، لیکن کم از کم امریکی اہلکاروں سے تو کہہ سکتا تھا آپ ایک بے بس قیدی سے ہماری آنکھوں کے سامنے اس قسم کا غیر انسانی سلوک نہ کریں، امریکیوں کے اس توہین آمیز سلوک پر پاکستانی اہلکاروں کا یوں خاموش رہنا یہ وہ سنگین جرم ہے جسے نہ کوئی غیرت منداور باضمیر انسان معاف کر سکتا ہے اور نہ بھول سکتا ہے، یہ زخم زندگی بھر مندمل نہیں ہو سکتے "۔ ملا عبدالسلام ضعیف کو پشاور سے سمندر میں کھڑے امریکی بحری جہاز میں لے جایا گیا، وہاں اسے ہر روز شدید تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا، تین بائی چھ فٹ کے قبر نما کمرے میں بند کر دیا جاتا تھا، ہاتھ پاؤں باندھ کر گٹھڑی سا بنا کر پھینک دیا جاتا تھا، پانی اور کھانا نہ ہونے کے برابر دیا جاتا تھا۔

انہیں وہاں سے گٹھڑی کی طرح باندھ کر بگرام لایا گیا، وہاں انہیں شدید سردی میں ننگا لٹا دیا جاتا تھا، ان کے ساتھ دوسرے قیدی بھی تھے اور یہ سب رو رو کر اللہ سے موت کی دعا کرتے تھے کیوں کہ بگرام کی زندگی سے موت ہزار گنا بہتر تھی، ملا ضعیف کو پھر بگرام سے قندھار شفٹ کر دیا گیا، یہ ان کی زندگی کا مشکل ترین دور تھا، یہ پانچ ماہ قندھار میں رہے جس دوران انہیں ہاتھ منہ نہ دھونے دیا گیا، پینے کے لیے چند قطرے پانی دیا جاتا تھا اور یہ اگر اس سے ہاتھ گیلا کر کے منہ پر پھیرتے تھے تو انہیں بدترین سزا دی جاتی

تھی، کھانے سے بو آتی تھی، قیدیوں کو سور کا گوشت کھلایا جاتا تھا، رفع حاجت کے لیے 20 افراد کو دو بالٹی پانی دیا جاتا تھا اور واش روم سے پہرے داروں کی نگرانی میں فارغ ہونا پڑتا تھا، قید خانے میں اور بھی قیدی تھے، تمام کو روزانہ تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا، قندھار میں ایک امریکی فوجی نے سب کے سامنے قرآن مجید پر..... کیا اور پھر اٹھا کر سب کے سامنے..... کے ڈرم میں میں پھینک دیا، اس رات جیل کے تمام قیدی زار و قطار روتے رہے۔

ملا عبدالسلام ضعیف کو آخر میں قندھار سے گوانتاناموبے شفٹ کر دیا گیا، یہ جہاز میں بارہ گھنٹے بندھے رہے، بازو اور ہاتھ سوج گئے جن کی وجہ سے ان کے ہاتھ تین ماہ بے حس رہے، گوانتاناموبے کی جیل قندھار اور بگرام سے بھی خوفناک تھی، ان کے سامنے بے شمار قیدی بیمار ہو کر فوت ہو گئے، بے شمار پاگل ہو گئے اور بے شمار تشدد کے دوران ہلاک ہو گئے، گوانتاناموبے کا احوال خون آشام تھا اور یہ پڑھ کر یقین نہیں آتا کیا انسان بھی انسانوں کے ساتھ یہ سلوک کر سکتے ہیں، بہر حال چار سال کی مسلسل اذیت اور ظلم کے بعد عبدالسلام ضعیف کو افغان حکومت کے حوالے کر دیا گیا اور یہ کابل کے مضافات میں اپنے خاندان کے ساتھ گمنامی کی زندگی گزارنے لگے لیکن امریکی تشدد اور جنرل پرویز مشرف کے ساتھیوں کی زیادتیاں ابھی تک ان کے ذہن میں تازہ ہیں، یہ دوبارہ نارمل نہیں ہو سکے۔ یہ صرف ملا عبدالسلام ضعیف کی داستان نہیں، ایسے لاکھوں لوگ تھے اور یہ لاکھوں لوگ امریکا کے ساتھ احمد شاہ مسعود کے رقص بسمل کا شکار بھی ہوئے اور رشید دوستم کے کنٹینروں میں بھی دم گھٹنے سے مر گئے۔ رشید دوستم کے مظالم کا ذکر کرنے کیلئے الفاظ بھی منہ چھپا کر دہائی دینا شروع کر دیتے ہیں۔

میں بھی کسی حد تک طالبان کے پہلے طرز حکمرانی پر نالاں تھا کہ انہوں نے معاشرے کو غیر ضروری بندشوں کا شکار بنا دیا تھا، خواتین کو گھروں تک محدود کر دینا، لڑکیوں کی تعلیم پر پابندی لگا دینا، داڑھی اور برقعے کو قانون بنا دینا اور پوری دنیا کے ساتھ "آڈہ" لگا لینا یہ حماقت تھی لیکن امریکا اور اس کے

اتحادیوں نے طالبان کے ساتھ جو کیا ہم اسے بھی کسی طرح مہذب قرار نہیں دے سکتے، یہ بھی بے انتہا ظلم تھا اور یہ ظلم اب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے یہاں تک کہ امریکا کو 6 ٹریلین ڈالر کے اخراجات، 20 سال کے قبضے اور اڑھائی ہزار فوجیوں کی لاشوں کے ساتھ بالآخر 30 اگست کو افغانستان سے واپس لوٹنا پڑ گیا جس کے بعد علامہ اقبال کی پیشن گوئی سچ ثابت ہو گئی، افغان باقی..... کہسار باقی..... الحکم اللہ..... الملک اللہ۔

افغانوں نے تیسری سپر پاور کو شکست دے کر ثابت کر دیا قوم اگر ڈٹ جائے تو پھر جارح برطانیہ ہو، روس ہو یا پھر امریکا ہو وہ بالآخر واپس جانے پر مجبور ہو جاتا ہے، برطانیہ کے پرانے فوجی کہتے تھے افغانستان پر قبضہ انتہائی آسان ہے، کوئی بھی آئے اور افغانستان پر قابض ہو جائے لیکن کیا وہ افغانوں کو زیر کر سکتا ہے، یہ ناممکن ہے، اسے بالآخر کبھی نہ کبھی افغانستان کو اس کے حال پر چھوڑ کر واپس جانا ہو گا، افغانستان میں 1839ء میں برطانیہ آیا، پہلی افغان اینگلو وار ہوئی، برطانیہ تین سال افغانستان پر قابض رہا لیکن پھر اس کے 16 ہزار فوجی افغانستان کے پہاڑوں میں ذبح ہو گئے، افغانوں نے صرف ڈاکٹر ولیم برائیڈن کو چھوڑا تا کہ وہ باقی زندگی دنیا کو افغانوں کے بارے میں بتاتا رہے اور ڈاکٹر ولیم برائیڈن مرنے تک یہ فریضہ سرانجام دیتا رہا۔

سوویت یونین بھی 1979ء میں آیا، دس سال رہا لیکن آخر میں خود ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور تیسری طاقت امریکا تھا، یہ بیس سال افغانستان میں رہا لیکن آخر میں کیا نتیجہ نکلا؟ میجر جنرل کرس ڈونا ہونے کابل ائیر پورٹ کو ہاتھ ہلا کر گڈ بائی کہا اور امریکا بھی افغانستان سے واپس لوٹ گیا جس کے بعد طالبان آئے، کابل ائیر پورٹ پر کھڑے ہو کر اذان دی، صف بہ صف کھڑے ہو کر باجماعت نماز ادا کی اور دنیا کو یہ بتا دیا، یہ زمین صرف اور صرف اللہ کی ہے اور اللہ اگر نہ چاہے تو دنیا کی واحد سپر پاور بھی بیس سال میں طالبان جیسے بے آسرا لوگوں کو دبا نہیں سکتی، امریکا بھی پہاڑوں کے غاروں میں رہنے اور رات کے باسی ٹکڑے قہوے میں بھگو کر کھانے والے طالب علموں کا مقابلہ نہیں کر سکتا، طالبان اور افغانوں نے ثابت کر دیا اگر آسمان والا آپ کے ساتھ ہے تو پھر زمین کی کون کون سی طاقتیں آپ کے خلاف ہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور اگر اوپر والا آپ کے ساتھ نہیں ہے تو پھر آپ برطانیہ یا روس ہوں یا پھر امریکا، آپ طالبان جیسے بے سروسامان لوگوں سے بھی ہار جاتے ہیں، بے شک اللہ ہی اکبر ہے اور یہ ہی رہے گا۔

سوال یہ ہے کہ ہم دنیا کی سپر پاور کے سامنے افغانوں کی فتح میں خود کو بڑا حصہ دار سمجھتے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اللہ کی مرضی کے خلاف آئی ایم ایف اور دیگر اداروں کے سامنے ڈھیر ہو گئے ہیں۔ بدنصیبی تو یہ ہے کہ مدینہ ریاست کا دعویٰ کرنے والوں نے اپنے عزم کو اپنے ہی ہاتھوں پامال کر دیا۔ مدینہ ریاست کے حکمرانوں سے کڑی شرائط کے ساتھ سالانہ 4 فیصد سود پر تین ارب ڈالر لیکر کس منہ سے مدینہ ریاست کا نام لے رہے ہیں۔ اُن بیکس اور فاقہ مست پڑوسی طالبان کو ہی دیکھ لیتے کہ اس وقت ایک عالمی رپورٹ کے مطابق آدھی افغان آبادی قحط اور بھوک کا شکار ہے، ان کے 90 لاکھ بچے غذائی اور ادویات کی قلت کی بناء پر زندگی اور موت کے خطرے سے دوچار ہیں۔ اس حالت میں چین کی مدد کو اس لئے ٹھکرا دیا کہ اس کے ساتھ "سروسز" کے نام پر سود عائد کیا گیا تھا۔ آپ مالک الملک کی یہ تنبیہ کیوں بھول گئے:

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنسَوْنَ أَنفُسَكُمْ وَأَنتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴿البقرة :44﴾

تم دُوسروں کو تو نیکی کا راستہ اختیار کرنے کے لیے کہتے ہو، مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟ حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو، کیا تم عقل سے بالکل کام نہیں لیتے؟

بروز منگل 29 جمادی الآخر 1443ھ یکم فروری 2021ء

"إِيَّاكَ نَعْبُدُوَ إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ"

امریکا کے سابق صدر جان ایف کینیڈی نے امریکیوں سے کہا تھا: یہ مت دیکھو ملک نے تمہیں کیا دیا ہے بلکہ یہ دیکھو کہ تم نے ملک کو کیا دیا ہے؟ جان ایف کینیڈی کا یہ فقرہ امریکا کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ کینیڈی نے یہ بات 1960ء کی دہائی میں کہی تھی مگر یہ جملہ وہاں آج تک کوٹ ہوتا ہے بلکہ کبھی کبھی تو اس سے اوور کوٹ کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ کیا یہ کوئی بڑا فقرہ ہے؟ امریکا میں اس کی مقبولیت سے تو یہی لگتا ہے لیکن امریکیوں کی حب الوطنی جہاں ختم ہوتی ہے، مسلمانوں کی حب الوطنی وہاں سے شروع ہوتی ہے۔ کیا آپ کو یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ مولانا مودودی نے پاکستان کے بارے پاکستان کی تزئین و آرائش مسجد کی میں کیا کہا تھا؟ مولانا نے فرمایا تھا: پاکستان ہمارے لئے مسجد کی طرح ہے، یعنی پاکستان کا دفاع مساجد کا دفاع ہے، تزئین و آرائش ہے اور جس جس نے یہاں کوڑا کرکٹ اور غلاظت پھیلائی ہے، اس نے مسجد کو آلودہ کیا ہے اور مسجد اللہ کا گھر ہے۔ ذہن مغرب کا ہو یا مشرق کا، وہ صرف جغرافئے میں یہ تقدیس پیدا نہیں کر سکتا۔

جغرافیہ تو مسجد کا بھی ہوتا ہے لیکن مسجد کے جغرافیے میں ایک نظم اور ایک ڈیزائن بھی ہوتا ہے۔ اس کا گنبد، اس کے مینار، اس کا منبر، اس کی محرابیں اور اس کا صحن۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ڈیزائن یونہی بنا دیا گیا ہوگا انہیں اسلام کی تخلیقی اور تہذیبی روح کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔ لیکن یہ مسجد کے علامتی بندوبست پر گفتگو کا موقع نہیں۔ یہاں کہنے کی اصل بات یہ ہے کہ پاکستان مسجد ہے اور اس کا اپنا گنبد، مینار اور منبر و محراب ہیں۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس امر کی وضاحت ضروری ہے۔ گزارش ہے کہ جو لوگ مسجد جاتے ہیں انہیں اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ گنبد کسے کہتے ہیں اور مینار کسے کہا جاتا ہے اور ان علامتوں سے ہمارا کیا روحانی، تاریخی اور تہذیبی رشتہ ہے۔

مغربی ذہن اپنی نہاد میں افادی ہے۔ وہ لین دین، فائدے اور نقصان کے حوالے سے سوچتا ہے۔ چنانچہ اس کے بلند ترین معیارات بھی یہیں سے آتے ہیں۔ کینیڈی نے کچھ بھی نہیں کیا، اس نے صرف تعلق کو الٹ دیا۔ لین کو دین میں تبدیل کر دیا۔ اس فقرے کا حسن و جمال اور اس کی ساری "شاعری" یہی سے آتی ہے۔ البتہ ہندوؤں کی نفسیات اور ذہن نے زمین کو بڑی تقدیس عطا کی۔ اسے "ماں" کہا۔ بندے ماترم اس کے اظہار کی اعلیٰ ترین صورت ہے۔ یعنی اے ماں ہم تیری ہی ثناء کرتے ہیں۔ مغربی ذہن یہاں تک بھی نہیں پہنچ سکتا۔ ماں اور اولاد کا رشتہ "افادی" نہیں ہوتا۔ یہ سود و زیاں سے بلند تصور ہے۔ اس کی تعریف میں درجنوں صفحات سیاہ کئے جا سکتے ہیں لیکن مسجد کی علامات میں جو بات ہے اس کے آگے ماں کا تصور بھی ہیچ ہے۔ ماں اور اس کی محبت بڑی چیزیں ہیں مگر ماں بھی مخلوق ہے اور اس کی محبت بھی اور مسجد؟ مسجد تو خالق کا گھر ہے۔ خالق کی محبت کے آگے مخلوق کی محبت کی بھلا کیا اوقات! ماں اور اس کی محبت تو صرف "مفہوم" ہے اور خالق کی محبت معنی کا سرچشمہ۔

تو دشمن کیا سمجھتے ہیں وہ مسجد پر چڑھ دوڑیں گے اور نمازی تماشا دیکھتے رہیں گے؟ پاکستانی قوم فوجی اور جمہوری ڈکٹیٹروں سے سخت نالاں ہے اور اس نے ان پر سخت تنقید کی ہے جس کا ایک لفظ کیا ایک حرف بھی "قابل واپسی" نہیں، لیکن اس کے باوجود دشمن کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ ہمارا گھریلو جھگڑا ہے جو تاریخ کے صفحات پر جاری بھی رہ سکتا ہے اور تاریخ کے بہاؤ میں غرق بھی ہو سکتا ہے چنانچہ دشمن مسجد کی طرف آئیں گے تو انہیں وہاں صرف نمازی ملیں گے۔ کچھ پانچ وقت کے نمازی اور کچھ جمعے کے جمعے آنے والے۔ جب بھی قوم پر ایسا کڑا وقت آیا تو پوری قوم اپنی سپاہ کی پشت پر سیسہ پلائی دیوار کی طرح کھڑی نظر آئی۔ اسی لئے مولانا نے پاکستان کو مسجد قرار دیا تھا۔

مسجد کا ذکر آئے اور اقبال یاد نہ آئیں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آخر انہوں نے دو مسجدوں پر کام کیا ہے۔ پاکستان اور مسجد قرطبہ۔ مسجد قرطبہ جسے محمد حسن عسکری نے اردو شاعری کا تاج محل قرار دیا، شاعری کے سات عجوبوں میں ہمیشہ شامل رہے گی۔

اے حرم قرطبہ عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا حضور جس میں نہیت رفت و بود
تیرا جلال و جمال مردِ خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل
تیری بنا پائیدار تیرے ستوں بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجومِ نخیل

اور پاکستان اقبال کی زیادہ بڑی مسجد ہے۔ زیادہ بڑی، زیادہ حسین، زیادہ جمیل۔ مسجد قرطبہ تو صرف تاریخ اور پاکستان تاریخ کا تسلسل۔

لیکن کیا ہم اس ارضِ وطن کی مسجد کی طرح حفاظت کر رہے ہیں۔ کیا اس ملک کے کسی بھی ادارے کو بطور مثال پیش کر سکتے ہیں؟ ہمیں کبھی نظام مصطفیٰ کے نعرے میں الجھایا گیا، کبھی روٹی کپڑا اور مکان کے نام پر دھوکہ دیا گیا، نئے پاکستان کے نام پر تو برباد کر کے رکھ دیا۔ ہم نے اس معجزاتی ریاست کے حصول کیلئے جو "اوفو بالعہد" کیا تھا کہ ہم اس ملک میں مکمل اللہ کی حاکمیت قائم کر کے بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں دیں گے، ہمیں اگر اللہ نے رکوع و سجود کی توفیق عنائت کی تو ہر روز در جنوں مرتبہ "اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ" کا عہد دہراتے ہیں لیکن جونہی سلام کیلئے دنیا کی طرف منہ پھیرتے ہیں تو اپنے اس بار بار کئے گئے عہد کو فراموش کر دیتے ہیں۔ ہم کیوں بھول جاتے ہیں کہ لغت میں عبادت کہتے ہیں ذلت اور پستی کو، طریق معبد اس راستے کو کہتے ہیں جو ذلیل ہو۔ اسی طرح بغیر معبد اس اونٹ کو کہتے ہیں جو بہت دبا اور جھکا ہوا ہو اور شریعت میں عبادت نام ہے محبت، خشوع، خضوع اور خوف کے مجموعے کا۔ لفظ "إِيَّاكَ" کو جو مفعول ہے پہلے لائے اور پھر اسی کو دہرایا تا کہ اس کی اہمیت ہو جائے اور عبادت اور طلب مدد اللہ ہی کیلئے مخصوص ہو جائے تو اس جملہ کے معنی یہ ہوئے کہ ہم تیرے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے اور نہ کریں گے اور تیرے سوا کسی پر بھروسہ نہیں کرتے اور نہ کریں گے۔ کامل اطاعت اور پورے دین کا حل صرف یہی دو چیزیں ہیں۔ بعض سلف کا فرمان ہے کہ سارے قرآن کا راز سورۃ فاتحہ میں ہے اور پوری سورت کا راز اس آیت "إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ" میں ہے۔ آیت کے پہلے حصہ میں شرک سے بیزاری کا اعلان ہے اور دوسرے جملہ میں اپنی طاقتوں اور قوتوں کے کمال کا انکار ہے اور اللہ عزوجل کی طرف اپنے تمام کاموں کی سپردگی ہے۔ اس مضمون کی اور بھی بہت سی آیتیں قرآن پاک میں موجود ہیں۔ جیسے فرمایا (فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ۔ ہود: 123) یعنی اللہ ہی کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسہ کرو تمہارا رب تمہارے اعمال سے غافل نہیں۔ فرمایا:

(قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا: الملک: 29) کہہ دے کہ وہی رحمان ہے ہم اس پر ایمان لے آئے اور اسی پر ہم نے توکل کیا: فرمایا آیت (رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا: المزمل: 9) یعنی مشرق مغرب کا رب وہی ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں تو اسی کو اپنا کارساز سمجھ۔ اس آیت میں اللہ سے خطاب کیا گیا ہے جو نہایت لطافت اور مناسبت رکھتا ہے اس لئے کہ جب بندے نے اللہ کی صفت و ثنا بیان کی تو قربِ الٰہی میں حاضر ہو گیا، اللہ جل جلالہ کے حضور میں پہنچ گیا، اب اس مالک کو خطاب کر کے اپنی ذلت اور مسکینی کا اظہار کر کے کہنے لگا کہ "الٰہ" ہم

تو تیرے ذلیل غلام ہیں اور اپنے تمام کاموں میں تیرے ہی محتاج ہیں۔ اس آیت میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی بہترین صفات پر اپنی ثناء آپ کی تھی اور بندوں کو اپنی "ثناء" انہی الفاظ کے ساتھ بیان کرنے کا ارشاد فرمایا تھا۔ لیکن کیا واقعی ہم نے کبھی اس آیت کو پڑھنے سے قبل اس کے معنی پر غور کیا؟ ہم تو نماز کے علاوہ اپنی تقریر کا آغاز بھی اسی آیت سے کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم عالمی مالیاتی اداروں کے پاؤں پکڑ کر ان سے سودی قرضوں کی منت سماجت کر رہے ہوتے ہیں اور وہ ہماری اس منافقت کو خوب سمجھ گئے ہیں، اسی لئے وہ آئے دن اپنی کڑی شرائط کے ساتھ ہمارا نرخرہ دباتے رہتے ہیں۔

بروز جمعرات 2 رجب المرجب 1443ھ 3 فروری 2021ء

آنسوؤں کا سورج اور یقیں محکم

جس کے پاس یقین کی دولت ہو اس سے بڑا کوئی خوش نصیب نہیں ہوتا۔ صرف یقین نہیں، یقین محکم.....! اس طرح کا یقین کہ چاہے کچھ ہو جائے، دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے، سورج نکلے گا اور نکلے گا بھی مشرق سے۔ یہ ظلمت شب ختم ہو گی، اندھیرا ختم ہو گا، ان ظالموں کی پسپائی ہو گی اور سچ کی کرنیں ان کو نگل لیں گی..... دراصل یہی ہے اسرار کائنات جس پر فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے، تدبر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔۔۔۔ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ-وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (النساء:82) تو کیا غور نہیں کرتے قرآن میں اور اگر وہ غیر اللہ کے پاس اس میں بہت اختلاف پاتے۔ یقین کامل ہو تو کشتی کتنی ہی شکستہ کیوں نہ ہو بالآخر کنارے پر لگ ہی جاتی ہے چاہے چاروں طرف سونامی سے ہوتا تو ضرور جیسے طوفانوں نے گھیر رکھا ہو لیکن وہ جو اپنے تکبر اور غرور کے ٹائی ٹینک پر بڑے نازاں ہوتے ہیں ان کی تباہی اور بربادی کا عبرتناک منظر بھی تاریخ کے اوراق میں موجود رہتا ہے تاکہ کوئی ان سے سبق سیکھ سکے۔ وَ لَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَ لَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ۔ نہ زمین میں اکڑ کر چل، اللہ کسی خوپسند اور فخر جتانے والے شخص کو پسند نہیں کرتا۔

ہم اپنی زندگی میں بھی اس کے مظاہر دیکھتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں ناں کہ فلاں جان تو دیدے گا لیکن میرا اعتماد نہیں توڑے گا، مجھے اس پر پورا یقین ہے، لیکن اکثر یہ خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوتے لیکن ایسا بھی ناممکن نہیں۔ یہ انسانوں کی بستی ہے، ہر طرح کے لوگ ہیں یہاں۔ بدلتے موسم کی طرح بدلتے گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والے لوگ! منہ پر مکر جانے والے لوگ! لاکھ کہیں آپ نے یہ کہا تھا... کہیں گے نہیں، بالکل نہیں! "نہیں نہیں لوگ، آپ سمجھے نہیں، میں نے یہ نہیں کہا" تحریری معاہدوں کی کوئی حیثیت نہیں، ایک کاغذ کا ٹکڑا ہی تو ہے اور پھر یہ کون سا قرآن و حدیث ہے؟ آپ سوچتے رہ جاتے ہیں کہ حلف اٹھانا تو کوئی بات ہی نہیں، کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے یہاں!

لیکن یہ ڈاکٹر فوزیہ صدیقی کس مٹی کی بنی ہوئی ہے کہ مسلسل کئی سالوں سے اپنے آنسوؤں کا ڈھول ہر محاذ پر پیٹ رہی ہے۔ یہ اکیلی منزل کے حصول پر نکلی لیکن اب ایک ایسے قافلے کی میر کارواں بن گئی ہے کہ اس کو جھٹلانے والے پریشان و پشیماں ہیں۔ اسلام آباد کی سڑکیں، پارلیمنٹ کے ارکان اور میڈیا بھی اس کی ہمت کو سلام پیش کر رہے ہیں۔ آپ میں اخلاص ہو تو قسمیں کھانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ میرا ماننا ہے کہ اپنی نیت خالص مت رکھو، ہر شے سے بے نیاز اخلاص نیت! اگر آپ اخلاص نیت سے کام کرتے ہیں اور وہ بگڑ بھی جائے تو اندر سے آواز آتی ہے رکھو، کسی توقع کی امید کہ میں نے تو بہت اخلاص سے یہ کام کیا تھا اس کے نہ ہونے میں بھی کوئی اللہ کی مرضی ہو گی، کوئی پچھتاوا نہیں ہوتا، اور اگر آپ نے بری نیت سے کوئی پھل پھول دینے لگ گیا، واہ واہ بھی ہونے لگی لیکن اندر سے آواز پیچھا نہیں چھوڑتی،، کام تو ٹھیک ہو گیا لیکن نیت اچھا کام کیا ہے اور وہ بارآور بھی ہو گیا، لینا، اندر سے سرشار ہونا چاہئے۔ تو ٹھیک نہیں تھی ناں، باہر کی واہ واہ سے کیا

باہر سے بنجر ہوں لیکن اندر سے شاداب

بس یہ ہے اصل، اور کچھ نہیں!

ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، لوگوں نے گائے بھینسیں پالی ہوئی تھیں اور ان کا دودھ شہر میں آکر بیچا کرتے تھے۔ شہر اور گاؤں کے درمیاں ایک بڑی پر زور ندی تھی۔ سب گوالوں کے پاس اپنی اپنی مضبوط کشتیاں تھیں اور وہ صبح سویرے ہی شہر کا رخ کر کے دودھ فروخت کر کے گھر لوٹ آتے تھے مگر ان میں ایک

ایسا بھی تھا جس کے پاس غربت کی بناء پر کوئی سواری نہیں تھی اور وہ دوسروں کے رحم و کرم پر تھا۔ اگر کسی کو اس غریب پر ترس آجاتا تو اپنے ساتھ کشتی پر سوار ہونے کی اجازت دے دیتا و گرنہ اکثر دھتکار دیا جاتا۔ اپنی اس غربت کے ہاتھوں بہت پریشان تھا۔

ایک دن اسے کسی نے شہر میں ایک باباجی کا پتہ دیا، اپنی قسمت آزمائی کیلئے وہاں پہنچا، روتے ہوئے اپنی بپتا سنائی، باباجی نے مذاق میں کہہ دیا" تجھے اللہ پر یقین ہے ناں؟" تو وہ غریب فوری بولا" جی! پکا یقین ہے" تو باباجی بولے کہ آئندہ ندی کے اس کنارے آنکھیں بند کر کے اللہ کو یاد کر کے ندی میں پاؤں رکھنا، ندی تمہیں خود ہی دوسرے کنارے پہنچادے گی اور اسی طرح واپسی کا سفر بھی طے کر لینا۔" دوسرے دن وہ ندی پر پہنچا اور باباجی کے بتائے ہوئے طریقہ پر عمل کیا، اور جب کھولیں تو ندی کے دوسرے کنارے پر تھا۔ بہت خوش ہوا وہ۔ اب تو اس کا معمول تھا کہ ندی پر آتا، پورے یقین سے آنکھیں بند کر کے ندی میں پاؤں رکھتا اور پار چلا جاتا۔ رب نے برکت دی اور اس کا کام چل نکلا۔

ایک دن اسے خیال آیا کہ میں بھی کس قدر خود غرض ہوں، جس نے مجھے یہ راہ دکھائی میں اسے تو بھول ہی گیا۔ یہ خیال آتے ہی سارے کام کاج چھوڑ کر انہی باباجی کے پاس پہنچا جو اپنے چیلوں کے درمیاں گپ شپ میں مصروف تھے۔ سلام کیا اور ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ باباجی پہلے تو نظریں چراتے رہے لیکن پوچھ لیا کہ کیسے آئے ہو۔ اس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے باباجی کو تمام چیلوں سمیت گھر میں کھانے کی دعوت دی جو باباجی نے فوری قبول کر لی۔ بابا جی اپنے مریدوں کے ساتھ اس غریب کے گھر جانے کیلئے جب ندی کے کنارے پہنچے تو وہ وہاں ان سب کے استقبال کیلئے موجود تھا۔ بہت خوش ہوا وہ، بابا جی سے کہا: چلئے آیئے، تو باباجی بولے کہ میاں کشتی کہاں ہے؟ تب وہ بہت حیران ہوا، اور کہنے لگا کہ باباجی آنکھیں بند کیجئے اور اللہ کا نام یاد کریں تو ندی آپ کو خود ہی دوسرے کنارے پر پہنچادے گی۔ اس نے آنکھیں بند کیں اور دوسرے کنارے جب پہنچا تو دیکھا کہ باباجی ابھی دوسرے کنارے پر ہی سے باباجی کو جب پکارا تو باباجی نے بڑے غصے سے کہا کہ تم نے ہمیں ندی میں غرق ہونے کو بلایا ہے؟ تجھے تمہارا یقین کھڑے ہیں۔ اس نے بلند آواز مبارک!

میں اپنے ارد گرد عجیب سے حالات دیکھ رہا ہوں۔ عجیب عجیب سے لیکچر سن رہا ہوں۔ لیکن ان سے ہو کچھ بھی نہیں رہا.... بس شور بڑھ رہا ہے اور سماعت متاثر ہو رہی ہے اور کچھ بھی نہیں..... اس لئے کہ سچائی کیلئے زبان صادق کا ہونا بہت ضروری ہے۔ مجبور و مقہور ڈاکٹر فوزیہ اور ان کی ٹیم ہر جگہ اس امید پر دہائی دے رہی ہے کہ شائد ان پتھروں میں کوئی سوراخ ہو سکے۔ ہر کوئی اس کو جھوٹی تسلی دیکر اس کے زخموں سے کھیل رہا ہے۔ اقتدار کے ایوانوں میں بیٹھے افراد میڈیا کے سامنے مجبور و مقہور فوزیہ کو بھی دیکھ رہے ہیں، حکمران پارٹی کی ایک خاتون وزیر نے میرے بھرپور گلہ و شکائت کرنے پر سب کے سامنے اپنی بے بسی کا جب اظہار کیا تو مجھ سے رہا نہ گیا اور کہنا پڑا کہ کیا جھوٹ بولنے والوں کے ہاتھوں مدینہ ریاست کا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکتا ہے؟ حالانکہ اسی خاتون وزیر کے پہلے دور میں ہی پاکستان سے ایک کثیر تعداد کو قصر فرعون کے فرعون کے ہاتھوں بیچا گیا۔ اسلام آباد کی انہی سڑکوں پر فوزیہ اور ان کے ساتھی بارہا مقتدر حلقوں کو ان کے وعدے یاد دلاتے رہتے ہیں۔ ان سب کا محض یہ قصور ہے کہ یہ سب قوم کی بیٹی عافیہ کی رہائی کیلئے کئے گئے وعدوں کی تکمیل چاہتے ہیں لیکن کیا مجال ہے کہ ان کو اپنے وعدوں کا کوئی پاس ہو یا اس خیانت کے جرم کا کوئی احساس ہو۔ ان کے تکبر کا تو یہ حال ہے کہ جس ملک کے ولی عہد کے پاؤں پکڑ کر سود پر قرض لیتے ہیں،

انہی کے سفیر کے سامنے اس طرح اکڑ کر متکبرانہ انداز میں ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ کر تصویر بنواتے ہیں گویا کسی مفلوک الحال ملک کا فقیر کوئی التجا کرنے دربار میں باریابی کیلئے حاضر ہوا ہے۔ مجھے یاد ہے جب یہی خاتون وزیر کمانڈو صدر کی تعریف کرتے ہوئے تھک نہیں رہی تھی تو اس وقت بھی میرے اس مطالبے نے ان کے منہ کا ذائقہ بدل دیا تھا اور آج ایک سوال پر اپنی سیاست کو چمکانے کیلئے ڈاکٹر عافیہ صدیقی کے ساتھ ایسی ہمدردی لیکن نتیجہ لاحاصل!

ڈاکٹر فوزیہ اور میڈیا کے توسط سے کئی مرتبہ یہ امید ہوئی کہ شائد اب ڈاکٹر عافیہ پر تعذیب کا دور ختم ہو جائے گا جبکہ ڈاکٹر عافیہ نے اپنے خصوصی پیغام میں نہ صرف شدت سے پاکستان آنے کی خواہش کا اظہار کیا اور عمران خان کو نہ صرف اپنا ہیرو بھی بتایا بلکہ جیل سے بھی عمران خان کیلئے عالم اسلا کا خلیفہ بننے کی دعاؤں کا بھی ذکر کیا۔ ان کی بہن ڈاکٹر فوزیہ نے خود میڈیا میں بڑے دکھ کے ساتھ اس کا ذکر کیا کہ عافیہ صدیقی کو امریکی جیل حکام یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر تم اپنا دین بدل لو تو تمہیں فوراً رہا کر دیں گے۔ فوزیہ صدیقی کا مزید کہنا تھا کہ رپورٹ کے مطابق عافیہ صدیقی کو جنسی طور پر بھی ہراساں کیا جاتا ہے اور انہیں عبادت بھی نہیں کرنے دی جاتی۔

فوزیہ صدیقی کا کہنا ہے کہ اب بھی عافیہ صدیقی کو واپس لانے کے تین راستے ہیں۔ پہلا تو یہ کہ پاکستان اُس عالمی معاہدے کا شریک بن جائے جس میں مجرمان کو اپنے ملک منتقل کیا جا سکتا ہے۔ امریکا پہلے سے ہی اس معاہدے پر دستخط کر چکا ہے تاہم پاکستان اس معاہدے کا رکن نہیں۔ اس حوالے سے درکار ایک قانونی نقطہ عافیہ صدیقی کی جانب سے اس منتقلی کی درخواست تھی اور فوزیہ صدیقی کے مطابق عافیہ صدیقی کی جانب سے عمران خان کو پیغام اسے سلسلے کی ایک کڑی تھا جس پر آج تک عمل نہیں کیا گیا اور نہ ہی اس کی کوئی وجہ بتانے کو کوئی تیار ہے۔

فوزیہ صدیقی کا یہ چشم کشا دعویٰ ساری قوم کو سمجھنے پر مجبور کر رہا ہے کہ آخر جب امریکا کے نائب اسسٹنٹ اٹارنی جنرل بروس شوارٹس نے ایک خط میں آفر کی تھی کہ اگر پاکستان اس معاہدے میں شرکت کر لیتا ہے تو امریکا عافیہ صدیقی کو واپس بھیجنے کیلئے تیار ہے اور ایک اطلاع کے مطابق آج بھی یہ خط۔ پاکستانی حکام کے پاس موجود ہے۔ قوم نئے پاکستان بنانے والوں سے یہ مسلسل یہ مطالبہ کر رہی ہے کہ اس مجبور و مقہور بیٹی کے ساتھ اس ناروا سلوک کیا جواز ہے؟

فوزیہ صدیقی کا کہنا ہے کہ عافیہ کو پاکستان لانے کا دوسرا راستہ امریکا اور پاکستان کے مذاکرات تھا اور مریکا کی طرف سے مثبت اشاروں سے وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی کو آگاہ بھی کیا گیا تھا جبکہ اس ملاقات کیلئے کراچی سے اسلام آباد تک سفر کرنے والی ڈاکٹر فوزیہ کو باوجود وعدے کے طوہاً گرہاً چند منٹ دیئے گئے ،ان کے اس ناروا سلوک سے ہی پتہ چل گیا ہے کہ انہوں نے ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی رہائی کیلئے کس قدر اپنی ذمہ داری کو پورا کیا ہو گا۔

تیسرا راستہ صدارتی معافی کا ہے۔ اگر یاد ہو تو اوباما کے دورِ حکومت میں عافیہ صدیقی کی صدارتی معافی کی تیاری کی جا رہی تھی تاہم پاکستانی حکومت نے بروقت کارروائی نہیں کی۔ اس جرم عظیم کے مرتکب ذمہ داروں پر آج تک اگر یہاں کوئی کاروائی نہیں ہو سکی تو یقیناً ڈاکٹر عافیہ پر ہونے والے مظالم پر اس کی، اس کے بچوں، فوزیہ بہن اور بوڑھی ماں کی منتظر آنکھوں اور دل سے نکلتی ہوئی آہوں کی شکل میں ایک بہت ہی مضبوط "ایف آئی آر" کٹ چکی ہے اور اس مقدمے میں ملوث تمام مجرموں کی سزا کیلئے ایک ہی ایف آئی آر کافی ہے۔

مجھے لگتا ہے کہ ہمیں بے یقین رہبروں نے گھیر لیا ہے، چاروں طرف جعلی پن..... یہ بے یقین رہبر اپنی قوم سے کئی سالوں سے ایسی باتیں کر رہے ہیں جن پر ان کو خود بھی یقین نہیں ہے اور اب اگلے انتخاب سے قبل ایک مرتبہ پھر جھوٹی ہمدردی، جھوٹے دلاسے اور اپنی مجبوریوں کا تذکرہ کر کے یہ پرانے شکاری نئے جال میں پھانسنے کی تدابیر پر عمل پیرا ہیں۔ بس یہی مسئلہ ہے ہمارا۔

میرے رب! ہمیں وہ رہبر دے جسے اپنے کہے پر یقین کامل ہو، یہ طوفان بلاخیز ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا۔ بس ضرورت ہے یقین کامل کی، اور ہم سب اتنا تو جانتے ہیں ناں کہ کل کا سورج ضرور طلوع ہو گا، اور ہو گا بھی مشرق سے، آپ یقین رکھئے یہ جو چاروں طرف اندھیرا ہے ناں گھپ اندھیرا..... یہ تو ایک جگنو جتنی روشنی کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتا، ضرور طلوع ہو گا سورج اور پسپا ہو گا یہ اندھیرا..... فوزیہ! تم اپنے آنسوؤں کا سورج اس یقین کے ساتھ جلائے رکھو کہ انہی چراغوں سے اب ایسی روشنی ہو گی کہ اندھیرے اب کبھی لوٹ کر واپس نہ آئیں گے۔ یقین رکھو کہ میرا علیم الصدور اور کارساز رب ہر اس آنسو سے واقف ہے جو تم سب نے اس کڑی آزمائش میں مسکراتے ہوئے اپنی پلکوں کے پیچھے چھپا کر رکھے ہیں۔ میرا رحیم و کریم اور چیونٹی کے چلنے کی آواز سننے والا رب ڈاکٹر عافیہ صدیقی کے اس حافظ بیٹے کی مناجات کو ضرور سن رہا ہے اور بوڑھی ضعیف والدہ کے تکلیف اور صدمے سے نڈھال اٹھتے ہوئے ہاتھوں کی لاج ضرور رکھے گا کہ میرا مالک الملک رب تو ہم سب کی شہ رگ سے زیادہ قریب بستا ہے، بس یقیں محکم کے احساس کی ضرورت ہے۔ زمانہ گواہ ہے کہ اندھیروں کے یہ تمام سفیر اور ابلیس کے گماشتے جو اس وقت اقتدار کے نشے میں فرعون بن چکے ہیں، اپنے انجام کو پہنچ کر رہیں گے، ان کے دیئے ایک ایک کر کے بجھ رہے ہیں۔ کچھ بھی نہیں رہے گا، بس نام رہے گا میرے رب کا!

دیکھتی ہے جوں ہی پسپائی پہ آمادہ مجھے
روح کہتی ہے بدن سے، بے ہنر میں بھی تو ہوں
دشت حیرت کے سفر میں کب تجھے تنہا کیا
اے جنوں میں بھی تو ہوں، اے ہم سفر میں بھی تو ہوں

بروز جمعۃ المبارک 3 رجب المرجب 1443ھ 4 فروری 2021ء

حق کسی آمیزش کو نہیں مانتا

ہاں بہت ہاتھ پاؤں مارتا ہے انسان... بہت کوشش، بہت تگ ودو... کس لیے ؟اس لیے کہ وہ سکون سے رہے، آرام سے رہے، محفوظ رہے۔ ناموری سکون سے رہنا چاہتا ہے کا خواہش مند ہوتا ہے وہ... واہ، واہ سننا چاہتا ہے داد و تحسین کا طالب اور چہار دانگ عالم میں تشہیر... بس یہی ہے۔ ہوتا رہتا ہے۔ اور بے سکون آرام فوم کے گدوں پر سونے سے ملتا نہیں ہے، لاکھ توپ و تفنگ پاس ہو، اپنوں سے بھی ڈرتا رہتا ہے۔ سائے سے بھی ڈر جانے والا۔ ناموری کے شوق میں ایسی ایسی بے ہودہ حرکتیں سرزد ہو جاتی ہیں اُس سے کہ بس۔ چہار جانب بچہ جمہورے واہ، واہ کرتے رہتے ہیں اور خلقِ خدا تھو تھو۔ داد و تحسین کیلئے نت نئے ڈرامے اور اداکاری... لیکن ذلت لکھ دی جاتی ہے۔ میں غلط کہہ گیا ہوں، اپنی ذلت ورسوائی کا سامان ساتھ لیے پھرتا ہے وہ۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وقت کا گھوڑا اسے اپنے سموں تلے روندتا ہوا نکل جاتا ہے۔

سامان سو برس کا ہوتا ہے اور پل کی خبر نہیں ہوتی۔ اپنی انا کے بت پوجنے والا کب کسی کو خاطر میں لاتا ہے ! بس ذرا سا اختلاف کیجیے تو چڑھ دوڑتا ہے اپنے لشکر کو لے کر، یہ جانتے بوجھتے بھی کہ لشکروں کو پرندوں کا جھنڈ کنکریاں مار کر کھائے ہوئے بھس میں بدل دیتا ہے۔ عبرت سرائے ہے یہ۔ لیکن نہیں مانتا وہ۔ وہ ناز کرتا ہے اپنے لشکر پر۔ اور دنیائے فانی میں کوئی سدا نہیں جیتا۔ اپنے سینے پر سجے تمغے دیکھ کر نہال ہو جانے والے بھی تنہا اور لاچار ہو جاتے ہیں اس لیے کہ زندگی پر موت کا پہرا ہے اور موت کسی سے خائف نہیں ہوتی۔ ہاں وہ کسی چار دیواری، کسی پناہ گاہ، کسی قلعے، کسی نسب، کسی منصب و جلال، کسی لشکر کو نہیں مانتی، دبوچ لیتی ہے... اور پھر ایسا کہ سامان سو برس کا ہوتا ہے، جو دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے۔ جسم کے پنجرے کو توڑ کر موت اچک لیتی ہے اس کی روح۔

موت تو خیر آتی ہے، موت سے پہلے بھی کبھی موت آجاتی ہے۔ وہ موت اور بھی بے حس ہوتی ہے۔ ہاں اُس وقت جب زندگی خود بھی گناہوں کی سزا دینے لگتی ہے۔ بے کلی، بے چینی، اضطراب، وحشت، تنہائی... کیا یہ سزا کم ہوتی ہے ! سب کو تہہ تیغ کر کے آگے بڑھ جانے والا سوچتا رہ جاتا ہے لیکن پھر وقت ہاتھ نہیں آتا۔ انہیں بھی برداشت کرنا پڑتا ہے جنہیں کرپٹ کہتا ہے، نہیں آنے کی دھمکیاں دیتا ہے... اس لیے کہ اپنے رب کا غلام نہیں ہوتا وہ ۔ وہ تو طاقتِ عارضی کا ادنیٰ غلام ہوتا ہے، اور جب ارضی خدا اسے کہہ دیں پھر کیا مجال ہوتی ہے کہ انکار کر دیا جائے ! ہاں پھر برداشت کرنا پڑتا ہے جناب۔

انکار کی لذت اُسے محسوس ہوتی ہے جو ربِ کعبہ کا غلام ہو۔ ہاں وہ خائف نہیں ہوتا جسے رب کا قرب نصیب ہو جائے۔ ایک سجدہ ہزار سجدوں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ رب کے بندے تو غلامی کا آغاز ہی انکار سے کرتے ہیں۔ "لا" سے کرتے ہیں، نہیں مانتے وہ ارضی خداؤں کی... وہ ہوتے ہیں اپنے رب کے بندے۔ نفس کی بندگی سے انکاری، جعلی دنیاوی خداؤں کے منکر، بس اک نعرۂ مستانہ "لا" ہر کسی کے مقدر میں کہاں۔ یہ ہے دنیا جناب ! سب ساتھ چھوڑ جاتے ہیں، زندگی خود بھی گناہوں کی سزا دیتی ہے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ انسان کر ہی کیا سکتا ہے جناب ! جو اپنے رب پر بھروسہ کریں انہیں ملتا ہے سکون، انکار کی جرأت اور خوف سے نجات۔ بندہ بشر ہے ہی کیا اپنے سائے سے بھی خوفزدہ۔

میرے رب نے حکم دیا ہے اور اس کے حکم میں ترمیم واضافہ کون کر سکتا ہے ! کوئی بھی نہیں۔ وہی مالک و مختارِ کل ہے۔ وہی بادشاہِ حقیقی ہے۔ کوئی روشن خیال ہو، ماڈریٹ ہو، مفتی ہو، فقیہ ہو... اس کے حکم کو رسول اور پیغمبر بھی نہیں ٹال سکتے۔ بس حکم ہوا اور سر تسلیم خم میرے رب نے حکم دیا ہے "سیدھی

...

سادی بات کرو"اور ہم کیا کرتے ہیں! انسان ہیں، خطا کا پتلہ...اور کون ہے جو نہیں کرتا؟ کون ہے انسانِ کامل؟ لیکن جو دعویدار ہوں، خود کو وارثِ انبیاء کہتے ہوں، محراب و منبر کے نگہباں ہوں، وہ جو رب کا پیغام انسان کو پہنچانے والے ہوں، ان پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ان کی زندگی عکاسی کرتی ہو میرے رب کے احکامات کی۔ اس لئے جو دعویٰ کرے اسے اپنے دعوے کی سچائی میں کچھ تو پیش کرنا ہی ہوتا ہے۔ جو خود کو خطاکار کہیں، عام انسان کہیں، ذمہ داری تو ان پر بھی عائد ہوتی ہے لیکن اتنی نہیں جتنی کسی دعوے دار پر۔ اس لئے کہ عام انسان انہیں دیکھ کر، سن کر پرکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں: کچھ بھی ہیں، ہیں تو یہ تقویٰ کے قریب۔

لیکن گستاخی معاف کریں تو عرض کروں۔ کیا ہو رہا ہے ہمارے ارد گرد! میں کیا لکھوں، آپ خود سنتے ہیں، دیکھتے ہیں، پڑھتے ہیں۔ ہم کیا کہیں کون کرتا ہے سیدھی سادی سچی بات۔ کیا حق مشروط ہوتا ہے، یا حق ماننے کیلئے شرط عائد کر دی جائے؟ میرے ناقص خیال میں حق، حق ہوتا ہے، وہ کسی شرط کو نہیں مانتا۔ حق کسی آمیزش کو نہیں مانتا۔ وہ حق ہوتا ہے اور اس کا صرف ایک مطالبہ ہوتا ہے: وہ حق ہے اسے مانا جائے۔ زندگی کی ڈور ٹوٹتی ہے تو ٹوٹ جائے، انسان در گور ہو جائے تو ہو جائے۔ وہ حق ہے، اس لئے اسے بلا چوں چرا تسلیم کیا جائے۔ جناب علی المرتضیٰ نے ارشاد فرمایا اور کیا خوب فرمایا، قربان ہو جاؤں میں ان پر: "میں اپنے رب کی عبادت جنت کی لالچ اور دوزخ کے خوف کی وجہ سے نہیں کرتا، میں تو اپنے رب کی عبادت اس لئے کرتا ہوں کہ وہ ہے ہی لائقِ عبادت"۔ غور کیجئے ناں اس پر، اور پھر اپنے ارد گرد نظر دوڑائیے۔ اب ان کی نا سمجھی پر کیا بات کی جائے۔ اپنی بہترین پالیسیوں کو ملک کی خوشحالی گرادنتے ہوئے بڑے بڑے دعوے کر رہے تھے لیکن ایک ہی جھٹکے نے سارے کس بل نکال دیئے لیکن ڈھٹائی کا پھر بھی یہ عالم ہے کہ اتنے بڑے سانحے پر کس طرح ڈھٹائی پر اپنی بات پر قائم رہنے کا درس دے رہے ہیں۔ آخر بے پیندہ کا لوٹا اسی کو کہتے ہیں کہ اپنے ہی وزن سے لڑھکتا رہتا ہے۔ جہاں کوئی جماعت اقتدار میں آئی، فوری اس میں شمولیت اختیار کر کے اپنے ہی محسنوں کے کیڑے نکالنے کا کام اسی کے سپرد کر دیا جاتا ہے اور بغیر کسی جھجک اور شرم و حیا کے اپنے نئے آقا کا راتب حلال کر کے اس کی قربت حاصل کر لیتے ہیں۔ اسے تو اس وقت سمجھ آتی ہے جب وقت کا گھوڑا انہیں اپنے سموں تلے روندتا ہوا چلا جاتا ہے اور پھر نعرہ بلند ہوتا ہے "دیکھو جو مجھے دیدۂ عبرت نگاہ ہو"۔ کچھ نہیں رہے گا جناب، کچھ بھی نہیں...بس نام رہے گا اللہ کا۔

کہاں سکندر، کہاں ہے دارا، جام کہاں ہے، جم کا
جن کی تیغ سے دیو بھی کانپیں، دل دہلے رستم کا
ان کی راکھ ملے نہ ڈھونڈے، دنیا کا گھر ہے غم کا
ہاشم، جان غنیمت جانو، نہیں بھروسہ دم کا

وہ دیکھئے اقبال آ کھڑا ہوا۔

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

بروز اتوار 5 رجب المرجب 1443ھ 6 فروری 2021ء

ایران اور اسرائیل حالتِ جنگ میں

اسرائیلی قائدین ایک بار پھر ایران کی جوہری تنصیبات پر حملہ کرنے کی بات کر رہے ہیں جیسا کہ انہوں نے 2013ء میں بھی کیا تھا۔ تب بھی ایران کو جوہری ارادوں کے حوالے سے سنگین نتائج کی دھمکی دی گئی تھی مگر خیر، کچھ کیا نہیں تھا۔ اب سیاسی، سماجی، معاشی اور تزویراتی حالات بہت مختلف ہیں اس لیے اسرائیل کی دھمکی کو سنجیدگی سے لینا چاہیے۔ 2015ء میں جامع ایکشن پلان کی تیاری سے دو سال قبل اسرائیل نے ایران کے جوہری پروگرام کو ختم کرنے کا انتباہ کیا تھا، تب اسرائیل کے وزیر اعظم نیتن یاہو نے کہا تھا "ہماری گھڑیاں اس بار مختلف رفتار سے چل رہی ہیں۔ امریکا بہت دور ہے۔ ہم ایران سے بہت نزدیک ہیں اور اس کیلئے آسان ہدف بھی ہیں۔ ہمیں ایران کو کسی نہ کسی طور روکنے کی طرف جانا ہی ہوگا۔ شاید امریکا کی طرف سے کچھ کیے جانے سے بھی پہلے۔ اگر معاشی پابندیاں موثر ثابت نہ ہو سکیں تو پھر فوجی اقدام ہی کی گنجائش رہ جائے گی۔ ایسا ہوگا تب ہی وہ متوجہ ہوں گے"۔

جو کچھ نیتن یاہو نے کہا تھا اُس پر عمل نہیں کیا جاسکا۔ شاید اِس حقیقت ہی کی بنیاد پر کچھ لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ اسرائیلی قیادت اس بار بھی جو کچھ کہہ رہی ہے وہ محض بڑھک ہے، گیدڑ بھبکی ہے۔ چند ایک ایسے اشارے ملے ہیں جن کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ اس بار اسرائیل شاید ایران کو نشانہ بنانے کا فیصلہ ۔ سب سے پہلے یہ نکتہ ذہن نشین رہنا چاہیے کہ ایران کو نشانہ بنانے کیلئے اسرائیل کو عوام کی بھرپور حمایت درکار ہے۔ 2015ء میں جامع کر چکا ہے ایکشن پلان کی منظوری سے قبل اسرائیلی عوام کی واضح اکثریت یہ کہتی تھی کہ اسرائیل کو ایران پر حملے کے معاملے میں تنہا کچھ نہیں کرنا چاہیے۔ اسرائیل ڈیموکریسی انسٹی ٹیوٹ نے بتایا ہے کہ اب اسرائیلیوں کا ذہن تبدیل ہو چکا ہے۔ اگر آج ایران پر حملے کیلئے ریفرنڈم کرایا جائے تو 58 فیصد اسرائیلی چاہیں گے کہ اسرائیل حملہ کر دے اور زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اسرائیلیوں کی اکثریت اس بات کے حق میں ہے کہ اگر اُن کا سب سے بڑا حلیف امریکا بھی حمایت نہ کرے تو کوئی بات نہیں، اپنے طور پر بھی ایران کو نشانہ بنایا جائے۔ 2018ء میں رائے عامہ کے ایک جائزے میں اشتراکِ عمل کے بغیر بھی ایران پر حملہ کرنے کو درست قرار دیا تھا۔ تب 50 فیصد سے زائد اسرائیلیوں نے اس بات صرف 10 فیصد اسرائیلیوں نے امریکا کی حمایت اور کو پسند کیا تھا کہ اگر ایران اپنا جوہری پروگرام ترک نہ کرے یا جوہری ہتھیار تیار کرنے کا عمل بحال کرے اور اُس کی جوہری تنصیبات پر حملہ کرنا ہی پڑے تو امریکا کی حمایت ضرور حاصل کی جائے اور اشتراکِ عمل بھی۔ مزید برآں اس وقت اسرائیلیوں کی اکثریت اس خیال کی حامل ہے کہ اُن کے اور اُن کی ریاست کے وجود کیلئے کوئی بڑا خطرہ اگر ہے تو ایران ہے۔

دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایران میں بھی رائے عامہ تبدیل ہوئی ہے۔ 2015ء میں ایران کی صدارت حسن روحانی کے ہاتھ میں تھی۔ انہیں تھوڑی بہت مقبولیت حاصل تھی اور عام خیال یہ تھا کہ اگر اسرائیل نے حملہ کیا تو ایرانیوں کی اکثریت اس بات کو سخت ناپسند کرے گی اور حکومت کا بھرپور ساتھ دے گی۔ اس کا ایک بنیادی سبب یہ بھی تھا کہ حسن روحانی اعتدال پسند رہنما تھے اور کسی نہ کسی طور قومی معیشت کو بہتر بنانا چاہتے تھے تاکہ عوام کا معیارِ زندگی بلند ہو۔ ساتھ ہی ساتھ وہ بنیادی حقوق کی صورتِ حال بہتر بنانے اور مغرب سے تعلقات معمول پر لانے کے خواہش مند بھی تھے۔ تب ایک یہ خدشہ بھی موجود تھا کہ اگر اسرائیل نے ایران کی جوہری تنصیبات کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تو انتہا پسند ایرانیوں کو بھی اسرائیل پر حملے کرنے کی تحریک ملے گی اور وہ جوہری مواد کے جنگی استعمال کی طرف جائیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ عالمی برادری میں اسرائیل کے خلاف بھی رائے عامہ ہموار ہو گی ۔ یہ خدشہ تو انا تھا کہ اسرائیلی حملے کی صورت میں ایرانی قیادت کے انتہا پسند عناصر عالمی برادری سے تعاون ترک کر دیں گے اور جوہری معاملات پر بات

چیت سے بھی انکار کر دیں گے۔ یوں اسرائیلی حملے کی صورت میں ایران کے خلاف جو مقاصد حاصل کیے جانے تھے اُن کے مقابلے میں نقصانات کا احتمال زیادہ تھا۔

چند ماہ کے دوران ایران میں ماحول بہت بدل چکا ہے۔ رائے عامہ اب اصلاح پسندوں کے حق میں ہے نہ انتہا پسندوں کے۔ بڑے پیمانے پر ہونے والے حالیہ مظاہروں میں دونوں کے خلاف نعرے لگائے گئے ہیں۔ اسرائیل کے خلاف بھی رائے عامہ تیزی سے ہموار ہوئی ہے۔ ایرانیوں کی اکثریت اس بات کے حق میں دکھائی دیتی ہے کہ جوہری پروگرام جاری رکھا جائے اور جوہری ہتھیار بھی تیار کیے جائیں۔

اسرائیلی قیادت نے 2013ء اور 2015ء کے دوران ایران کو دی جانے والی دھمکیوں پر عمل شاید اس لیے نہیں کیا کہ وہ امریکا کو ایک موقع دینا چاہتے تھے کہ وہ ایران کو مذاکرات کی میز پر لائے اور جوہری معاملات پر کوئی وسیع البنیاد معاہدہ کر لیا جائے۔ اُس وقت کے امریکی صدر براک اوباما نے بھی یقین دلایا تھا کہ ایران کے ساتھ کوئی ایسا معاہدہ کر لیا جائے گا جو امریکا اور اس کے اتحادیوں کی سلامتی کو لاحق خطرات کو ختم کرتا ہو۔ اس وقت اسرائیلی قیادت ایران کے ساتھ جوہری معاملات پر ہونے والے کسی بھی معاہدے پر یقین کرنے کو تیار نہیں کیونکہ اس نے ایک وسیع البنیاد جوہری معاہدے کا حشر دیکھ لیا ہے۔ اسرائیل اور چند دوسرے ممالک نے بھی دیکھ لیا کہ 6 ملکی جوہری معاہدے کے بعد ایران پر سے اقتصادی پابندیاں اٹھالی گئیں اور یوں ایرانی قبولیت حاصل ہو گئی۔ جب ایران پر سے پابندیاں ہٹالی گئیں اور اُسے تجارت کے میدان میں کھل کر کام کرنے کا موقع ملا تو ایرانی قیادت کو عالمی سطح پر قیادت کو پاسدارانِ انقلاب اور ایرانی ملیشیاز کیلئے اربوں ڈالر جمع کرنے کا موقع ملا۔ ایرانی قیادت نے یہ موقع پورے خطے میں اپنے اثرات کا دائرہ وسیع کرنے کیلئے استعمال کیا۔ شام، عراق، یمن اور لبنان میں ایران کی حمایت یافتہ ملیشیاز کو مضبوط کیا گیا۔ ایرانی قیادت نے اپنے اثرات کا دائرہ وسیع کرنے کی مہم کامیابی سے مکمل کی ہے۔

اسرائیل اور خلیجی (عرب) ریاستوں کی یہ رائے تھی اور ہے کہ بین الاقوامی جوہری معاہدے کے بعد بھی یہ خطرہ ٹلا نہیں تھا کہ ایران جوہری ہتھیار بنانے کی کوشش جاری رکھے گا۔ خطے نے دیکھا کہ یمن سے ایران نواز حوثیوں نے سعودی عرب میں شہری ٹھکانوں پر حملے بڑھا دیے۔ دوسری طرف حزب اللہ کے ہزاروں جنگجوؤں کو شام میں قدم جمانے کا موقع ملا۔ ایران کی حمایت اور مالی امداد سے کام کرنے والی تنظیم حماس نے جنوبی اسرائیل پر حملے بھی بڑھا دیے۔

صورتِ حال کی نوعیت دیکھتے ہوئے بلا خوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ ایران کے جوہری پروگرام کے حوالے سے جو خدشات اسرائیل میں پائے جاتے ہیں اُن کی بنیاد پر ایران کی جوہری تنصیبات کو نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔ اس حوالے سے رائے عامہ بھی تبدیل ہو چکی ہے اور حالات بھی۔

بروز سوموار 6 رجب المرجب 1443ھ 7 فروری 2021ء

زندہ جاوید اور امر لوگ

ایسا ہوتا آرہا ہے کہ سب فلسفے دھرے رہ جاتے ہیں، دلیلیں منہ تکتی رہ جاتی ہیں، پند و نصائح بے اثر ہو جاتے ہیں، زورِ خطابت دم توڑ دیتا ہے، اہل منبر و محراب دنگ رہ جاتے ہیں..... جبے، عمامے اپنی شان و شوکت کھو بیٹھتے ہیں، پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر روئی کے گالوں کی طرح اڑنے لگتے ہیں، زمین تھر تھرانے لگتی ہے، ساری حکمتیں ناکارہ اور سارے منصوبے نابود ہو جاتے ہیں، ذلیل دنیا کے چاہنے والے دم دبا کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں، اہل حشمت و شوکت منہ چھپانے لگتے ہیں، محلات بھوت بنگلے بن جاتے ہیں، منظر بدل جاتا ہے، موسم بدلنے لگتا ہے، آسمان حیرانی سے تکتا ہے، شجر میں بیٹھے ہوئے پرندے اور جنگل میں رہنے والے درندے راستہ چھوڑ دیتے ہیں۔ جب دیوانے رقص کرتے ہیں، جنوں اپنے گریباں کا علم بن کر نکل پڑتا ہے، پھر عقل خود پر شرمندہ ہوتی ہے، جب عشق اپنی جولانی پر آتا ہے، نعرہ مستانہ بلند سے بلند تر اور رقص بسمل تیز سے تیز تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ جب موت کی تلاش میں نکلتی ہے زندگی۔ سب کچھ ہماری نظروں کے سامنے ہوتا ہے لیکن..... لیکن ہمیں نظر نہیں آتا، آئے بھی کیسے! ان دیدوں میں بینائی کہاں ہے، روشنی کہاں ہے؟ روشنی اور بینائی تو اندر سے پھوٹتی ہے، جی..... اندر سے، دل سے..... اور جسے ہم دل سمجھ بیٹھے ہیں، وہ تو صرف خون سپلائی کرنے کا ایک پمپ بن کر رہ گیا ہے، دل کہاں ہے؟ نہیں یہ دل نہیں ہے بس ایک آلہ ہے۔ جن کے دل دھڑکتے ہیں وہ زمانے سے آگے چلتے ہیں۔ نعرہ مستانہ موت کو للکارتے ہیں اور موت ان سے خائف ہو کر کہیں چھپ کر بیٹھ جاتی ہے۔ یہ دیوانے اور پاگل لوگ لگاتے، سر بکف میدان میں اترتے ہیں۔ موت کو موت کے گھاٹ اتارنے نکلتے ہیں ہیں اور پھر زندہ جاوید ہو جاتے ہیں، جی یہی زندہ جاوید لوگ آگے بڑھ کر منتظر منزل کو پالیتے ہیں:

پھر میرا رب جلال میں آتا ہے اور حکم دیتا ہے "وَلَاتَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَـٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ: اور جو اللہ کی راہ میں مارے جائیں انہیں مرا ہوا نہ کہو، لیکن وہ تو زندہ ہیں لیکن تمہیں اس کا شعور نہیں۔ اور ہم تمہیں کچھ خوف اور بھوک اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کے نقصان سے ضرور آزمائیں گے، اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دو۔ وہ لوگ کہ جب انہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔" (البقرہ:154-156)

یہ ہیں زندہ جاوید اور امر لوگ، جنہیں رب بھی مردہ کہنے سے منع کرتا ہے، وہ تو کہتا ہے کہ ایسا خیال بھی دل میں مت لاؤ، خبردار جو ایسا سوچا بھی! زندہ ہیں، امر ہیں، رزق پاتے ہیں، زندہ جاوید لوگ..... امر لوگ، رب کے حضور اپنی نذر پوری کر دینے والے، اپنا عہد نبھانے والے، صلہ و ستائش سے بے پرواہ لوگ، پاگل و دیوانے لوگ۔ کہاں نہیں برپا یہ معرکہ عشق و محبت؟ کہاں نہیں برپا؟ روئے ارض پر چاروں طرف سجا ہوا ہے یہ میلہ..... اور میلہ لوٹنے والے دیوانے، ہم صرف تماشائی، نوحہ گر اور مرثیہ خواں۔ اب گنواؤں تو تکرار ہو گی اور طبع نازک پر گراں گزرے گا۔ یہ تو سامنے برپا ہے معرکہ عشق۔ یہ غزہ میں نہیں دیکھ رہے آپ، افغانستان میں پچھلی تین دہائیوں سے کیا کچھ نہیں کیا گیا، اب اسے کڑی سزا دینے کیلئے ان کے اثاثہ جات کو ضبط دن دیہاڑے لوٹ لیا گیا۔ اس کی ہزاروں سال کی تہذیب کو برباد کر دیا گیا، اس کے قیمتی نوادرات کر کے مطیع بنانے کی کوششیں جاری ہیں، عراق کو اب تک اجارہ داری جاری ہے اور ان سے زندہ رہنے کا تاوان وصول کیا جا رہا ہے، کشمیر کی خود مختاری ہڑپ اقوام متحدہ لوٹ لئے گئے، اس کی تیل کی پیداوار پر دادوں کو ایک پل میں پس پشت ڈال کر اس کو مٹانے کی کوششیں جاری ہیں، کشمیر اب بھی مسلسل جل رہا ہے اور آئے دن اپنے زندہ ہونے کی تمام قرار

کا خراج ادا کر رہا ہے، اب تو ہر جگہ اپنے کمیں گاہوں سے تیر برس رہے ہیں، لیکن یہ پھر بھی پروانہ وار اپنی جانوں کو سر بازار لٹاتے جا رہے ہیں چاہے ان کو غدار اور دہشتگرد القابات کہہ کر پکارا جائے۔

اب تو سمجھ آ گیا ہو گا کہ انہیں کہتے ہیں زندہ انسان، بندہ رب، سب کا انکار کر دینے والے پُر اسرار بندے، موت کو سینے سے لگا کر زندہ جاوید ہو جانے والے، اپنا خون اپنی جان، اپنے پیارے رب کی نذر کر دینے والے قافلہ حسین کے لوگ! اہل غزہ! تم پر سلام ہو، تم نے اطاعت کی ایک مثال قائم کر دی، یہ ہے اطاعت رب میں جاں سے گزرنا، تم نے ثابت کر دیا تم ہو بندگاں خدا..... اہل غزہ، اے اہالیان کشمیر، تم پر سلام ہو، ہم سب دیکھتے رہ گئے اور تم اپنی مراد پا گئے، اے بامراد لوگو! تم پر سلام ہو، اے خوش نصیب لوگو! تم پر سلام ہو۔ اے اس دنیائے ناپائیدار کو ٹھوکر مارنے والو! تم پر سلام ہو، آنکھیں کھولو..... آنکھیں ہوتے ہوئے بھی اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے والو! آنکھیں کھولو، یہ دیکھو دل کش منظر، سونگھو اس خوشبو کو، جو خوشبوئے شہداء ہے۔ دیکھو یہ ہے زندگی..... سب کا انکار، کوئی نہیں روک سکتا اس قافلہ حق کو۔ اقوام متحدہ، او آئی سی، عرب لیگ اور انسانیت کے علمبرداروں اور سامراج کے ایجنٹ لکھاریوں کے منہ پر تھوک دینے والو! تم پر سلام ہو۔

کچھ عقل سے عاری تمہاری ان قربانیوں کو پہچان نہیں پائے کہ اللہ نے ان سے دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت ہی چھین لی ہے۔"خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُم بِمُؤْمِنِينَ "اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کیلئے بڑا عذاب ہے۔ اور کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جو کہتے ہیں ہم اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لائے حالانکہ وہ ایمان دار نہیں ہیں۔ (البقرہ: 7۔8)

حالانکہ اللہ نے تو قلم کی بھی قسم کھائی ہے لیکن شائد وہ اس قلم کی حرمت سے ابھی واقف نہیں۔ وہ اس بات کو لکھنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے کہ تمہاری قربانی محض ضائع ہو گئی، وہ پڑوسی ملک کی مثال دیکر سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ دیکھو وہ کس قدر دانشمندی سے اپنی قوم کو اس جنگ کے شعلوں سے بچا رہا ہے، لیکن زمینی حقائق سے آنکھیں چرا کر نجانے کس کو خوش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پڑوسی ملک کا چاروں طرف سے ایسا محاصرہ نہیں کیا گیا، سیال مادہ کی دولت سے مالا مال ایران اس وقت اپنے پاؤں پر کھڑا ہے اور مالی طور پر کسی کا محتاج نہیں۔ وہ آبنائے ہرمز کو بند کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے "جیدے گھر دانے، اودے کملے وی سیانے "لیکن کمال آفریں ہے تم پر کہ تم ایسے لکھاریوں کو خاطر میں نہیں لائے!!!

کیا آپ جانتے ہیں، کبھی سوچا ہے، ہاتھی گھاس کا گٹھا اپنی سونڈ میں پکڑ کر جھٹکتا کیوں ہے؟ اس لئے کہ کہیں اس گھاس میں چیونٹی نہ ہو۔ وہ جانتا ہے کہ اگر وہ چیونٹی کو نگل لے تو وہ اس کے دماغ میں جا کر بیٹھ جاتی ہے اور اپنا ننھا سا پاؤں مارتی رہتی ہے اور بالآخر ہاتھی دم توڑ دیتا ہے۔ غزہ اور کشمیر کے شیروں کو دشمنوں نے چیونٹی سمجھ کر مسلنا چاہا تھا، وہ چیونٹی ان کے ہاتھی جیسے جثے کو نابود کر دے گی۔ ہاں! یہ بات اب ان ظالم دشمنوں کو سمجھ آ گئی ہے، ہمیں اب تک سمجھ نہیں آئی۔ مزاحمت ہی میں ہے زندگی باوقار و قابل رشک زندگی۔

غزہ کا باسی محمود اپنے سات ماہ کے شیر خوار بچے کو اپنے سینے سے الگ کر کے جب لحد میں اتار رہا تھا تو تکبیر بلند کرتے ہوئے اپنے رب سے کہہ رہا تھا کہ یہ آخری پونجی تھی جو تیرے راستے میں

قربان ہو گئی۔ تیری دی ہوئی نعمت سے سات ماہ استفادہ کیا اور اے میرے رب اس کو میرا زادِ راہ بنا دے۔ بوڑھی اسی سالہ فاطمہ اس بات پر فخر کر رہی تھی کہ میں نے اپنے خاندان کے تمام افراد راستے کے کانٹے چننے کیلئے رخصت کر دیئے اور میں بھی اب تیری ملاقات کیلئے بے تاب ہوں۔ احمد دوران یہ کہتا ہے کہ میں اپنے بچوں کو ہر روز رات کو یہ کہانی سناتا ہوں کہ ہم مرنے والے نہیں ہیں، ایک عارضی زندگی کے چنگل سے نکل کر دائمی اور کامیاب زندگی ہمارا انتظار کر رہی ہے۔ جب بھی میرے گھر کے ارد گرد کوئی بم پھٹتا ہے میں ناچنا شروع کر دیتا ہوں۔ میری ایک ہی بچی جو اس جنگ کی تباہ کاریوں سے ابھی تک بچی ہوئی ہے، وہ بھی اس کو ایک کھیل تماشہ سمجھ کر لطف اندوز ہوتی ہے۔ موت کو کھیل تماشہ سمجھنے والو! تم پر سلام ہو۔ تم نے اپنے عزم سے ثابت کر دیا کہ تمہارے پائے استقلال میں کوئی جنبش نہیں آئی۔ تم آج بھی سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح سامنے کھڑے موت کا مسکراتے ہوئے انتظار کر رہے ہو۔ اس گھڑی جب سب کو حاضر ہونا ہے، تم بھی اپنے خون آغشتہ لاشوں سے حاضر کئے جاؤ گے۔ تمہاری فلاح اور کامیابی کا اعلان جب فرشتے باآواز بلند کریں گے، لیکن تمہاری قربانیوں کو تمہاری قیادت کی غیر ذمہ داری ٹھہرانے والے دنیا اور آخرت میں تم سے منہ چھپاتے پھریں گے

رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّارَيْبَ فِيْهِ۔اِنَّ اللّٰهَ لَايُخْلِفُ الْمِيْعَادَ(عمران:9)

اے ہمارے رب! بیشک تو سب لوگوں کو اس دن جمع کرنے والا ہے جس میں کوئی شبہ نہیں، بیشک اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے

یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

کشمیریوں اور فلسطینیوں پر قیامت بیت رہی ہے لیکن صد افسوس کہ یہاں ہماری مسلم حکومتوں کی محفلیں شگوفہ بنی ہوئی ہیں۔ یہ ہمیں کیا ہو گیا ہے؟ بستی میں ایسی بے حسی تو کبھی نہ تھی۔ درست کہ ہم آج کمزور ہیں اور ان کی عملی مدد سے قاصر ہیں لیکن ہم نے تو کشمیریوں سے وعدہ کیا تھا کہ ہم تمہارے وکیل ہیں اور ہر جمعہ کے دن ایک گھنٹے کی علامتی یکجہتی کا اظہار کریں گے لیکن چند منٹ فوٹو سیشن کے بعد اس طرح غائب ہو گئے جیسے کسی نے کوئی جرم کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو۔ ہم اتنا تو کر ہی سکتے ہیں کہ یہ دکھ امانت کی طرح سنبھال کر رکھیں اور نسلوں کو وراثت میں دے جائیں۔ کیا عجب ہماری نسلیں ہماری طرح بے بس نہ ہوں۔ وقت کا موسم بدل بھی تو سکتا ہے۔ ہم اتنا تو کر سکتے ہیں کہ موسموں کے بدلنے تک اپنے زخموں کو تازہ رکھیں۔ ان سے رستے لہو کو جمنے نہ دیں لیکن ہم سے تو یہ بھی نہ ہو سکا۔ وعدے کیلئے جان قربان دنیا، یہ بھلے وقتوں کی بات تھی، ابھی روشن خیالی کی مسند مسخروں کے ہاتھ میں نہیں آئی تھی۔ ہمارا ادیب دائیں اور بائیں کی تقسیم سے بے نیاز ہو کر یہ امانت نسلوں تک پہنچا رہا تھا لیکن اب تو ہم ان تمام روشن روایات سے محروم ہو گئے ہیں۔

مقبوضہ کشمیر کی ''وولر جھیل کے کنارے'' میں سید علی گیلانی نے اپنی سوانح حیات میں دل کے زخم دکھانے سے تو گریز کیا لیکن بین السطور میں چشم کشا منظر ناموں کی نشاندہی کر دی ہے۔ بھارتی بنئے کے سینے پر بیٹھ کر اپنے لاکھوں چاہنے والوں اور سرفروشوں کے درمیان علی الاعلان یہ دعویٰ رقم کر دیا کہ "ہم ہیں پاکستانی، پاکستان ہمارا ہے'' لیکن کشمیریوں کا قصور یہ ہے کہ وہ تاریخِ عالم میں اُنچند پُر عزم، بلند حوصلہ، حق پرست، حریت پسند اور جذبۂ اِستقلال سے سرشار اقوام میں سرِ فہرست ہیں جو 8 لاکھ سے زائد بھارتی درندوں کے ظلم سے نہ تو خوفزدہ ہیں اور نہ ہی ان کے سامنے سر تسلیم خم کیا ہے۔ ایک نہتی مجاہدہ آسیہ اندرابی نے تم سب کی مسند اقتدار پر تھوک کر تہاڑ جیل کی سختی کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے لیکن تمہاری فرعونیت کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ اس نے تاریخ میں یہ رقم کر دیا ہے کہ 1947ء سے لیکر آج تک کشمیریوں پر زندگی تنگ کر دی گئی ہے جو بلاشبہ ہندو بنئے ڈوگرہ راج کے تسلسل

سے بھی بد تر ہے۔ گمنام اجتماعی قبریں، بے گناہ شہداء، معصوم یتیم، بیوہ و نصف بیوہ عورتیں، نابینا بچے، جوان، معذور و بے سہارا بوڑھے اور لہولہان وادیٔ کشمیر بھارتی مظالم کا منہ بولتا ثبوت ہیں لیکن وہ آج بھی اقوام عالم کے سب سے بڑے ادارے اقوام متحدہ جو ان دنوں بڑی طاقتوں کی ایک لونڈی کا کردار ادا کر رہا ہے، سے اپنا وہ جائز حق مانگ رہے ہیں جو اس ادارے میں اقوام عالم کے اتفاق رائے سے دنیا کی چند بڑی طاقتوں کے بطور ضامن، ان کو دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ آج بھی بنیادی انسانی حقوق سے محروم کشمیری خاموش زبانوں، نابینا آنکھوں، بہتے زخموں، لٹی عزتوں اور بے بس ہاتھوں میں جوان لاشے اٹھائے ضمیر عالم کو جھنجھوڑنے کی ناکام مگر پُر امید کوشش میں مصروف و شکوہ کناں ہیں۔

تاہم غزہ کے درد سے چشم پوشی کرنے والے اور پاکستان کو ریاست مدینہ بنانے والے میرے رب کا یہ اٹل فیصلہ بھی ذہن نشیں کر لیں کہ :.... أَحَسِبَ النَّاسُ أَن يُتْرَكُوا أَن يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہہ دینے سے چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ''ہم ایمان لائے'' اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ اللہ کو تو یہ ضرور دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون! (العنکبوت: 2۔3)

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّن دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ: اور ہاں یہ بھی سن لو: اور اس سے بہتر کس کی بات ہے جس نے لوگوں کو اللہ کی طرف بلایا اور خود بھی اچھے کام کیے اور کہا بے شک میں بھی فرمانبرداروں میں سے ہوں! (الفصلات: 33)

اے دنیا کے اسیرو! دنیائے ذلیل کی چاہت میں خوار ہونے والو! اے 57 ریاستوں کے مردود حکمرانو، بے غیرتی کے مجسم پتھروں، دیکھو یہ ہے زندگی۔ اہل غزہ اور شہدائے کشمیر، تم پر سلام ہو۔ وہ دیکھو شہداء کے خون سے پھوٹنے والی سحر۔ دیکھو، آنکھیں چرانے سے یہ انقلاب نہیں رکتا۔ اپنے محلات بچانے کی آخری کوشش کر لو..... نہیں بچیں گے یہ! رب کعبہ کی قسم، کچھ بھی نہیں بچے گا۔ وہ دیکھو بابا اقبال بھی یہی کہہ رہے ہیں۔

از زلزلہ می ترسند ہما کاخ نشیناں
ما خانہ بدوشیم غم سیلاب نہ داریم
(امراء کے محلات پر زلزلہ طاری ہے۔ خانہ بدوش سیلاب کا غم نہیں پالتے)

اے کیمپوں میں رہنے والو غزہ کے باسیوں اور کشمیر میں بسنے والے مظلوموں! تم پر سلام ہو کہ تم تو اپنا سب کچھ لٹا کر ربِّ کریم کی دید کو بڑی شان سے جا پہنچے لیکن اے دنیا کے پرستارو! مغربی اور امریکی بینکوں میں اپنے خزائن پر تکبر کرنے والو! بچا سکتے ہو تو بچا لو۔ کچھ نہیں بچے گا کوئی بھی تو نہیں رہے گا، بس نام رہے گا میرے رب کا جو حی قیوم ہے۔

خوف تادیب سے مظلوموں پہ رویا نہ گیا
شام مقتل میں کوئی بھی نہ عزادار اٹھا
سامنے ترے زرافشاں ہے نئی صبح امید
اپنی پلکوں کو ذرا دیدہ خوں بار اٹھا

بروز منگل 7 رجب المرجب 1443ھ 8 فروری 2021ء

حُرمتِ نسواں

کائنات میں اللہ رب العالمین نے زندگی کا نظام چلانے کیلئے مرد کے ساتھ عورت کو بھی پیدا کیا، ان کا دائرہ کار متعین کیا اور پھر اس نظام زندگی کو چلانے کیلئے مرد اور عورت کے حقوق و فرائض متعین کئے جس میں ہر ایک صنف اپنا حصہ وصول کرنے کے ساتھ ساتھ دوسری صنف کے فرائض بھی ادا کرنے ہے تاکہ کسی ایک میں بھی احساس محرومی اور ردّ عمل پیدا نہ ہو۔ انسان اور انسانی تہذیب جہاں اپنی فطری کمزوری کے سبب افراط و تفریط کا شکار کا پابند ہوتی ہے وہاں سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ قدیم جاہلیت نے سارا زور مرد کی برتری ثابت کرنے پر لگا دیا اور جدید جاہلیت نے ردِّ عمل کا شکار ہو کر عورت کو برابری کی دوڑ میں شریک کرنا چاہا لیکن وہ اپنی حیثیت سے آگے نکلی کہ اب اسے بالمقابل کھڑا مرد دست لگ رہا ہے۔

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو اسلام میں بنیادی حقوق کا تصور اتنا ہی قدیم ہے جتنا انسان کا وجود۔ خالقِ کائنات نے جس طرح طبعی زندگی کے اسباب ہوا، پانی اور خوراک پیدائش سے پہلے عطا کر دیئے تھے، اسی طرح ضابطہ ءحیات سے آدمؑ اور نسل آدم کو بذریعہ وحی آگاہ کرنے کا سلسلہ بھی شروع سے شروع ہو کر محمد ﷺ پر ختم ہوا۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے والی قوم میں عورت کو ایسی فضیلت بخشی جو اس کر دیا تھا جو آدمؑ سے پہلے کسی بھی تہذیب نے اس کا تصور تک بھی نہیں کیا تھا۔ ان ادوار کے درمیان دورِ اسلام کو اگر ہم دیکھتے ہیں تو وہاں سورۃ التکویر کی آیت ہمارے سامنے آجاتی ہے:

وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ،بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ(التکویر:8-9):اور جب اس لڑکی سے جو زندہ دفنادی گئی ہو پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ کے جرم میں ہلاک کی گئی۔ اس آیت کی صدا سے جو مقدمہ اللہ کی عدالت میں درج ہوتا ہے اس کے جواب میں اسلام میں کائنات پر عورت کی عظمت اور اس کا مقام لاینفک بنا کر دونوں کے درمیان حقوق و فرائض کا جو متوازن نظام تشکیل دیا وہ قابل عمل بنایا گیا جو آج بھی بھٹکی ہوئی انسانیت کیلئے رہنما جزو ہر مرد کا اصول ہیں۔ کیونکہ اسلام ایک مضبوط پائیدار معاشرہ کی بقاء چاہتا ہے۔ اس کیلئے خاندان کا استحکام، معاشرہ کا استحکام اور خاندان کی بربادی معاشرہ کی بربادی ہے۔

یونانیوں اور رومیوں نے تہذیب و تمدن اور علوم و فنون میں اس قدر ترقی کی کہ اس بنیاد پر بہت سی تہذیبیں اور بہت سے علوم وجود میں آئے لیکن ان کے ہاں عورت کا مقام بہت ہی بے وقعت تھا، عورت کو انسانیت پر بار سمجھتے تھے اور اس کا مقصد ان کے نزدیک سوائے اس کے کچھ نہیں تھا کہ خادمہ کی طرح والوں کی خدمت کرتی رہے۔ اہل یونان اپنی معقولیت پسندی کے باوجود عورت کے بارے میں اپنے تصورات رکھتے تھے، ان کا قول تھا: آگ سے گھر جل جانے اور سانپ کے ڈسنے کا علاج ممکن ہے لیکن عورت کے ستر کا مداوا محال ہے۔

اسی طرح منفی تعلق دو تہائیوں کے درمیان حرکت کرتا رہا۔ ایک مرتبہ صرف اسے حیوانی تعلق سمجھا گیا، پھر شیطانی گندگی اور نجاست خیال کیا گیا اور پھر دوبارہ حیوانی تعلق خیال کیا گیا۔ یہ سب کچھ ہوا مگر مغرب کے جاہلی نظام ہائے حیات میں کبھی اس مسئلہ میں ایسا کوئی معتدل رویّہ اختیار نہیں کیا گیا جو انسان کی فطرت کے مناسب ہو۔ ان کے یہاں عورت کے بارے میں یہ تصور کبھی بھی نہیں ابھرا کہ عورت نفس انسانی کا ایک حصہ، جنس بشری کی خالق، بچوں کے کاشانہ زندگی کی محافظ اور انسان کے عناصر وجود کی امانت دار ہے اور کسی نظام اور عمل کی بہتری کی بجائے اسے انسان کی فلاح و بہبود کے فرائض انجام دینا ہے۔

افلاطون نے بلاشبہہ مرد اور عورت کی مساوات کا دعویٰ کیا تھا لیکن یہ تعلیم محض زبانی تھی عملی زندگی اس سے بالکل غیر مؤثر تھی۔ازدواج کا مقصد خالص سیاسی رکھا گیا یعنی یہ کہ اس سے طاقتور اولاد پیدا ہو جو حفاظت ملک کے کام آئے اور یونان کے قانون میں تو یہ تصریح موجود تھی کہ کمسن وضعیف شوہروں کو اپنی بیویاں کسی نوجوان کے حبالہء عقد میں دے دینا چاہیے تاکہ فوج میں قوی سپاہیوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔

یونانیوں کے بعد جس قوم کو دنیا میں عروج نصیب ہوا وہ اہل روم تھے، عورت کا مرتبہ رومی قانون نے بھی ایک عرصہ دراز تک نہایت پست رکھا۔افسر خاندان جو باپ ہوتا یا شوہر اسے اپنے بیوی بچوں پر پورا اختیار حاصل تھا اور وہ عورت کو جب، جیسا چاہے گھر سے نکال سکتا تھا۔جہیز یا دلہن کے والد کو نذرانہ دینے کی رسم کچھ بھی نہ ہوتی اور باپ کو اس قدر اختیار حاصل تھا کہ جہاں چاہے اپنی لڑکی کو بیاہ دے، بلکہ بعض دفعہ تو وہ شادی کر کے توڑ سکتا تھا ۔زمانہ مابعد یعنی دورِ تاریک میں یہ حق باپ کی طرف سے شوہر کی طرف منتقل ہو گیا اور اب اس کے اختیارات یہاں تک وسیع ہو گئے کہ وہ چاہے تو بیوی کو قتل کر سکتا تھا۔520ء تک طلاق کا کسی نے نام بھی نہ سنا۔

تاہم گزشتہ صدی میں معاشرے کیلئے عورت کی اہمیت کا اندازہ نپولین بوناپارٹ کے اس قول سے ہوتا ہے "تم مجھے اچھی مائیں دو، میں تمہیں اچھی قوم دوں گا"۔عورت کی گود مدرسے کی مانند ہے، یہاں انبیا نے بھی پرورش پائی، صدیقین وشہدا نے بھی، مجاہد جرنیلوں اور غازیوں نے بھی.....جو تاریخ میں اپنا نام سنہری حرفوں میں ثبت کرا گئے، اسی گود میں پرورش پانے والوں نے چنگیز خان، ہلاکو خان اور ہٹلر بن کر، تاریخ انسانی میں ظلم کے سیاہ باب رقم کئے۔

وہ خواتین جنہوں نے بعد میں آنے والے تازہ ادوار میں افغانستان، کشمیر، چیچنیا، بوسنیا، فلسطین اور اراکان میں محمود غزنوی، صلاح الدین ایوبی، محمد بن قاسم اور ٹیپو سلطان جیسے لاکھوں "دشمن کو بچھاڑنے والے" پیدا کئے، دشمن کو اس فکر میں مبتلا کر گئیں کہ اگر مسلم خواتین ایسے ہی شیر دل تیار کرتی رہیں تو دنیا سے ان کے مقاصد کا بوریا بستر گول ہو جائے گا چنانچہ انہوں نے مسلم معاشروں میں جال پھینکنے کا پلان بنایا اور خواتین کو احیائے اسلام کے راستے سے دور کرنے کیلئے، انہیں خانہ داری، بچوں کی تعلیم وتربیت اور مجاہد صفت افراد تیار کرنے کے کاموں سے بیزار کر کے آزادئ نسواں کا شوشا چھوڑا۔ایسی تحریکیں وجود میں آئیں جو عورت کیلئے فطرت کے ودیعت کردہ کاموں کو عورت پر ظلم اور اس کا استحصال قرار دینے لگیں۔آزادئ نسواں کے نام پر تفریح ونشاط کی محفلیں سجانا شروع کیں، انہیں فیشن پرستی، بے پردگی کے بعد عریانی کی راہ پر گامزن کرنا شروع کیا، چادر اور چار دیواری کو دورِ قدیم کی علامت سے باہر آنے کی راہ سجھائی جانے لگی۔وہ علامتیں جو عورت کی صفت وعصمت کی نگہبان تھیں، تہذیبِ جدید میں عورت کی قرار دے کر اس قید وبند آزادی کے نعروں کے شور میں ان پر خوب فقرے کسے گئے۔ان کو عورت کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ اور دقیانوسیت قرار دے کر عورت کو ان سے نفرت گھول کر، معاشی ذمے داریاں بھی ان کے نازک کاندھوں پر ڈالنے کی کوششوں کا آغاز ہوا۔یہ تہذیبِ ابلیس دلائی گئی، پھر مساواتِ مرد وزن کا زہر کا جال تھا، جس نے مسلم عورت کو اپنے چنگل میں جکڑ لیا اور پھر ٹی وی، فلم اور ڈش ایسے ہتھیار ثابت ہوئے جن کی آمد کے بعد تہذیبِ جدید کے نعرہ مساواتِ مرد وزن کو کھل کھیلنے کا موقع ملا۔

مسلم عورت کو گھر سے باہر نکال کر شمع محفل بنانے اور مرد کی برابری کی راہ سجھانے میں مغرب کا ہاتھ تھا۔اس کا خیال تھا کہ جب تک مسلم معاشروں کی عورت کو نہ بگاڑا جائے اُس وقت تک مسلم دنیا کا اولاً خاندانی اور ثانیاً معاشرتی نظام نہ بگڑے گا اور جب تک مسلم دنیا معاشرتی زبوں حالی اور ٹوٹ پھوٹ

نہ ہو گی اُس وقت تک "نیو ورلڈ آرڈر" کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو کا شکار سکتا چنانچہ ابتدائی اقدام کے طور پر "خواتین کے حقوق و آزادی" کے درپردہ "خاتون بگاڑ" تحریکیں شروع کی گئیں اور مسلم خاتون کو بھی مغرب کی خاتون کی طرح استحصال کی راہ پر ڈال دیا گیا۔ اس آواز پر "روشن خیال" بیگمات نے لبیک عورت سے متعلق قوانین اسلامی پر تنقیدیں کی گئیں، اپنی مرضی کی تاویلیں کہا، ایجاد کی گئیں، عورت پر عائد اسلامی حدود و قیود (جو حقیقت میں صنفِ نازک ہونے کے ناتے، بعض ذمے داریوں سے اسے عہدہ برا کرتے ہیں، اور بعض احتیاطوں کا پابند بنا کر اسے شرف و مرتبہ عطا کرتے ہیں) کو عورت پر ظلم قرار دیا گیا، اور اسلامی لبادہ جو خود انہوں نے اتار کر دور پھینک دیا تھا دیگر خواتین کو بھی اسے اتار پھینکنے کا مشورہ دے کر مغرب کے اس پروگرام کو بڑھ چڑھ کر کامیاب بنایا۔ مغرب کی جس عورت کی پیروی کی راہ پر مسلم عورت کو گامزن کیا جا رہا ہے کیا وہ کامیاب ہے؟

یورپ کی خواتین کی آزادانہ سرگرمیوں سے متاثر ہو کر، تہذیبِ جدید میں آزادئ نسواں اور مساوات، مرد و زن کے نام پر عوت کو گھر چھوڑ کر باہر کی راہ اختیار کرنے کی جو ترغیب دلائی جا رہی ہے وہ راہ مغرب کی عورت نے اُس وقت اختیار کی تھی جب وہاں صنعتی انقلاب برپا ہوا۔ اشیا کی قیمتیں بڑھیں تو کم آمدنی والے افراد کیلئے گزارہ کرنا مشکل ہو گیا۔ اس عالم میں عورت کسبِ معاش میں مرد کا ہاتھ بٹانے کیلئے میدان میں نکل کھڑی ہوئی۔ ابتدا میں اس نے محسوس کیا کہ اسے پہلے کی بہ نسبت معاشرے میں حیثیت و مقام حاصل ہوا ہے۔ اس نے معاشی کاموں سے مرد کو سہارا دینا شروع کیا اور دوسری طرف معاشرتی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگی۔ ابتدا کے یہ خوشگوار نتائج جب انتہائی درجے کو پہنچے تو ان کی صورت انتہائی مسخ ہو چکی تھی، جب عورت نے گھر بار چھوڑ کر معاش و معاشرت کو ترجیح دینا شروع کی تو وہ انتہائی تلخ حقائق سے دوچار ہوئی۔

اب فطرت کے عائد کردہ کام یعنی بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت تو اسے کرنا ہی تھے مگر جب مرد کی برابری اختیار کر کے فطرت کی مشیت کی نفی کی اور معاش جیسا کام بھی از خود اپنے کاندھوں پر اٹھایا تو اسے معلوم ہونے لگا کہ اسے مرد کی برابری کے دھوکے میں مرد کے مقابلے میں دوہری ذمے داریاں ادا کرنا پڑ رہی ہیں چنانچہ اس کے بعد وہ مادرانہ ذمے داریوں سے گریز کی راہ اختیار کرنے لگی جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ مغربی معاشرہ تتر بتر ہو گیا۔ اب مغربی گھر ویران مگر سڑکیں، کلب، ہوٹل اور دفاتر بارونق ہو گئے، بچے ماؤں کی ممتا سے محروم ہو کر جب بے بسی کی زندگی گزارتے ہیں تو وہ "بے حس" تیار ہوتے ہیں۔ بیمار بوڑھے والدین ہمدردی کے دو بول کو ترستے ہیں، مشرقی معاشروں کی طرح انہیں "تراشیدہ ہیرا" سمجھ کر اہم خاندانی معاملات میں ان سے رائے طلب نہیں کی جاتی، نہ ان کو "قیمتی گوہر" کی حیثیت دی جاتی ہے، بلکہ جوانی میں عیش و نشاط سے بھرپور زندگی گزار کر جب وہ بڑھاپے کی جانب گامزن ہوتا ہے تو اسے غیر ضروری قرار دے کر "اولڈ ایج ہومز" کی طرف دھکیل دیا جاتا ہے۔

خاندانی نظام تلپٹ ہو گیا ہے، افرادِ خانہ کے مابین محبت و الفت کے جذبات کوئی معنی نہیں رکھتے۔ گھر کے سکون کو ٹھوکر مار کر جب عورت باہر نکلی تو ہزاروں ہولناک نگاہوں کا شکار ہوئی۔ بے حیائی عام ہوئی اور پھر ایسی بے حیا تہذیب نے جنم لیا کہ شرافت کا لبادہ تار تار ہو گیا۔ مادی و نفسانی خواہشات کی دوڑ سے بھرپور مگر الفت و محبت سے عاری اس جرائم زدہ معاشرے کے بچوں میں خودکشی کی شرح بہت زیادہ ہے۔ بچے اپنی تنہائیوں کا غم "منشیات" سے مٹاتے ہیں یا والدین ان پر یہ احسان کرتے ہیں کہ انہیں "چائلڈ کیئر سینٹرز" میں داخل کر کے اپنی خلاصی کر لیں۔ عورت کسی بھی موقع پر ہمدردی کی

مستحق نہیں ہوتی۔ مغربی مرد آج بھی یہی چاہتے ہیں کہ عورت ہر معاملے میں ان کا صادر کیا ہوا حکم تسلیم کرے اور ہر حال میں گھریلو اور معاشی ذمے داریاں ادا کرے۔

مغرب کی معاشرت کا حال یہ ہوا کہ عورت نے مساوات کے فریب میں خود اپنے جسم و جان پر ظلم کا باب کھولا، جی بھر کے اپنا استحصال کرایا اور فطرت نے صنفِ نازک ہونے کی حیثیت میں جن ذمے داریوں سے اس کو دور رکھا تھا خود ہی ان کا ہار اپنے کاندھوں پر اٹھایا۔ آزادئ نسواں اور مرد کی برابری کے نعرے نے مغربی معاشرے کو افراتفری و انتشار سے دوچار کیا ہے اور عورت کو ظلم و استحصال کی منہ بولتی تصویر بنا دیا ہے۔ کیا مغربی عورت اور مغربی معاشرے کی حالتِ زار ایسی ہی قابلِ تقلید ہے کہ مسلم معاشروں کو بھی اسی رخ موڑ دیا جائے؟ اور مسلم عورت جو معاشرتی نظم و ضبط، حیا کے فروغ، عصمت و عفت کی حفاظت اور خاندانی نظام کے استحکام میں ذمہ دار کردار ادا کر رہی ہے، اسے آزادئ نسواں کے نام پر تفریح و نشاط، فیشن و بے پردگی، کسبِ معاش کا راستہ دکھایا جائے اور ہوٹلوں، کلبوں، مخلوط محفلوں، تھیٹروں اور ٹی وی کی اسکرین کی رونق بنا کر استحصال کی راہ پر ڈال دیا جائے؟

حوا کی بیٹی کو ہر جگہ آزادی و برابری کے دھوکے میں ظلم و استحصال کا تحفہ ملا ہے مگر اس کے باوجود اسے اس راہ پر چلانے کا عمل جاری ہے، آزادی و برابری کے سفر پر حوا کی بیٹی کو گامزن کرنے والوں کو مغرب کے ٹوٹے پھوٹے معاشرے سے ضرور عبرت پکڑنی چاہئے، وہ معاشرہ جس میں خواتین کی آزادی کی حمایتی خواتین، اپنے خیالات پر نظرِ ثانی کرنے پر مجبور ہو گئیں۔ بی ٹی فریڈن جو مغرب میں خواتین کی آزادی کی پرجوش علم بردار تھیں اپنی کتاب پُرزور میں لکھتی ہیں: "کیا اولاد سے نجات حاصل کر کے یا خاندان کے ادارے سے باہر نکل کر عورت حقیقی معنوں میں امن و سکون حاصل کر سکتی ہے؟" آزادئ نسواں و مساواتِ مرد و زن کا نعرہ لگانے والی ایک اور خاتون جرمن گریئر کہتی ہیں: "ہمارے سب اندازے غلط ثابت ہوئے، ہمیں ملازمت سے زیادہ گھر کی ضرورت ہے۔"

احترامِ آدمیت اور نوعِ بشر کی برابری کے نظام کی بنیاد ڈالنے کے بعد اسلام نے اگلے قدم کے طور پر عالمِ انسانیت کو مذہبی، اخلاقی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی شعبہ ہائے زندگی میں بے شمار حقوق عطا کیے۔ انسانی حقوق اور آزادیوں کے بارے میں اسلام کا تصور آفاقی اور یکساں نوعیت کا ہے۔ جو زماں و مکاں کی تاریخی اور جغرافیائی حدود سے ماوراء ہے۔ اسلام میں حقوقِ انسانی کا منشور اللہ کا عطا کردہ ہے اور اس نے یہ تصور اپنے آخری پیغمبر نبی کریم ﷺ کی وساطت سے دیا ہے۔ اسلام کے تفویض کردہ حقوق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک انعام کے طور پر عطا کیے گئے ہیں اور ان کے حصول میں انسانوں کی محنت اور کوشش کا کوئی عمل دخل نہیں۔ دنیا کے قانون سازوں کی طرف سے دیئے گئے حقوق کے برعکس یہ حقوق مستقل بالذات، مقدّس اور ناقابل تنسیخ ہیں ان کے پیچھے الٰہی منشا و ارادہ کارفرما ہے اس لیے انہیں کسی عذر کی بناء پر تبدیل، ترمیم یا معطل نہیں کیا جا سکتا۔ ایک حقیقی اسلامی ریاست میں ان حقوق سے عام شہری مستفیض ہو سکیں گے۔ اور کوئی ریاست یا فردِ واحد ان کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا اور نہ ہی وہ قرآن و سنّت کی طرف عطا کردہ بنیادی حقوق کو معطل یا کالعدم قرار دے سکتا ہے۔

پس اے روشن خیال حضرات و بیبیو! مغرب کی نظروں کو خیرہ کرنے والی چمک دمک کی طرف مت لپکو کہ یہ تو جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے۔ بیٹیاں قوم کی عزت ہوتی ہیں اور جو قوم اپنی بیٹی کو عزت نہیں دے سکتی، وہ ترقی نہیں کر سکتی۔ مغربی معاشرے میں عورت کا کوئی مقام نہیں، 18 ملین بچے امریکا میں اپنی شناخت سے محروم ہیں، 12.5 ملین خواتین ڈپریشن کا شکار ہیں، خواتین کو اغوا کرنا، انہیں قید کرنا، اس کو اپنے بچوں سے ملنے سے محروم

معیار ہے۔ مغربی تہذیب کی دلدادہ آنٹیاں ڈالرز اور مراعات کے عوض مغرب کی آلہ کار بن رہی ہیں، اور مسلم معاشرے کے خلاف کرنا امریکا کا دہرا علم بغاوت بلند کر رہی ہیں، گویا اپنے ہی ہاتھوں اپنے آنگن کو آگ دکھا رہی ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ اسلامی خاندانی نظام کا تحفظ ہی مسلمان خاتون کی آبرو کی ضمانت ہے۔

رہے نام میرے رب کا جس نے عورت کو ایک ممتاز مقام عطا کیا لیکن ہم نے دنیاداری میں اس کو بھلا دیا!

زمانے والے جسے سوچنے سے خائف تھے
وہ بات اہل جنوں محفلوں میں کرتے رہے

بروز جمعرات 9 رجب المرجب 1443ھ 10 فروری 2021ء

ان کہی کہانی

مالک کی شان نرالی ہے اور اس کے رنگ انوکھے ہیں۔ کہیں تو حدِ نظر تک پھیلے ہوئے سرسبز میدان اور کہیں جھاڑ جھنکاڑ سے اٹے ہوئے۔ کہیں سر بلند کوہسار بے آب و گیاہ تپتے صحرا اور کہیں ہری بھری شاداب کھیتیاں، کہیں ننھے ننھے سے پودے اور کہیں بلند بلند و بالا جھومتے اشجار، کہیں گنگناتی ندیاں اور کہیں خاموش جھیلیں، کہیں دوڑتا بھاگتا، شور مچاتا دریا اور کہیں بپھرا ہوا سمندر، کہیں کہیں خوبصورت بولیوں، والے رنگا رنگ پرندے اور کہیں چیر پھاڑ کرنے والے درندے..... ہزار رنگ لئے ہوئے ہے یہ کائنات اور اس کا اسرار! عقل حیران ہو جاتی ہے! دیکھئے کیا یاد آ گیا!

میں واقفِ اسرار تو پہلے بھی نہ تھا
اس سے مجھے انکار تو پہلے بھی نہ تھا
تھی راہِ طلب دل کے چراغوں سے منور
روشن کوئی مینار تو پہلے بھی نہ تھا

خالق کی مخلوق ایک جیسی نہیں ہو سکتی جیسے مصور کی تصویر۔ ہم سب مختلف خدوخال لئے ہوئے ہیں، اور سب کے سوچنے کا انداز بھی ایک جیسا نہیں ہے۔ کہیں معصومیت، سادگی، اپنا پن، ایثار اور قربانی ہے، کہیں مکاری، عیاری، چھینا جھپٹی اور سینہ زوری ہے۔ ایسی ہی ہے، ایسی ہی تھی اور ایسی ہی رہے گی دنیا۔ مالک کے رنگ انوکھے ہیں، کبھی رحیم و کریم، کبھی جبار و قہار، خالق و مصور، ودود، ستار، اور لطیف و غفار۔ اب آپ چلتے چلے جائیں، دنگ رہ جائیں گے آپ۔ کچھ لوگوں کو بولنے کا بڑا شوق ہوتا ہے اور اپنی گفتگو سے لوگوں کو مرعوب اور مسحور کر لیتے ہیں اور بعض افراد کو لفظوں کی جادوگری پر بڑا کمال ہوتا ہے اور اپنی تحریروں سے پڑھنے والوں کو دیوانہ بنا لیتے ہیں۔ مجھے مفتی صاحب کی بات یاد آ گئی، بہت بڑے صاحبِ طرز ادیب تھے۔ بابا اشفاق اور اسی قبیل کے اور بہت سے افراد بھی وہاں موجود تھے۔ یہ میری ان سب سے پہلی ملاقات تھی۔ "یہ بڑے بڑے ادیب، لکھاری اپنی کتابوں اور تحریروں میں بڑے بڑے مینار لیکن عملی زندگی میں "بونے" ہوتے ہیں۔" یہ لکھ کر اپنی کتاب پر اپنے دستخط ثبت کئے اور ایک دعا کے ساتھ میرے حوالے کر دی۔

ربِ کریم کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ قارئین کی ایک بڑی تعداد مجھے اپنے موضوعات سے ہٹنے نہیں دیتی۔ جہاں دعاؤں اور بے پناہ محبتوں کا اظہار ہوتا ہے وہاں محاسبہ بھی جاری رہتا ہے اور بہت کچھ سیکھنے کو ملتا رہتا ہے۔ اہلِ فکر و دانش بھی اپنے قیمتی آرا سے نوازتے رہتے ہیں۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ ان قیمتی آراء کی روشنی میں اپنی اصلاح بھی جاری رکھوں۔ میں نے اپنے کئی مضامین میں اس زمانے کی مجاہدہ ڈاکٹر عافیہ صدیقی، آمنہ مسعود جنجوعہ اور دیگر ایسے کئی کرداروں کا ذکر اپنی تحریروں میں اس لئے کیا کہ قارئین کو بتایا جا سکے کہ ابھی یہ زمین بانجھ نہیں ہوئی اور موجودہ حکمرانوں کے ضمیروں کو بھی جھنجھوڑتا رہا کہ یہ قوم کی بیٹیاں کس حال میں ہیں اور ان کے تعذیب اور ابتلا کا دور کب ختم ہو گا؟

"ہم سب اس بات سے واقف ہیں کہ بیٹیاں ایک ایسی پھلواری کی مانند ہوتی ہیں جن کے بغیر کوئی بھی گھر سجتا نہیں۔ بچیاں جینے کا سہارا ہوتی ہیں، آنکھوں کی ٹھنڈک، راحتِ جاں بیٹیاں ہیں پھلواری، خوبصورت الفاظ کی مالا ہیں" میرے ایک کالم میں یہ پڑھ کر ایک ماں نے جو میرا محاسبہ کیا ہے اور جس دکھ اور درد کا اظہار اس نے کیا ہے، میری شدید خواہش تھی کہ یہ ٹیلیفون بند ہو جائے اور میں مزید شرمندگی سے بچ جاؤں لیکن دو بچیوں کی

محترمہ اور حساس ماں نے شائد طے کر رکھا تھا کہ وہ اپنے ترکش کے تمام تیر چلائے بغیر میدان سے ہٹنے والی نہیں ! میں نے سوچا کہ قارئین کو بھی شریک کرلوں۔

"آپ کی سچائی اور محبت سے لکھی ہوئی تحریر نے میرے دل کو دکھی کر دیا ہے اور نہ معلوم کتنی ماؤں نے بین کئے ہوں گے، اشک بہائے ہوں گے، اپنے دلوں کو دکھی کیا ہوگا۔ کس زمانے کی بات کر رہے ہیں آپ ! ہوں گی کسی زمانے میں بچیاں جینے کا سہارا.... آج کے دور میں بچیاں والدین کیلئے خوف اور دکھ کی علامت بن کر رہ گئی ہیں۔ بیٹیوں کے والدین کس طرح خوش نصیب ہیں ؟ اندیشے، وسوسے، جلتے بجھتے امیدوں کے دیئے، معاشرے میں عورت کے حوالے سے ہر طرف تباہی، بچیوں کے مستقبل کے حوالے سے ہمہ وقت والدین سولی پر لٹکے رہتے ہیں۔ ہم تو اپنی بچیوں کو محبت سے سیراب کرنا چاہتے ہیں، ہم تو انہیں محبت اور اہمیت دینا چاہتے ہیں لیکن یہ معاشرہ ایسے کرنے نہیں دیتا۔ یہ بہت لاڈ چاہتی ہیں، درست ہے، مگر ان کی اس چاہت کی پاسداری کون کرے گا ؟ ماں باپ کے گھر اٹھارہ یا بیس سال رہنا ہوتا ہے، محبت سے سیراب ہونے والوں کو محبت ہی چاہیے ہوتی ہے۔ اس کے بعد مجازی خدا کی مرضی، حقیقی خدا بن کر جب چاہے اس محبت کی دیوی کا جینا حرام کر دے۔

صبر و رضا کی پیکر، محبت کی طالب، ایثار و قربانی کے جذبے سے سرشار کو کاروکاری کی بھینٹ چڑھا کر اس کی زندگی کے دیئے کو بجھا دیا جائے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ مردوں کا معاشرہ ہے اور مرد جزا و سزا اور انصاف کا ٹھیکیدار ہے۔ جو قانون مرد توڑے اس کی سزا بھی عورت کو مل رہی ہے۔ مرد عورت کیلئے سحر ہونے ہی نہیں دیتا۔ مختاراں مائی کی عزت تار تار کر دی گئی۔ وہ اٹھارہ سال تک انصاف کیلئے عدالتوں میں دھکے کھاتی رہی اور دوسری طرف ڈکٹیٹر مشرف نے عالمی میڈیا کو یہ کہہ کر پاکستانی خاتون کو شرمسار کر دیا کہ مغرب میں سیاسی پناہ یا مالی مدد حاصل کرنے کیلئے ایسے ڈرامے رچائے جاتے ہیں، کتنے باپوں نے احتجاج کیا ؟ کیا بلوچستان میں زندہ درگور کر دی جانے والی لڑکیوں کی چیخیں کسی کو آج تک سنائی دیں ہیں ؟ جب قبل از اسلام والی تاریخ دہرائی جا رہی تھی ؟ میں نے ان زندہ درگور ہونے والی بچیوں پر آپ کے وہ تمام کالم بھی پڑھے تھے، لیکن آپ کی تمام مساعی بھی اس معاشرے میں بے گناہ بیٹیوں کی فریاد محبت کرنے والے باپوں کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کیلئے ناکافی رہے ! ان بچیوں نے قصدِ جرم کیا تھا، جرم نہیں کیا تھا۔ ملک کے سب سے بڑے ادارے سینیٹ میں کھڑے ہو کر طاقتور بلوچ رہنماؤں نے اسے اپنی اقدار سے تعبیر کرتے ہوئے ریاست کو کسی بھی قسم کی کاروائی پر تنبیہ کی اور آپ جیسے لکھاریوں کو اس معاملے پر احتجاج کرنے پر کھلم کھلا دھمکیوں سے خوفزدہ کرنے کی کوششوں پر ملک کے کسی قاضی نے بھی تو کوئی نوٹس نہیں لیا، آخر ریاست اور دیگر ادارے کیوں خاموش رہے ؟

ایک جنرل جو اپنے آپ کو کمانڈو بھی کہتا تھا اور اپنی طاقت کا اظہار برملا اپنے دونوں ہاتھوں کے مکوے دکھا کر قوم کو ڈراتا رہتا تھا، جو پاکستان کے سب سے بڑے منصب پر بھی ناجائز اپنی طاقت کے بل بوتے پر قبضہ کئے بیٹھا تھا، وہ ایک بیٹی کا باپ بھی تھا، اس نے قوم کی ایک بیٹی عافیہ صدیقی کو چند ہزار ڈالروں کے عوض مکار دشمنوں کے ہاتھ بیچ دیا۔ کیا کسی بیٹی کا باپ آرام سے گہری نیند سو لیتا ہوگا ؟ کیا عافیہ کا دکھ، کرب، اذیت، بے توقیری پر سکون نیند سونے دیتی ہوگی ؟ آٹھ سال کی بچی چالیس سالہ مرد کے ساتھ بیاہ دی جاتی ہے، خون بہا کے طور پر چھ سالہ بچی بلکہ اس سے چھوٹی بچیوں کو دشمنوں کے گھر بھیج دیتے ہیں، بیوی بنا کر یا داسی بنا کر۔ ایک زندہ بیٹی تسنیم سومرو لنگی کا بھوکے کتوں کے آگے تڑپتا ہوا جسم، اس کی کوکھ میں پلنے والے معصوم بچے کو قبل از وقت پیدا کروا کر ممتا کی ماری کو جو اذیت دی گئی، انسانیت بھی رو پڑی ہوگی۔ یہ سب کچھ اس کے سگے ماں باپ کے سامنے کیا گیا، جو اللہ سے اپنے لئے صرف

موت مانگتے رہے، کیونکہ انصاف کی امید نہیں تھی اور آج تک انصاف نہیں مل سکا۔ اس غمزدہ، دکھی، زخموں سے چور چور بدن لئے ماں باپ کے ساتھ کتنے باپوں نے احتجاج کیا ہے آج تک؟

بچی ذرا سی بڑی ہوتی ہے تو خوف کی لہر رگ رگ میں سرایت کر جاتی ہے اور والدین کی دعا ہوتی ہے کہ یااللہ! اسے اچھا گھر ملے، اس کا مستقبل اچھا ہو۔ اللہ جانتا ہے کہ اچھے مستقبل سے مراد بچی کی تعلیم و تربیت، ذہانت، سگھڑپن نہیں بلکہ صرف اور صرف اس کی شادی شدہ زندگی میں کامیابی ہوتی ہے، کہ اچھا محبت و قدر کرنے والا شوہر ملے جو اسے خوش رکھ سکے اور بس! ماریہ شاہ 24 دن زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد زندگی کی بازی ہار گئی۔ ایک نوجوان نے شادی سے انکار کی وجہ سے اس کے چہرے پر تیزاب ڈال دیا تھا۔ یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں کہ کوئی بیٹی مستقبل کے حسین خواب اپنی آنکھوں میں سجائے قبر میں جا سوئی ہے۔ کیا ایسی کوئی مثال ہے کہ شادی سے انکار پر کسی بیٹی نے کسی بیٹے پر تیزاب ڈال دیا ہو، باوجود اس کے کہ اس لڑکے نے لڑکی کی عزت کا جنازہ نکال دیا ہو۔ قصور کی معصوم زینب کا کیا قصور تھا کہ اسے درندہ صفت نے اپنی ہوس میں بھنبھوڑ کر رکھ دیا۔ لاہور سیالکوٹ موٹر پر بچوں کے ہمراہ سفر کرنے والی خاتون سے مبینہ زیادتی اور لوٹ مار کے واقعے کی ہوسناکی کو کیسے بھول جائیں کہ زخموں پر مرہم رکھنے کی بجائے پولیس کے اعلیٰ عہدیدار سی سی پی او لاہور عمر شیخ کے شرمناک بیان کا عدالت عالیہ کو بھی نوٹس لینا پڑا۔ کیا کسی مہذب ملک میں کسی پولیس افسر نے ایسا غیر ذمہ دار بیان دیا ہوتا تو کیا وہ اس عہدے پر مزید فائز رہ سکتا تھا لیکن وہ تو دھڑلے سے اپنی فرعونی فطرت کے مظاہر دکھاتا رہا۔

بیٹی کا ایک المیہ مجھے یاد آرہا ہے کہ: میں اگر بیٹی نہ ہوتی تو میرا باپ اس قدر تھکتا نہیں، اس قدر جھکتا نہیں، بلکہ اس قدر تکلیف دہ حالات میں تو یہ کہنا بہتر ہوگا کہ بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی دفن کر دینے کی رسم کو قانون کا کوئی حصہ بنا دو۔ بچیوں کی معصومیت سے خونخوار بھیڑیئے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور پھر یہ بیچاریاں نہ اِدھر کی نہ اُدھر کی۔ اگر آپ بیٹیوں کو سچائی کا درس دیں گے تو وہ مزید دھوکہ کھائیں گی۔ جھوٹ کے سمندر میں سچائی کو تلاش کریں گی اور یوں اندھیروں میں گم ہو جائیں گی۔ باپ کا دیا ہوا اعتماد، پیار، توجہ، لاڈ، سب دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے، اور اگر بیٹی سسرال میں باپ کی محبت کا تذکرہ کرے تو اور مشکل۔ اس پر اسے طعنہ ملتا ہے کہ ہم تو ایسے ہی ہیں جو کرنا ہے کر لو، نہیں بدلیں گے ہم! ایک معزز خاتون مجھے ہمیشہ یاد آتی ہیں جنہوں نے برملا کہا تھا کہ "بیٹیاں دشمن کے گھر بھلی لگتی ہیں"۔

پروین شاکر، ایک خوبصورت شاعرہ، ذہین بیٹی، ساری زندگی شوہر کی محبت کو ترستی رہی، یہاں تک کہ قبر میں جا سوئی۔ بیٹیوں کے ماں باپ تو اتنے مجبور ہوتے ہیں کہ رخصتی کے وقت اپنی بیٹیوں کو درازی عمر کی دعا تک نہیں دیتے بلکہ کہتے ہیں: ہماری بیٹی سدا سہاگن رہے۔ سو کیا فائدہ اللہ سے بیٹیاں مانگنے کا! میرے آقا و مولا اپنی لختِ جگر سے بہت پیار کرتے تھے، آنکھوں کی ٹھنڈک کہتے تھے۔ آج خود غرضی کے دور میں، درندوں کے ہجوم میں ہم علی جیسا کہاں سے لائیں جن کو اپنی فاطمائیں دے سکیں۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

سنو میری بہن! میں آپ کی بات اور دکھ کو آگے بڑھاتے ہوئے ایک دلخراش واقعہ بھی بیان کرنا چاہتا ہوں۔ میں بھی ایک ایسی ہی معصوم بچی سے واقف ہوں۔ اس نے میرے سامنے چلنا اور بولنا سیکھا، ہمیشہ جھکی نگاہ اور جھکا ہوا سر، کم سنی میں ماں باپ نے نسبت طے کر دی۔ بس اسی کے خواب دیکھتی ہوئی جوان ہوئی۔ یونیورسٹی کی ادھوری تعلیم میں پیا کے گھر پاکستان سدھار گئی۔ ماں باپ کی اکلوتی بیٹی، لاکھوں نہیں کروڑوں روپے شادی پر اٹھ گئے۔ وہ بری طرح کانپ رہی تھی اور مجھ سے ضبط کے باوجود بلک بلک کر اپنے ماں باپ کا خیال رکھنے کی استدعا کر رہی تھی۔ خود میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کو کار میں بٹھا کر رخصت کیا لیکن رخصتی کے چند گھنٹوں کے بعد جس کے سہانے خواب اس نے ساری عمر اپنی آنکھوں میں سجائے رکھے، صاف صاف کہہ رہا تھا کہ تم میرے ماں باپ کی پسند ہو اور تمہارے ماں باپ کی ساری جائداد ہتھیانے کیلئے انہوں نے میری شادی تم سے رچائی ہے وگرنہ میں تو کسی اور کو دل دے چکا ہوں۔ آخر وہی ہوا۔ بمشکل دو مہینے گزرے کہ اس کو واپس لندن لوٹنا پڑا۔ چند دن بعد نہ صرف طلاق اس کے ہاتھوں تھمائی بلکہ اس ناہنجار نے اپنی دوسری شادی کے کارڈ بھی سارے شہر میں تقسیم کئے۔ کبھی کبھار دل دہلا دینے والے سوالات پوچھ کر لاجواب کر دیتی ہے۔ اس دن تو اس کا سوال سن کر کانپ اٹھا کہ ایسا طریقہ بتائیں کہ اس زندگی سے نجات بھی مل جائے اور اسے خودکشی بھی نہ سمجھا جائے کہ مرنے کے بعد میری خودکشی میرے ماں جائے گا۔ اسے معلوم ہے کہ اس کے ماں باپ تو جیتے جی مر چکے، وہ تو اس کو خوش باپ کو جہاں جیتے جی مار دیں گے وہاں میرے اعمال کو ہی موردِ الزام دیا دیکھنے کیلئے اب بھی ہر قربانی کیلئے تیار بیٹھے ہیں۔ اب مجھ میں ہمت نہیں کہ اس سے آنکھیں ملا سکوں۔

گزشتہ دنوں مجھے ملنے آئی تو پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ زور سے جب بھی ہنستی ہے اس کی آنکھیں چھلک جاتی ہیں۔ اس کا اصرار بڑھتا جا رہا ہے کہ میں دوبارہ آپ کے ساتھ اللہ کے گھر کی زیارت کرنا چاہتی ہوں۔ میں کعبے کے سایہ میں بیٹھ کر اپنے رب سے اپنے دل کی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ اس سے پہلے کئی مرتبہ مجھ سے پوچھ چکی ہے کہ جس اسلامی معاشرے کی آپ باتیں کرتے ہیں وہ اس دھرتی پر کہاں ہے؟ جس پاکستان کے قصے آپ سناتے رہے، وہ پاکستان دنیا کے کس حصے پر موجود ہے؟

میری بہن! آپ نے ٹھیک کہا کہ ہم سب لفظوں کی جادوگری کر رہے ہیں، اسے آپ لفظوں کی بازی گری بھی کہہ سکتی ہیں۔ لیکن ایک بات تو آپ مان گئیں ناں کہ آپ نے گلہ کیا تھا اور آپ کا حق بھی ہے کہ شکوہ کریں، اس لئے کہ شکوہ اپنوں سے ہی تو کیا جاتا ہے۔ لیجئے آپ کا ایک شکوہ تو کم ہوا۔ میرا مالک آپ کو ڈھیر ساری خوشیاں دکھائے اور آپ مردوں کو یونہی آئینہ دکھاتی رہیں، رہنمائی کرتی رہیں۔ ہم انسان ہیں، خطاکار ہیں۔ مجھے اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرنے میں ذرہ برابر ہچکچاہٹ نہیں ہے۔ میں آپ کا بے انتہا مشکور ہوں۔ آپ خوش رہیں، شاد رہیں، کچھ بھی تو نہیں رہے گا، بس نام رہے گا میرے رب کا جو الحیی القیوم ہے۔

فضا میں پھیل چلی میری بات کی خوشبو
ابھی تو میں نے ہواؤں سے کچھ کہا بھی نہیں

بروز ہفتہ 11 رجب المرجب 1443ھ 12 فروری 2021ء

"ماں روٹھ گئی ہے"

کائنات کا اسرار ہی یہی ہے۔ سب ایک طرح دیکھتے ہیں نہ سوچتے۔ ہر بات کے ہزار مطالب، ہر منظر کے لاکھ رنگ۔ "ان کہی کہانی" پر آپ نے میری ایک بہن کے خیالات پڑھے جو اس معاشرے میں مردوں کے کردار پر ایک بھرپور احتجاج تھا۔ اس کالم کے شائع ہونے کے بعد حسبِ معمول بہت سی آراء موصول ہوئیں، ان میں بہت سے جذباتی پیغامات بھی تھے، معاشرے کے بگاڑ پر بہت سے کرداروں کو کوسنے بھی دیئے گئے اور اب تک مسلسل پیغامات موصول ہو رہے ہیں لیکن اب ایک اور میری بہن نے اس کے جواب میں اپنے جن جذبات کا اظہار کیا ہے، وہ بھی آپ کی خدمت میں پیش ہے!

"کہاں ہیں آج کی فاطمائیں بھائی؟ بہت قابلِ احترام ہیں آپ کی قاریہ بہن، جن کے سامنے آپ نے اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کیا، ان کے دکھائے ہوئے آئینہ میں نہ معلوم آپ نے اپنے چہرے کے کیا خدوخال دیکھے کہ فوراً اُن سے رہنمائی کی درخواست کر بیٹھے۔ ان کی آراء پڑھ کر میرا تو جذبہ جنون میں بدلنے لگا کہ کہاں دیکھوں انہیں، اور ہاتھ چوموں ان کی فاطماؤں کے، جن کیلئے ان کے دیدہ تر علی کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ درندوں کے ہجوم میں وہ تنہا ہیں اپنی فاطماؤں کے ساتھ، اور ایک خوف اور دکھ نے انہیں سولی پر لٹکا رکھا ہے۔ قربان جایئے اس ماں کے جذبات پر۔ میں بھی ماں ہوں تین بیٹیوں کی، ایک یونیورسٹی میں استاد بھی ہوں، سولی پر میں بھی چڑھی ہوئی ہوں، لیکن درندوں کے ہاتھوں نہیں، بلکہ اس قوم کی "ماؤں" کے ہاتھوں! جو کچھ دیکھتی ہوں میں شب و روز، اور دکھ یہ کہ لب پر لا بھی نہیں سکتی۔ مجھے کہنے دیجئے کہ اس قوم سے "ماں روٹھ گئی ہے"۔

اگر آج ماں زندہ ہوتی تو بیٹیاں یوں سرِ بازار اپنی عزتوں کے جنازے نہ کاندھوں پر لئے پھرتیں۔ اب تو یونیورسٹی کسی تعلیمی درسگاہ کی بجائے کوئی فیشن میلہ کا منظر دکھائی دیتی ہے۔ ہر روز سینکڑوں طالبات میری نظروں سے گزرتی ہیں۔ پہلے تو آستینیں مختصر ہوتے ہوتے غائب ہو گئیں تھیں اور شلواریں اور پاجامے دن بدن یوں اوپر چڑھ گئے تھے کہ پنڈلیاں کھلتی ہی چلی گئی تھیں مگر اب تو باقاعدہ ٹرائوزر اور جین نے لے لی ہے اور اس کے ساتھ بے ہنگم شرٹ۔ مجھے ذرا غصہ نہیں آتا ان بچیوں پر، مجھے غصہ آتا ہے ان "ماؤں" پر جن کے سامنے یہ بچیاں تیار ہو کر نوک پلک سنوار کر گھروں سے نکلتیں ہیں۔ کیا یہ مائیں سمجھتی ہیں کہ یوں ان کے بہتر رشتے دستیاب ہو سکیں گے؟ تو بھول ہے یہ ان کی۔ ایسے وہ کتنی ہوسناک نظروں کی تسکین کا سامان بنتی ہیں، کیا گھر واپس آنے والی بچیوں کی مائیں یہ سوچتی ہیں؟

میں درزی سے بضد تھی کہ میری بچی کی آستین "21" انچ کی ہو گی، وہ کہہ رہا تھا: اس کپڑے میں صرف "16" انچ کی بن سکتی ہے۔ میں نے کہا کہ "میری بیٹی نہیں پہنے گی!" اس پر اس نے جل کر دوکان کے دوسرے سلے ہوئے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا اور بولا "یہ سب قمیضیں بغیر آستینوں کے ہیں، یہ آپ ہی کی بیٹیوں کی ہیں"۔ بھائی! آپ یقین کریں اس نے نیم خواندہ ہونے کے باوجود وہ طمانچہ مارا تھا قوم کی ماؤں کے منہ پر کہ میں مارے شرم کے کچھ بھی تو نہ کہہ سکی اور کپڑا اٹھا کر بوجھل قدموں سے دوکان سے نکل گئی۔ طارق روڈ پر اپنی بارہ سالہ بیٹی کیلئے لباس کی تلاش میں گئی کہ کسی شادی میں پہننے کیلئے اس کو نیا جوڑا درکار تھا۔ آپ یقین کریں کسی دوکان پر آستینوں والے کپڑے نہ مل سکے۔ ایک دوکاندار بولا: "آستینیں علیحدہ رکھی ہیں، آپ کٹ اس کر سکتی ہیں" میں نے کہا کہ آستینیں قمیض سے علیحدہ کیسے ہو گئیں؟ بولا "مائیں پسند نہیں کرتیں آستینوں والے کپڑے! ہم تو وہی پروڈکٹس لاتے ہیں جن کی ڈیمانڈ ہوتی ہے"۔

کیا بچیاں اپنی خریداری خود کرتی ہیں؟ کیا ان کا ٹیسٹ ان کا ذوق ان کی مائیں ترتیب نہیں دیتیں؟ اکثر بس میں سفر کرنے کا اتفاق ہوتا ہے مجھے۔ میرے

قریب بیٹھی ہوئی میری ہی یونیورسٹی کی طالبات کے ہاتھ مسلسل موبائل پر مصروف ہوتے ہیں یا موبائل کو کان سے لگائے وہ خوابوں کی دنیا میں پہنچی ہوئی ہوتی ہیں۔ان کے چہرے پر آتے جاتے رنگ خوب عکاسی کرتے ہیں کہ وہ کس سے باتیں کر رہی ہیں، لیکن وہ اپنے اطراف کی دنیا سے بے خبر افسانوی دنیا کا حصہ ہوتی ہیں۔ان کے ہاتھوں میں جب ہم نے موبائل دیا تو کوئی چیک اینڈ بیلنس رکھا؟اس ماں کے آنسو مجھے نہیں بھولتے جو انتہائی معزز اور متمول خاندان سے تعلق رکھتی تھی،اور اس نے بیٹی کی شادی مجبوراً اس نوجوان سے کی جو اس کے گھر انٹرنیٹ کنکشن دینے آیا تھا۔اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ نیٹ پر دوستی کا نیٹ ورک اتنا مضبوط ہو جائے گا کہ ماں کی برسوں کی محبت کو ایک لمحے میں بہالے جائے گا۔

میں نے اس خاتون سے کہا کہ "بیٹی پر نظر کیوں نہیں رکھی؟"بولیں "ہاں یہ اندھا اعتماد تھا میرا، جیسا میری ماں نے مجھ پر کیا تھا جس کو زندگی بھر مجروح کرنے کا خیال تک نہ آیا تھا لیکن میں نے اس وقت سوچا ہی نہ تھا کہ میرے گھر میں یہ سب کچھ ہو جائے گا۔اب جی چاہتا ہے کہ چیخ چیخ کر سارا معاشرہ سر پر اٹھالوں کہ اے میری طرح کی بدنصیب ماؤ! خدارا ہوش میں آؤ۔" بازار میں چلتے چلتے قدم ٹھٹھک سے جاتے ہیں جب وہ ادھیڑ عمر کی ماں جس نے خود کو عبایا سے ڈھانپا ہوا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ اس کی ٹین ایج کی بچی مختصر یا بغیر آستینوں اور نیم عریاں پنڈلیوں کے ساتھ اٹھلا اٹھلا کر چل رہی ہوتی ہے۔ میری میٹرک کی طالبہ بیٹی مجھے نام گنواتی رہی کہ عید پر اس کی کن کن سہیلیوں کی ماؤں نے بیٹیوں کو کیپری (وہ پاجامے جن سے نصف پنڈلیاں نظر آتی ہیں)اور جینز پتلون لے کر دیئے ہیں۔اس کی دلیل یہ تھی کہ اچھی مائیں وہ ہوتی ہیں جو بچیوں کی خواہشات کا خیال رکھتی ہیں!

بھائی! مجھے بتائیں، میں وہ دن کیسے بھول جاؤں جب میری بیٹی کی میٹرک کی الوداعی تقریب تھی جس میں والدین مدعو تھے۔مائیں پنڈال میں تھیں اور باپ باہر گاڑیوں کے پاس موجود،اور بچیاں جب والدین کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر گھروں کو روانہ ہونے لگیں تو میرا مضطرب دل دہائی دیتا رہ گیا کہ قوم سے "ماں" تو روٹھی تھی،اکبرالہ آبادی کی روح بھی تڑپ گئی ہو گی کہ سچ مچ آج کے باپ کی غیرت بھی عزتِ سادات کی طرح رخصت ہو گئی کہ نیم عریاں بازو، نظر آتی ہوئی پنڈلیوں،اسکرٹس کے ساتھ چست بلاؤز، خاصے اونچے لہنگے، رنگے ہوئے بال۔آپ یقین کیجئے یہ کسی ٹی وی ڈرامے کی ریکارڈنگ کا منظر میں آپ کو نہیں بتا رہی، یہ وہ سولہ اور سترہ سالہ دوشیزائیں تھیں جو مستقبل کی "مائیں" ہیں۔میرا جی چاہا کہ جا کر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں کہ حال کی "ماں" کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا جائے جس نے مستقبل کو یہ "ماں" دی ہے!!!

بھائی! دل تھام کر میری یہ بات سنیں کہ یہ تقریب میری ہی یونیورسٹی میں ہو رہی تھی جہاں صوبے کا وزیرِ تعلیم دوسری مقامی سیاسی قیادت کے ساتھ موجود تھا۔ مجھ جیسے کچھ اساتذہ نے آج سے کچھ برس پہلے جب دلائل کے ساتھ ایسی مجالس کے انعقاد کو روکنے کی سفارشات پیش کی تھیں تو ہمارا منہ بند کرنے کیلئے ایک ایسی لسانی تنظیم جس کا سربراہ اس وقت آپ ہی کے ہاں برطانیہ میں موجود ہے، نے اپنے ٹیلیفونک خطاب میں اپنی روشن خیالی کا اس طرح اظہار فرمایا کہ ہماری ملازمتوں کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنی جانوں کو بچانا بھی مشکل ہو گیا تھا لیکن یہ نہ سمجھیں کہ اب معاملات کچھ بہتر ہو گئے ہیں، بس یہ سمجھ لیں کہ لکھنے کے لائق نہیں زبردست بحث سن کر میں کمرے میں داخل ہوئی تو پروگرام "میرا جسم

میری مرضی" کے موضوع پر چل رہا تھا، جس میں پروگرام کی میزبان نے بغیر آستین کے ٹی شرٹ اور شارٹس پہن رکھی تھی جس میں اس کے گھٹنے تک برہنہ نظر آرہے تھے اور کچھ مہمان لڑکیاں کہیں کہیں سے پھٹی ہوئی جینز زیبِ تن کی ہوئی اور سر پر مختلف رنگوں کے چشموں چڑھائے اپنے لمبے لمبے رنگین ناخنوں کی نمائش کرتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ جب میں نے افسوس کا اظہار کیا تو میری بیٹی میرے کان میں کہنے لگی کہ "امی! شارٹس کا یہی سائز ہوتا ہے اور یہ کٹی پھٹی جینز بہت قیمتی ڈیزائن میں شمار ہوتی ہیں"۔

ایک مرتبہ میں نے اپنے درزی سے مدد مانگی، اپنی بچیوں کے کپڑوں کے ڈیزائن کیلئے۔ آپ یقین کیجئے، اس نے جس کتاب کی میرے سامنے ورق گردانی کی، وہ کسی یورپ کے معاشرے کی تصاویر نہیں تھیں۔ وہ پاکستانی مسلمان لڑکیاں تھیں، لیکن ان کے لباس، ان کے کلوز اپ، کسی انڈین و مغربی عریاں فلم سے کم نہیں تھے! کون سا گھر ہے جہاں مائیں ایک چھت کے نیچے بیٹیوں کے ساتھ انڈین ڈرامے اور فلمیں نہیں دیکھتیں! حیا کو تو ہم نے خود رخصت کیا، اپنی بیٹیوں کو بازار کی جنس بنا دیا۔ کوئی اور بعد میں، قصوروار پہلے میں خود ہوں، اس لئے کہ میں ایک "ماں" ہوں۔ زمانے کی رو میں بہنے والی، عقل و شعور سے عاری، خوفِ خدا سے دور اس معاشرے کی "ماں"۔ ایک مسلمان ماں نہیں، صرف "ماں"۔

آج کل ہمارے لئے یہ بہت آسان ہو گیا کہ اس سارے طوفانِ بدتمیزی کی ذمہ داری نت نئے ٹی وی چینلز پر ڈال کر خود کو معصوم اور بے بس ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کوئی یہ نہیں کہتا کہ ہمارے ان سیاسی حکمرانوں نے اپنے مغربی اور صہیونی آقاؤں کی خدمت بجالاتے ہوئے اپنی آئندہ نسل کا بیڑہ غرق کر دیا ہے۔ بھائی! آپ ہر نقصان کا ازالہ کر سکتے ہیں لیکن جس قوم کے اخلاق تباہ کر دیئے جائیں اس قوم کو پستی اور انحطاط کی اندھیری کھائیوں میں گرنے سے آپ کبھی نہیں بچا سکتے۔ آپ جیسے کالم نویس ہر روز ملک کو دشمن کی سازشوں سے باخبر رکھنے کیلئے کوئی نہ کوئی موضوع ضرور ڈھونڈ لاتے ہیں لیکن اب تک آپ نے قوم کی اس ابتری کا ذکر کبھی نہیں کیا؟ ہم یہ بات بھی بڑی آسانی کے ساتھ کہہ دیتے ہیں کہ ملک کی ترقی کیلئے خواتین کو ان دقیانوسی خیالات سے آزادی دلانے کی ضرورت ہے اور اس کیلئے مغربی عورت کی مثال دی جاتی ہے کہ کس طرح آج وہ ملک کے ہر محکمے اور ادارے میں اپنی ذمہ داریاں نبھا رہی ہیں اور ہم نے عورتوں کو گھروں میں قید کر رکھا ہے۔

بھائی! یہ حقیقت نہیں ہے، میں یہ بات اس لئے یقین سے کہہ رہی ہوں کہ میں نے بھی برطانیہ کی سب سے بڑی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لے رکھی ہے اور میں نے بھی اپنی زندگی کے کچھ قیمتی سال وہاں گزارے ہیں، اور اب بھی مجھے کئی دفعہ امریکا اور یورپ کے مختلف تعلیمی اداروں سے رابطے کی دعوت ملتی رہتی ہے اور میں اپنے ملک کی نمائندگی بھی ایک مسلمان پاکستانی عورت اور استاد کے ناطے کر چکی ہوں، مغربی ممالک کی پڑھی لکھی خواتین کی آراء اس سے بہت مختلف ہیں جن کا پرچار ہمارے یہ کچھ بگڑے ہوئے ضمیر فروش سیاسی رہنما اور ان کی تائید کرنے والے قلمکار کر رہے ہیں۔ کوئی ان سے یہ تو پوچھے کہ 74 سال گزر جانے کے بعد اب یہ بحث کس نے شروع کرنے کا اشارہ کیا کہ قائداعظم سیکولر پاکستان چاہتے تھے، لبرل جمہوری پاکستان کے خدوخال ایسے ہونے چاہئیں اور محض خودستائی میں اپنی تقاریر اور انٹرویو کو بڑے شوق سے تحریر کر کے اپنے کالموں کا پیٹ بھرنے کی کوششیں کرتے رہتے ہیں۔

مغرب کے کئی دانشور جن سے مجھے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے اور وہ اب بھی میرے رابطہ میں ہیں، وہ پاکستان کی مسلم خواتین کیلئے تعلیم کو تو بہت ضروری سمجھتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ مغربی معاشرے کی بے راہروی سے بچنے کا ذکر بھی بڑی دلسوزی کے ساتھ کرتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بہت ہی سینئر اور

عالمی شہرت یافتہ پروفیسر نے میرے سوال کے جواب میں بڑی تفصیل سے اعتراف کیا کہ عالمی جنگوں سے قبل ہمارے ہاں معاشرے کی "جائنٹ فیملی سسٹم" کی روایات نے ہمیں جہاں بڑی خوبصورتی سے جوڑ کر رکھا ہوا تھا وہاں بچوں کی نگہداشت اور تربیت کیلئے کئی کان، ہاتھ اور دماغ اپنی ذمہ داریاں نبھاتے تھے اور اخلاقی طور پر ہم بہت سی برائیوں اور بیماریوں سے محفوظ تھے اور میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ یہ سارا سسٹم ہم نے مسلمانوں کی تاریخ سے حاصل کیا لیکن جنگی تباہ کاریوں کے بعد ہم نے اس عظیم ورثے سے منہ موڑ لیا اور اب مالی آسودگی سے تو بہرمند ہو گئے ہیں لیکن روحانی اور اخلاقی دولت سے بری طرح محروم ہو گئے ہیں لیکن میں تم لوگوں کو یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ تم اس عظیم نعمت کی بہت قدر کرو کہ ابھی بھی تمہارے ہاں یہ قدریں باقی ہیں کیونکہ میرا مشاہدہ ہے کہ یہاں ہمارے ہاں اب بھی "اولڈ پیپلز ہومز" میں پاکستانی مسلمانوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور کیا کچھ کہا، اب میں اس کی تفصیل بتانے بیٹھ گئی تو اس کیلئے کئی اوراق درکار ہوں گے۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ آپ معاشرے کی اس بیماری کو اجاگر کر کے ملک کی ماں کی توجہ اس طرف ضرور دلائیں گے۔ اللہ آپ کو خوش رکھے اور "اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ" کی دعا سے اجازت لیتی ہوں"۔

میری بہن! اللہ تعالیٰ آپ کو دونوں جہانوں کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے، میرا مالک آپ کو سدا خوش رکھے اور اپنی مخلوق میں سے کسی کا بھی محتاج نہ بنائے اور آپ کا ہاتھ تھامے رکھے۔ میری اللہ سے دعا ہے کہ ان کور بصری قلمکاروں کو بھی حقیقت کا ادراک ہو جائے تاکہ ہم آخرت کی نجات کا کوئی تو وسیلہ اپنے دامن میں بچا کر رکھ سکیں اور میری یہ دعا بھی ہے کہ ہم ہر حال میں اپنی روٹھی ہوئی "ماں" کو منا کر گھر واپس لا سکیں تاکہ ہماری مستقبل کی مائیں آنے والی بہترین نسل کی آبیاری کر سکیں۔ ثم آمین!

کچھ بھی تو نہیں رہے گا، بس نام رہے گا میرے رب کا جو الحیی القیوم ہے۔

یہ ایسا قرض ہے جو میں ادا کر ہی نہیں سکتا

میں جب تک گھر نہ لوٹوں میری ماں سجدے میں رہتی ہے

بروز سوموار 13 رجب المرجب 1443ھ 14 فروری 2021ء

"بیتِ ندامت"۔۔۔۔۔۔الامان الحفیظ!!!

نئے سال کے پہلے ہی دن اسرائیل کی جانب سے فلسطین میں غزہ کی پٹی کے شمالی علاقے اور حماس کے کمپاؤنڈ کو نشانہ بنایا گیا اور بعد ازاں اسرائیل کی جانب سے دعویٰ کیا گیا کہ اسرائیلی افواج نے ٹینکوں کے ذریعے حماس کی ایک پوسٹ کو بھی نشانہ بنایا۔ فلسطینی سکیورٹی حکام نے ایک خبر رساں ایجنسی کو اسرائیلی حملے کی اطلاع دیتے ہوئے کہا کہ اسرائیلی جنگی طیاروں نے آدھی رات کو نئی جارحیت کا آغاز کرتے ہوئے غزہ کی پٹی کو نشانہ بنایا۔ اس دوران دس میزائل داغے گئے جنہوں نے خان یونس کے مغرب میں قدسیہ کی جگہ کو نشانہ بنانے کے ساتھ ساتھ ایک ٹریننگ کیمپ کو بھی اس حملے کے دوران نشانہ بنایا۔

غزہ کی آبادی تقریباً 20 لاکھ افراد پر مشتمل ہے اور اس علاقے کی لمبائی 41 کلو میٹر جبکہ چوڑائی دس کلو میٹر ہے۔ اس کی اطراف بحیرہ روم، اسرائیل اور مصر سے منسلک ہیں۔ غزہ اور اسرائیل کے مابین حالیہ کشیدگی کئی برسوں میں ہونے والا بدترین تشدد کا راستہ ایک مرتبہ پھر کھلنے کا شدید اندیشہ لاحق ہو گیا ہے جس نے اقوام متحدہ کو "بڑے پیمانے پر جنگ" کی وارننگ دینے پر مجبور کر دیا ہے۔ 1967 کی مشرق وسطیٰ کی جنگ کے دوران اسرائیل نے ماضی میں مصر کے زیر قبضہ غزہ پر قبضہ کر لیا تھا تاہم 2005 میں اسرائیل نے اپنی فوج اور تقریباً 7000 کے قریب آبادکاروں کو یہاں سے نکال لیا تھا۔ یہ علاقہ حماس کے زیر کنٹرول ہے جس نے 2007 کے پر تشدد فسادات کے بعد اس وقت کی گورننگ فلسطینی اتھارٹی (پی اے) کی وفادار قوتوں کو یہاں سے نکال دیا تھا۔ اس کے بعد سے اسرائیل اور مصر نے فلسطینیوں کے خلاف حفاظتی اقدامات کے نام پر غزہ سے سامان اور لوگوں کی آمد و رفت پر پابندی عائد کر رکھی ہے۔

2014 میں حماس اور اسرائیل کے درمیان اسرائیلی جارحیت کے خلاف جھڑپیں ہوئی جبکہ مئی 2021 میں اس معاملے نے پھر سر اٹھایا تھا جس کے نتائج میں پہلی مرتبہ اسرائیل کو حماس کی قوت کا اندازہ ہوا کہ اس بے سر سامانی میں بھی انہوں نے مقابلے کیلئے اپنی شہادتوں کے لامتناہی سلسلے کے ساتھ ساتھ اپنے خون کے آخری قطرے کو بہانے کے عزم کو ایک نیا موڑ دے دیا ہے جہاں اسرائیل کو آسانی سے قبضہ کرنے کی بھاری قیمت چکانا پڑے گی۔

سال نو کے آغاز پر ہی ایک مرتبہ پھر غزہ میں ظلم کی حد ہو گئی اور عالمی میڈیا نے ایک اسازش کے تحت اس مرتبہ ان خبروں کا مکمل بلیک آؤٹ کر رکھا ہے اس میں اچنبھے کی کوئی بات بھی نہیں کیونکہ اہل فلسطین اپنے مسلمان اور اسرائیل کے پڑوسی ہونے کی قیمت پچھلی کئی دہائیوں سے چکا رہے ہیں۔
یہودیوں کی تاریخ ہے کہ وہ اپنے وجود کی قیمت گرد و پیش سے وصول کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ بنی اسرائیل سے عہد نبوی تک جاری رہا ہے۔ جدید دنیا میں جرمنی کا نسل پرست قائد راڈولف ہٹلر وہ شخص تھا جس نے یہودیوں کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش کی۔ فلسطینی مسلمانوں کی بدقسمتی کا سفر تو اسی وقت شروع ہو گیا تھا جب فتنہ پروری کی تاریخ رکھنے والی اس دربدر قوم کے سر چھپانے کیلئے ان کی سرزمین کا انتخاب ہوا تھا۔ ہٹلر کے ہاتھوں یہودیوں کے قتل کاسٹ "کا نام دیا گیا، دراصل میڈیا وار ہی تو تھی اور اس کا تعلق یہودیوں کیلئے ایک الگ مملکت کے قیام کی ضرورت سے تھا کیونکہ عام کا افسانہ جسے "ہولو صہیونی اکابرین نے اپنے لئے ایک الگ وطن کی حمائت میں اس دلیل کا سہارا لیا تھا کہ انہیں ایک اور "ہولوکاسٹ "کا شدید خطرہ ہے، جس سے بچنے کیلئے یہودیوں کو ایک محفوظ شیلٹر، ایک پناہ گاہ درکار ہے۔ اس وقت کی عالمی طاقتوں نے یہودیوں کو ایک محفوظ شیلٹر فراہم کرنے کیلئے اسرائیل کے نام سے عین عالم اسلام کے قلب میں خنجر گھونپنے کا فیصلہ کیا حالانکہ مغربی و مشرقی یورپ میں بے شمار ایسے علاقے تھے جہاں یہودیوں کی اس "نایاب نسل "کو بچانے کیلئے محفوظ شیلٹر قائم کئے جا سکتے تھے۔

یوں یہودیوں نے مظلومیت کے لبادے میں جس سفر کا آغاز کیا..... طاقت، اختیار، وسائل اور الگ وطن ملنے کے ساتھ ہی وہ ظلم کی بدترین شکل گیا اور ہٹلر کے مظلوم و مقتول خود ہٹلر کی طرح ظالم اور قاتل بن بیٹھے۔ انہوں نے کمال چالاکی سے اپنے مقدر کی دربدری، بے وطنی، آہوں اختیار کر اور سسکیوں کی لکیر فلسطینی کے ہاتھوں پر کھینچ دی۔ اس وقت سے آج تک فلسطین کا ہر شہر غزہ ہے، اسرائیل کے ہر غصے کا انجام ایک "ہولوکاسٹ" پر ہوتا ہے۔ اسرائیل تو جو کر رہا ہے، اپنے فتنہ پرور مزاج کے ہاتھوں مجبور ہو کر کر رہا ہے اور اپنی تاریخ دہرا رہا ہے، لیکن مسلم دنیا کیا کر رہی ہے؟ عرب دنیا کہاں ہے؟ جو پہلے چند جلوس نکال کر، غزہ کے لوگوں کیلئے دواؤں اور دودھ کیلئے اپنی بے پناہ دولت سے زکوٰۃ کے چند درہم و دینار وقف کر کے تاریخ کا قرض چکانے کی کوشش کرتی تھی، اب تو یہ سلسلہ بھی مکمل طور پر بند ہو گیا ہے۔

آج سے بارہ سال قبل عین اس وقت جب غزہ میں اسرائیل انسانیت کا دامن تار تار کر رہا تھا، سرد جنگ میں مضمحل اور گھائل ہونے والے روس کو کیا سوجھی کہ اس نے چند دن کیلئے یورپ کو گیس کی سپلائی روک دی۔ گیس پائپ لائینوں کے بے رونق ہوتے ہی یورپ کی رنگین دنیا اجڑنے لگی اور اس کے سارے رنگ ماند اور ساری روشنیاں ٹمٹمانے لگیں۔ کئی ملکوں میں صنعت کا پہیہ رک گیا اور حکومتوں کو ایمرجنسی نافذ کرنا پڑی۔ اس سے جہاں یورپ کی چیخیں نکل گئیں وہیں مسلمانوں کی بے توقیری اور بیچارگی کا مذاق بھی اڑ گیا کہ جو دنیا میں تیل پیدا کرنے والے علاقے پر کنٹرول رکھتے ہیں، لیکن اس دولت کو ڈالروں میں بدلنے سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے۔ اس دنیا میں عزت اور عروج حاصل کرنے کیلئے، حد تو یہ کہ عالمی نظام میں ایک باوقار حیثیت حاصل کرنے کیلئے استعمال کرنے کی قدرت بھی نہیں رکھتے حالانکہ نیویارک کے مجسمہ آزادی کے گرد رنگوں کی بہار اور لندن آکسفورڈ سٹریٹ کی روشنیوں کی قطار تک مغربی اور یورپی دنیا میں اس سیال دولت کا بنیادی حصہ ہے جو ارض فلسطین کے دائیں بائیں پانی کی طرح بہہ رہی ہے۔ یہ ایک ایسی تلوار ہے جسے عرب دنیا چاٹ رہی ہے اور وہ اس بات سے مکمل بے خبر ہے کہ اس کے ہاتھ میں تلوار در حقیقت ایک ہتھیار بھی تھی جسے اب کند کر کے زنگ آلود کر دیا گیا ہے۔

سعودی فرماں روا شاہ فیصل مرحوم عرب دنیا کے وہ واحد قائد تھے جن پر یہ حقیقت آشکارہ ہوئی تھی لیکن پھر کیا ہوا، یہ تاریخ کا حصہ ہے۔ اپنی طاقت غور کرنے اور تشویش کا اظہار کرنے کی طاقت کو سلب ہوتے دیکھ کر اب آپس میں بے سود تبادلہ کا اداک تو در کنار، فلسطین کے ہمسائے اپنی خاموشی، خیال کر کے اسرائیل کو اکاموڈیٹ کر رہے ہیں۔ ظلم کی حد تو یہ ہے کہ نہ صرف یہ ہمسائے اسرائیل کے ساتھ کئے گئے معاہدوں کی پابندی کرتے ہوئے بدترین ناکہ بندی پر عمل کر رہے ہیں بلکہ اپنی زمین اور فضاؤں کو بھی غزہ پر حملوں کے استعمال کی اجازت دے رکھی ہے اور نجانے یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ فلسطین حریت پسندوں کے ایک اخبار نے اس صورتحال میں ماضی میں فلسطین کی آزادی کی جدوجہد کرنے والی تنظیم الفتح کے موجودہ کردار پر تنقید کرتے ہوئے اسے "بیت ندامت" قرار دیا ہے۔ لیکن اس وقت کی مسلم دنیا، او آئی سی، اور عرب لیگ کیلئے اس سے خوبصورت نام شاید ہی کوئی اور ہو۔ المیہ یہ ہے کہ مسلم حکمرانوں نے اپنی مصلحت کوشی، لاچارگی، اور اپنے تاج و تخت کی خاطر جبر ناروا سے قدم قدم پر مفاہمت کی روش کی بناء "بیت ندامت کا مکیں" بنا کر رکھ دیا ہے۔ کچھ نہ ہوتے ہوئے ذلت طاری ہونا کوئی انہونی بات نہیں، لیکن سب کچھ پر ایک ارب سے زائد مسلمانوں کو ہوتے ہوئے ذلت کے عملی عذاب کی تصویر ہوتا آج کا عالم اسلام موجودہ مسلم حکمرانوں کی وجہ سے بنا ہوا ہے۔

اسرائیل کے جنگی طیارے اور اپاچی ہیلی کاپٹر دن رات غزہ کو مزید کھنڈر اور مقتل بنائے ہوئے ہیں، تو اس کا مقصد غزہ کے ڈیڑھ ملین عوام کو خوفزدہ کرنا نہیں بلکہ اس کا مقصد اسرائیل کے ہمسایہ عرب ملکوں، ایران اور ایٹمی ملک پاکستان پر دھاک بٹھانا بھی ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اسرائیل کی علاقائی قیادت وسیادت کیلئے چیلنج بننے کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔ غزہ ایک عظیم انسانی المیے اور یہودی نازی ازم کے دور کا سامنا کر رہا ہے، لیکن یادِ ماضی کا مسلمان ملکوں کی تشویش، غور وخوض، اجلاسوں، بالمشافہ ملاقاتوں، ٹیلیفونک گفت وشنید کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتے ہوئے اب دم توڑ چکا ہے۔ برطانوی خبر رساں ادارے "رائٹر" کا عیسائی نامہ نگار اجڑے اور کھنڈر غزہ کی اداس صبحوں اور بے کیف شاموں کا احوال رقم کرتے ہوئے کہتا ہے کہ غزہ کے قبرستان اب ایک عرصہ دراز سے "ہاؤس فل،، کا منظر پیش کر رہے ہیں۔ وہاں کسی نئے مہمان کیلئے کوئی جگہ باقی نہیں رہی، الّا یہ کہ پہلے سے آسودہ خاک کوئی مردہ اپنی لحد میں کسی نئے مہمان کیلئے کوئی جگہ چھوڑ دے، اور غزہ کے سب سے پرانے اور سب سے بڑے شیخ رضوان قبرستان کے ساتھ ساتھ تمام قبرستانوں میں ایسا ہو رہا ہے۔

اسرائیل کی بمباری سے شہید ایک نوجوان کے لواحقین اس کی لاش کو لیکر ہر قبرستان میں مارے مارے پھرے مگر کوئی خالی جگہ نہیں ملی۔ بے بسی کے ان لمحوں میں ایک شخص کو خیال آیا کہ کیوں نہ اس نوجوان کو دو برس قبل ایک مظاہرے میں شہید ہونے والے اس کے چچازاد بھائی کی قبر میں ہی دفن اور پھر یہی ہوا، اس جواں سال خون آلود لاشے کو دو برس قبل شہید ہونے والے کی قبر میں اتار دیا گیا اور اب کئی سالوں سے یہ سلسلہ جاری کیا جائے۔ ہے۔ یہ کہانی سناتے ہوئے یہ عیسائی نامہ نگار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، اور کہنے لگا کہ میں بتا نہیں سکتا کہ میں آج کس قدر اداس ہوں۔

غزہ میں اسکول، ہسپتال، مساجد، گھر اور اقوام متحدہ کے شیلٹر ہی تباہ نہیں ہو رہے، تادیر اور نسلوں تک قائم رہنے والے المیوں کے دائرے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ بچوں کا المیہ جو ڈیڑھ ملین آبادی کا نصف ہیں، عورتوں کا المیہ جو جواں سال ہیں اور ان کے ہمسفر شہادت کی وادیوں اور اجل کی راہوں میں گم اور پھر شہادت کے احترام میں غزہ کی یہ مقامی روایت کہ شہید کی بیوہ شادی کرنے کی بجائے شہید کی میراث اور نشانی جو کسی بچے کی شکل میں ہو چکے ہیں، ہوتی ہے، کی تعلیم وتربیت میں عمر بتا دیتی ہے، اور اگر کسی کے پاس یہ نہ ہو تو وہ شہید کی یاد اور شہادت کے احساس برتری کو اپنے پیروں کی زنجیر اور گلے کا ہار بنا دیتی ہے۔ غزہ کی تباہی کے بعد فلسطین کے ہمسایوں کو اپنی اس بے پناہ دولت سے جو امریکا اور مغرب کے بینکوں میں استعمار کے زیر استعمال ہو رہی ہے بلکہ انہی کی تباہ کاریوں میں استعمال ہو رہی ہے، ان کو چاہئے تھا کہ انہیں گھروں ہسپتالوں، اسکولوں اور مساجد کی تعمیر نو میں استعمال کریں لیکن یہ تو اپنے ہاں اسرائیلی یہودیوں کی محبت میں ان کے "کوشر ریسٹورنٹس" اور ان کی مذہبی عبات گاہوں کی تعمیر میں صرف کر کے اللہ کے غضب کو دعوت دے رہے ہیں۔

سنا ہے کہ ظالم اور عیار اسرائیل نے یکطرفہ جنگ بندی کا اعلان اس فتح وسرشاری کے ساتھ کیا ہے کہ ہم نے اپنے مشن کے سارے اہداف فی الحال حاصل کر لئے ہیں اور عالمی طاقتوں نے ہمیں مستقل ضمانتیں دی ہیں کہ آئندہ غزہ کے مکین ہمارے کسی ظلم پر کوئی احتجاج نہیں کریں گے، لیکن ہماری افواج اب مستقل طور پر غزہ میں قیام کریں گی اور دنیا کی سب سے بڑی جیل "غزہ،" کا محاصرہ بدستور قائم رہے گا۔ قصر سفید کے فراعین کو جہاں ہر سال کا تحفہ دیا جاتا ہے، اب وہاں عالم اسلام اور بالخصوص پڑوسی عرب ممالک کو اسرائیل کو تسلیم کرنے کے بعد ہمیشہ کیلئے نہ صرف خاموش غزہ کے شہداء کر دیا گیا ہے بلکہ ان کو برملا باور کرا دیا گیا ہے کہ اپنے اقتدار کی سلامتی کیلئے امریکا کی قدم بوسی کے بغیر چارہ کار نہیں اور اسی اقتدار کی خواہش نے ملی اہمیت

ہے۔ قصر سفید کے مکیں نے اب اسرائیل کو عالم اسلام کے اس ندامت کے گھر کا پتہ بھی اپنے غلاموں کی فہرست کے ساتھ فراہم کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا کر دیا ہے کہ اسرائیل کو ان عربوں کے ساتھ سفارتی تعلقات کی کامیابی کے بعد "گریٹر اسرائیل" کے منصوبے میں حائل دیگر رکاوٹیں بھی جلد دور کر دی جائیں گی۔

لیکن میرا غم تو یہ ہے کہ انسانی المیوں کی اس زنجیر کا کیا ہو گا جسے ان کی خاموشی نے دائرہ در دائرہ، حلقہ در حلقہ ایک خوفناک انتقام کی آگ کی وادی میں دھکیل دیا ہے جس کے خوفناک اثرات آنے والے وقتوں میں ظاہر ہونا شروع ہوں گے۔ باقی رہا اسرائیل، تو وہ اپنے ظلم کا بیج بو کر غزہ اور فلسطین میں ہی نہیں، عالم عرب میں ردِّ عمل کی فصل کاٹنے کا ساماں کر رہا ہے۔ اسامہ جیسے کردار انہی مظاہر سے پیدا ہوتے ہیں اور انہی سے آکسیجن حاصل کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مستقبل کے کسی اسامہ کو پاکستان کے پہاڑوں اور افغانستان کے جنگلوں کی حاجت نہیں ہو گی بلکہ غزہ کے کھنڈروں، خون میں لتھڑے جسموں، بازوؤں پر سجے اور سینے سے لگے معصوم لاشوں اور بین کرتی عورتوں کے آنسوؤں میں ان کا جم غفیر ایک سیلاب کی طرح نمودار ہو گا اور یقیناً وہ وقت اپنا انتقام انہی امریکی و صہیونی غلاموں جیسی جنس سے شروع ہو گا اور ہر کوئی پکار اٹھے گا الامان الحفیظ!!!

آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

بروز بدھ 15 رجب المرجب 1443ھ 16 فروری 2021ء

مشرقِ وسطیٰ اور امریکا.....راستے جدا جدا

2021ء کو تاریخ میں خاص طور پر مشرقِ وسطیٰ میں بڑی سیاسی، سفارتی اور جیو پولیٹیکل تبدیلیوں کی وجہ سے یاد کیا جائے گا۔ ہر مسئلے کیلئے باہر سے مدد لینے کے عادی خلیجی ممالک اب ایک دوسرے سے بات چیت پر آمادہ ہیں، اس بڑی تبدیلی کی وجہ درحقیقت عراق اور افغانستان سے امریکی فوجی انخلا بنا۔ 2011ء کی عرب بہار کے کھنڈروں سے شام کے بشار الاسد اور لیبیا کے سابق مردِ آہن معمر قذافی کے بیٹے سیف الاسلام قذافی ایک بار پھر ابھر کر سیاسی منظر نامے پر آچکے ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ کا سوئٹزرلینڈ کہلوانے والا لبنان معاشی تباہی کی المناک داستان بن چکا ہے، ایران اپنے سخت گیر صدر ابراہیم رئیسی کی قیادت میں جوہری پروگرام پر اپنے موٴقف میں مزید سختی لا چکا ہے، ویانا میں ایرانی جوہری پروگرام پر مذاکرات کے باوجود اسرائیل ایران پر حملے کی دھمکی دے رہا ہے جبکہ ایران خلیج میں جنگی مشقیں کر رہا ہے، جنہیں پاسدارانِ انقلاب کے سربراہ جنرل حسین سلامی تل ابیب کیلئے کھلی دھمکی قرار دے رہے ہیں۔ ان باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ خطے میں جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں۔

امریکا کے ہزاروں فوجی اور ہلاکت خیز جنگی مشینری پورے مشرقِ وسطیٰ میں موجود ہے لیکن مشرقی یورپ میں روس کے ساتھ ابھرتے تنازع اور تائیوان پر چین کے ساتھ تیز ہوتی کشمکش کے تناظر میں اب فوجی طاقت کو نئے اڈوں کی جانب منتقل کرنے کی بحث زور پکڑ چکی ہے اور امریکی دلچسپی مشرقِ وسطیٰ میں پہلے جیسی نہیں رہی۔ کابل ایئرپورٹ پر امریکی جہازوں سے لٹک کر مرتے اتحادیوں کو دیکھنے کے بعد اب عربوں کا واشنگٹن پر پہلے جیسا اعتماد بھی نہیں رہا۔ ان حالات میں مشرقِ وسطیٰ کے رہنما اب اختلافات کو کم سے کم کرنے کیلئے بھرپور سفارتی کوششوں میں مصروف ہیں۔ عرب امارات کے قومی سلامتی مشیر اپنی بندرگاہوں کے نزدیک بحری جہازوں پر ایرانی پاسدارانِ انقلاب کے حملوں کو روکنے کیلئے ایران کے صدر سے ملاقات کر چکے ہیں۔ اگرچہ سعودی عرب نے 2016ء میں ایران کے ساتھ سفارتی تعلقات توڑ دیئے تھے لیکن اب سعودی بغداد کی میزبانی میں تہران کے نمائندوں کے ساتھ مذاکرات شروع کر چکے ہیں۔

صرف ایران یا اس کا جوہری پروگرام ہی مسئلے کا باعث نہیں بلکہ عرب رہنماؤں کے اختلافات بھی اس کی ایک بڑی وجہ ہیں، سعودی عرب کئی سال کے مقاطعے کے بعد قطر سے دوبارہ تعلقات بحال کر رہا ہے، کئی برسوں بعد ریاض میں خلیج تعاون کونسل (جی سی سی) سربراہ کانفرنس میں کوئی بھی رکن غیر حاضر نہیں تھا۔ جی سی سی کو فعال کرنے کیلئے شہزادہ محمد بن سلمان نے رکن ملکوں کا دورہ بھی کیا، ان کوششوں کا مقصد ایرانی خطرے کے مقابلے کیلئے سب کو ساتھ ملانا ہے۔ اخوان المسلمون کے ساتھ تعلقات کی بنیاد پر عربوں نے ترکی سے بھی دوری اختیار کر لی تھی لیکن اب ترکی کے ساتھ مصر اور امارات روابط بڑھا رہے ہیں جبکہ معاشی مشکلات کا شکار ترکی بھی عربوں کے ساتھ تعلقات میں گرمجوشی کا قائل نظر آتا ہے۔ اس سب کے باوجود کیا عرب لیڈر تمام مسائل کا حل اپنے طور پر تلاش کرنے میں کامیاب ہوں گے یا نہیں؟ تو جواب زیادہ حوصلہ افزا نہیں کیونکہ خطے میں تنازعات اور ان میں بیرونی مداخلت عربوں کو تمام فیصلے ہاتھ میں نہیں لینے دے گی۔ وہ مسائل اور بیرونی کردار کیا ہیں، اس کا اجمالی جائزہ لیا جانا ضروری ہے، اس کے بعد ہی یہ اندازہ ہو پائے گا کہ عرب قیادت کیا کچھ کرنے کے قابل ہے اور کہاں کون سی رکاوٹیں حائل ہیں؟

سعودی عرب ان دنوں ریاض میں ہونے والے "انٹرنیشنل فلم فیسٹیول" اور "فارمولا ون کار ریس" کی وجہ سے دنیا کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ محمد بن سلمان کا 2018ء میں دیا گیا ایک بیان ان دنوں پھر سے وائرل ہو چکا ہے، جس میں انہوں نے کہا تھا کہ مشرقِ وسطیٰ "نیا یورپ" ہے اور اگلے 5

برسوں میں سعودی عرب بالکل مختلف ریاست ہو گی۔ محمد بن سلمان نے 2021ء کا آغاز پچھلے سال میں کی گئی غلطیوں کو سدھارنے کی کوشش سے کیا تھا، دراصل محمد بن سلمان اپنے خلاف اٹھتی لہروں کا رخ موڑنے کی کوشش میں ہیں۔ وہ اب اپنے ہمسایہ لیڈروں کو یہ جتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اب وہ بالکل مختلف شخصیت ہیں اور ماضی کی غلطیوں سے سبق سیکھ چکے ہیں۔ اس گزرتے سال کے آغاز پر انہوں نے پہلا قدم قطر کی طرف بڑھایا اور پھر جی سی سی کے دیگر نظر انداز ملکوں کو رام کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے جی سی سی ملکوں کے حالیہ دورے کا آغاز سلطنت عمان سے کیا، وہی ملک جس پر یہ الزام لگایا جاتا رہا کہ اسی کے راستے ایرانی اسلحہ یمن پہنچتا ہے۔ سلطان قابوس کی وفات کے بعد عمان کی نئی قیادت نے شاید معاشی دباؤ کے تحت سعودی ولی عہد کا ریڈ کارپٹ استقبال کیا تاہم تاریخی طور پر عمان کبھی بھی آسان اتحادی نہیں رہا۔ سعودی عرب ہمیشہ سے ان ملکوں کو اتحادی مانتا آیا ہے جو اس کے تابع رہیں لیکن تابع فرمان ہونا عمان کی خارجہ پالیسی کا عنصر کبھی نہیں رہا۔

قطر سعودی بائیکاٹ کا مقابلہ کرنے میں اس لیے کامیاب رہا کیونکہ وہ دولتمند ہے اور واشنگٹن میں اثر و رسوخ بھی رکھتا ہے، اب بائیکاٹ کے خاتمے کے بعد قطر شاید یہ تلخی بھلا دے لیکن یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ افغانستان سے امریکی فوجی انخلا کے دوران قطر نے طالبان کے ساتھ رابطوں اور امریکیوں کے انخلا میں نمایاں کردار ادا کر کے اپنی اہمیت منوالی ہے۔ ریاض اور دوحہ کے تعلقات معمول پر ضرور آئے ہیں اور امیرِ قطر نے سعودی ولی عہد کے ساتھ گرمجوش معانقہ بھی کیا لیکن کیا دوحہ محمد بن سلمان کے اقتدار کے دوران کسی نئے بائیکاٹ کے امکان کو ذہن سے محو کر دے گا؟ بغداد کی میزبانی میں تہران کے ساتھ ریاض کے مذاکرات اگرچہ دونوں ملکوں کے درمیان تجارتی تعلقات کی بحالی تک تو پہنچے لیکن کیا یمن جنگ کے جاری رہتے ہوئے دونوں ملکوں کے درمیان بلا تعطل تجارت ممکن ہے؟ لبنان کی حزب اللہ کیا تہران، ریاض گرمجوش تعلقات میں رکاوٹ نہیں بنے گی؟ ایرانی جوہری پروگرام پر جاری مذاکرات کے نتائج کے بعد ہی دونوں ملکوں کے مستقبل کے تعلقات کا درست اندازہ ممکن ہو پائے گا۔

جمال خاشقجی کا جب قتل ہوا تو ترکی اور سعودی عرب کے درمیان تعلقات انتہائی کشیدہ ہوئے لیکن اب دونوں ملک روابط بڑھا رہے ہیں۔ سعودی عرب اور دیگر خلیجی ریاستوں کو ترکی کے عرب سیاسی تحریکوں کے ساتھ تعلقات پسند نہیں ہیں لیکن اب عرب سیاسی تحریکیں کمزور پڑ چکی ہیں اور مطلق العنان عرب حکمران ان تحریکوں سے خطرہ محسوس نہیں کرتے۔ اس کے باوجود خاشقجی کیس دونوں ملکوں کے درمیان ایک رکاوٹ ضرور بنا رہے گا۔ ترکی ایران کے خلاف کسی بھی سعودی اتحاد کا حصہ بننے کو بھی تیار نہیں ہو گا، یاد رہے کہ ترکی ایران اور عراق سے بڑے پیمانے پر تیل امپورٹ کرتا ہے اور ایران کے ساتھ اس کے تعلقات مختلف نوعیت کے ہیں۔ سعودی عرب کیلئے سب سے بڑا دردِ سر یمن ہے اور مستقبل میں جنگ بندی کے باوجود رہے گا کیونکہ اس جنگ کے زخم دنوں میں مندمل نہیں ہو سکتے۔ اگر جنگ بندی ہوتی بھی ہے تو یمن اپنے سے بڑے اور طاقتور سعودی عرب کو اتنے زخم دے چکا ہے جو بھرنے میں وقت لیں گے اور معاشی نقصان کی صورت میں یہ زخم رستے رہیں گے۔ سعودی ولی عہد نے 2017ء سے اب تک خطے میں دوست بنانے کے بجائے دشمن زیادہ بنائے ہیں اور اب پالیسیوں میں یوٹرن زیادہ مؤثر دکھائی نہیں دیتا۔

مشرقِ وسطیٰ میں سعودی عرب کے بعد اسرائیل دوسرا بڑا کھلاڑی بن چکا ہے اور عربوں کے ساتھ ''معاہداتِ ابراہیمی'' کے بعد اب وہ خلیج سے باہر بھی ان معاہدوں کو آگے بڑھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مسلم دنیا کے سب سے بڑے ملک انڈونیشیا کو اسرائیل کے ساتھ تعلقات معمول پر لانے کیلئے سرفہرست رکھا جا رہا ہے اور امریکی وزیرِ خارجہ انٹنی بلنکن انڈونیشیا کے حالیہ دورے میں اس ایشو پر بات کر چکے ہیں۔ اسرائیلی میڈیا کا کہنا ہے کہ انڈونیشیا کے ساتھ تعلقات معمول پر لانے کی کوشش ہو رہی ہے لیکن فوری طور پر بریک تھرو کا امکان نہیں، اگر ٹرمپ کے پاس مزید ایک یا دو ماہ ہوتے تو انڈونیشیا اب تک اسرائیل کو تسلیم کر چکا ہوتا لیکن اب بھی بائیڈن انتظامیہ اس معاملے پر سنجیدگی کے ساتھ کام کر رہی ہے۔ پچھلے ماہ منامہ سیکورٹی ڈائیلاگ کے موقع پر دونوں ملکوں کے وزرائے دفاع کی ملاقات بھی ہوئی۔ انڈونیشیا کا بظاہر موقف یہی ہے کہ فلسطینی ریاست کے قیام تک اسرائیل کے ساتھ معمول کے تعلقات ممکن نہیں۔

اسرائیل عرب دنیا کے ساتھ تعلقات کو تیزی سے آگے بڑھاتے ہوئے قائدانہ کردار کا خواہاں ہے۔ اسرائیل مراکش کے ساتھ انٹیلی جنس تعاون، مشترکہ مشقوں، دفاعی صنعت میں تعاون اور اسلحے کی فروخت کے معاہدے کر چکا ہے۔ مراکش کے ساتھ دفاعی معاہدے میں عرب امارات اور بحرین نے اہم کردار ادا کیا، یہ دونوں ریاستیں بھی اسرائیل کے ساتھ دفاعی تعاون کے معاہدے کر چکی ہیں۔ اسرائیل کے سرمایہ کار عرب امارات میں پھیل چکے ہیں جبکہ عرب امارات اسرائیل کے ہائی ٹیک سیکٹر پر سرمایہ لگا رہا ہے۔ عرب امارات اسرائیل کے گیس فیلڈ میں ایک ارب ڈالر سرمایہ کاری کا بھی اعلان کر چکا ہے۔ اسرائیل، عرب امارات، بحرین اور امریکا کا پانچواں بحری بیڑا بحیرہ احمر میں مشترکہ جنگی مشقیں بھی کر چکے ہیں اور آنے والے دنوں میں مزید ایسی مشقوں کے پروگرام ترتیب دیے جا رہے ہیں اور ان مشقوں کو ایران کیلئے پیغام بھی کہا جا رہا ہے۔ مصر اور اردن کے ساتھ اسرائیل کے دیرینہ تعلقات قائم ہیں۔

مشرقِ وسطیٰ کا تیسرا بڑا کھلاڑی عرب امارات ہے۔ عرب امارات ایران کے ساتھ ورکنگ ریلیشن بھی بنا رہا ہے اور ایران کو روکنے کی کوششوں میں بھی کردار ادا کر رہا ہے۔ حالیہ برسوں میں عرب امارات سفارتی محاذ پر سب سے زیادہ سرگرم رہا ہے۔ عرب امارات ان دنوں شام کو دوبارہ عرب لیگ میں واپس لانے کیلئے کوشاں ہے، جس سے اس کے کئی مقاصد جڑے ہیں اور خطے کی سیاست نیا موڑ لے سکتی ہے۔ شام جنگ کے آغاز پر عرب امارات نے دیگر عرب ملکوں کے ساتھ شام کا بائیکاٹ کیا تھا اور عرب لیگ کی رکنیت معطل کرنے کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ اب عرب امارات اس فیصلے کو واپس لینے کیلئے قائدانہ کردار ادا کر رہا ہے۔ شام میں امارات کے سفارتخانے نے کام شروع کر دیا ہے۔ شام کی تباہ حال معیشت میں سرمایہ کاری کی پیشکش بھی کی جا چکی ہے۔

شام کے صدر بشار الاسد سے اماراتی وزیر خارجہ نومبر میں ملاقات کر چکے ہیں، جو ایک عشرے کے بعد اعلیٰ ترین سطح پر رابطہ ہے۔ عرب امارات کا مقصد شام کو ایران سے دور کرنا اور جنگ سے تباہ ملک میں سرمایہ کاری مواقع پر قبضہ کرنا ہے۔ شام کے اسرائیل کے ساتھ مذاکرات بھی عرب امارات کے ایجنڈے پر ہیں۔ عرب امارات کا خیال ہے کہ بشار الاسد سرمایہ کاری کے بدلے میں تہران سے تعلقات کم کر سکتے ہیں تاہم اس کے امکانات کم ہیں کیونکہ بشار الاسد کو بچانے کیلئے روس کے علاوہ کسی نے کردار ادا کیا تو وہ ایران ہی تھا۔ جہاں تک اسرائیل-شام تعلقات کی بات ہے تو وہ بھی بشار الاسد کیلئے ممکن نہیں ہوگا کیونکہ ان کی حکومت ہی اسرائیل اور مغرب سے لڑائی پر کھڑی ہے۔ کیا اسرائیل شام سے تعلقات کیلئے گولان کی پہاڑیاں واپس

کرے گا؟ ناممکن۔ عرب امارات اور شام کے تعلقات کی ایک بنیاد ترکی کی مشترکہ مخالفت ہو سکتی ہے، ترکی بشار کے باغیوں کا مددگار ہے، ترکی کے مقابلے میں بشار الاسد عرب امارات کیلئے اہم ثابت ہو سکتے ہیں۔

دراصل عرب امارات کو ان مقاصد میں سے کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سرگرمی کا فائدہ کیا ہے؟ اصل جواب یہ ہے کہ عرب امارات کا سب سے بڑا اتحادی امریکا خطے میں پیچھے ہٹ رہا ہے جبکہ روس اور چین پیش قدمی کر رہے ہیں۔ ان حالات میں عرب امارات سعودی عرب کا دست نگر بن کر نئے اتحاد میں جانے کے بجائے اپنے لیے ہاتھ پاؤں مار کر بڑا کردار لینا چاہتا ہے۔ عرب امارات دراصل سب جھگڑوں سے جان چھڑا کر آگے بڑھنے کا خواہاں ہے اور سعودی عرب کے مقابلے میں اپنا اثر و رسوخ بڑھا رہا ہے۔

امریکا اگرچہ اپنی توجہ مشرقِ وسطیٰ میں کم کر کے انڈو پیسفک پر مرکوز کرنے کا خواہاں ہے لیکن روس اور چین کا بڑھتا ہوا کردار اسے روکے ہوئے ہے۔ اس سال کی بڑی خبر عرب امارات کا ایف تھرٹی فائیو جنگی طیاروں کی ڈیل سے دستبردار ہونا ہے۔ اس کے پیچھے بڑی وجہ امریکا اور چین کے درمیان فوجی اڈوں کیلئے بڑھتی ہوئی کشمکش ہے۔ امریکا اور چین کے درمیان بظاہر بڑا فلیش پوائنٹ تائیوان ہے لیکن چین اس کشمکش کو اپنے دروازے سے دور رکھنا چاہتا ہے۔ امریکا چین کے فوجی اڈوں کو روکنا چاہتا ہے۔

چین عرب امارات کے پورٹ خلیفہ پر "خفیہ طور پر فوجی اڈہ تعمیر" کر رہا تھا، جو امریکیوں کی نظر میں آگیا۔ امریکی وارننگ کے بعد وقتی طور پر اس اڈے کی تعمیر رک گئی ہے اور فوری نتیجہ عرب امارات کی جنگی طیاروں سے دستبرداری کی صورت میں برآمد ہوا۔ چین کے صدر شی جن پنگ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ چین کو ورلڈ پاور بننا ہے تو اسے اپنی تجارتی راہداری پر پہرہ بھی خود دینا ہوگا، جہاں امریکیوں کا پہلے سے غلبہ ہے۔ آبنائے باب المندب میں چین کا اثر و رسوخ اہم ہے، چین جنگ اور امن دونوں صورتوں میں امریکا اور اتحادیوں کا سمندر پر غلبہ ختم کرنے کے درپے ہے۔

عرب امارات کے ساتھ امریکا کے مراسم اور تعاون کے معاہدے متاثر ہونے کا خدشہ وقتی طور پر آڑے آیا ہے لیکن کشمکش ختم نہیں ہوئی۔ چین سعودی عرب کو بیلسٹک میزائل بنانے میں بھی مدد دے رہا ہے۔ امریکی میڈیا نے سیٹلائٹ تصاویر شائع کیں، جن کے مطابق الدوادمی کے علاقے میں میزائل بنانے کی سرگرمی نوٹ کی گئی۔ چین کی وزارتِ خارجہ نے اس رپورٹ کی تردید کی بجائے سعودی عرب کے ساتھ دفاعی معاہدوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ چین اور سعودی عرب تعاون کسی بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی نہیں۔ ایران کے جوہری پروگرام پر بھی چین اور روس متحد ہیں، سلامتی کونسل میں ووٹ اور ویٹو کا ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ روس نے شام کے صدر بشار الاسد کی حکومت کو اب تک گرنے سے بچایا ہوا ہے۔ اگرچہ عرب رہنما تنازعات کے حل کیلئے مل بیٹھنے پر آمادہ دکھائی دیتے ہیں لیکن مسائل کا حل پہلے کی طرح بیرونی قوتوں کے ہاتھ میں رہنے کا امکان ہے۔ صرف اس قدر بہتری نظر آتی ہے کہ فوری طور پر کسی بڑے تنازع یا جنگ کا امکان نہیں کہ جس میں امریکا کو دوبارہ کودنا پڑے۔

بروز جمعۃ المبارک 17 رجب المرجب 1443ھ 18 فروری 2021ء

لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا

حالیہ مہینوں میں امریکی پالیسی سازوں نے چین کے ساتھ امریکی تعلقات کے حوالے تبدیل ہوتی ہوئی حکمت عملی کیلئے ''ذمہ دارانہ مسابقت'' یا ''ذمہ دارانہ مقابلے بازی'' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ 16 نومبر کو ہونے والے ورچوئل سمٹ کے دوران، امریکی صدر اور چینی صدر نے ذمہ داری کے ساتھ مسابقت کرنے پر زور دیا۔ بائیڈن نے اس بات پر بھی زور دیا کہ ہمیں تزویراتی مفادات کو بھی احسن طریقے سے ہینڈل کرنا ہوگا اور معاملات کو اس طرح سے آگے لیکر بڑھنا ہوگا کہ مسابقت تنازع کی شکل اختیار نہ کرے اور آپس میں رابطے ہر صورت میں برقرار رہیں۔

چین کے عروج سے نمٹنے کیلئے بھارت کو بھی نئی حکمت عملی کی ضرورت ہے۔ گزشتہ ایک دہائی سے یہ بات کی جارہی ہے کہ بھارت کو اپنی ہچکچاہٹ ختم کرکے چین کے خلاف بننے والے سکیورٹی اتحاد کا حصہ بننا چاہیے اور اس میں فعال کردار ادا کرنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو سکا ہے اور نہ ہی مستقبل میں ہو سکے گا، اس کی دو وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ کہ بھارت کو اپنے ہاتھ کی بوئی فصل کاٹنی پڑے گی جس کے سبب چین سے جو خطرات درپیش ہیں وہ اتحاد میں موجود بقیہ ممالک سے بالکل مختلف ہیں۔ مختلف جغرافیائی پوزیشن اور جیواسٹریٹجک ترجیحات میں تضادات کی وجہ سے اتحاد ایک جیسے اہداف رکھنے سے قاصر ہے۔ چین کے خلاف نیٹو جیسے اتحاد بنانا تقریباً ناممکن ہے کیوں کہ اس میں شامل ممالک کی سلامتی کی ترجیحات میں ہمیشہ اختلافات رہیں گے اور بین الاقوامی بحران کی صورت میں ہم آہنگی بھی نہ ہو سکے گی، اس کمزوری سے بھارت کے پڑوسی بخوبی واقف ہیں۔

مزید برآں کسی بھی اتحادی یا نیم اتحادی فریم ورک کا مطلب ہے کہ بھارت اپنی آزاد جغرافیائی سیاسی شناخت اور مستقبل میں ایک عظیم طاقت ہونے کا دعویٰ ترک کردے۔ اگرچہ ہم یہ سنتے رہتے ہیں کہ بھارت بدل گیا ہے لیکن یہ واضح نہیں ہے کہ بھارت کیلئے محض اپنی بنیادی شناخت کو ترک کرنا کتنا آسان یا فائدہ مند ہوگا، جو کہ ناگزیر ہے کیونکہ مودی سرکار نے ہنوتوا، آر ایس ایس کے جن کو بوتل سے نکال کر خود کیلئے بڑا خطرہ مول لے رکھا ہے۔ اگر بھارت امریکی قیادت والے اتحاد کو قبول کرتا ہے تو اس بارے میں حتمی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ آیا بھارت کثیر قطبی دنیا میں مکاری یا ذہانت کے ساتھ اپنی شناخت برقرار رکھ سکے گا یا نہیں یا موجودہ دنیا میں ایک مستحکم اور خوشحال خطے میں، ایک ایسے عالمی نظام کے ساتھ ملنا جو بہت سے لوگوں کیلئے کام کرتا ہے نہ کہ مخصوص طاقتوں کیلئے۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ گزشتہ 100 برسوں میں بلاک پر مبنی اتحاد استحکام لانے کی بجائے تنازعات کا باعث بنے ہیں، جبکہ گلوبل دنیا میں اتحاد ایک مختلف صورت حال سامنے لارہے ہیں۔

آج، حریف طاقتوں کے درمیان صرف تزویراتی استحکام ہی باہمی مفاد نہیں ہے بلکہ ایک پائیدار عالمگیر معیشت کا از سر نو حصول، انسانی ترقی اور انسانی سلامتی کو فروغ دینا، موسمیاتی تبدیلی اور ماحولیاتی تحفظ کا انتظام کرنا، اور مہلک وبائی امراض جیسے بین الاقوامی مسائل سے نمٹنا بھی ملکی سلامتی کی تعریف میں آتا ہے۔ یہ تمام مسائل حالیہ برسوں میں عالمی چیلنجوں میں سرفہرست رہے ہیں، اور عظیم طاقتوں کی مسابقت اکثر دنیا کو درپیش گہرے مسائل کیلئے ایک غیر معمولی خلفشار کا باعث بن رہی ہے۔ بلاشبہ یہ تمام مسائل اس بات کے متقاضی ہیں کہ عالمی نظام کی درستگی کیلئے تمام عالمی طاقتیں اپنی دشمنیوں کو محدود کرکے عالمی سطح پر باہمی تعاون کا مظاہرہ کریں۔ یہی وہ بنیادی نکتہ ہے لیکن بدقسمتی سے مودی سرکار نے اپنے اقتدار کیلئے ہندوتوا یعنی ہندو برتری کا کارڈ کھیل کر اپنے ہاں کی تمام اقلیتوں پر جو ظلم و ستم کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے، اس کے خلاف اب دنیا بھر میں آوازیں اٹھنا شروع ہوگئی ہیں بلکہ خود

امریکی میڈیا بھی چلا اٹھا ہے اور اس سلسلے میں انسانی حقوق تنظیموں کا اپنی اپنی حکومتوں پر دباؤ بڑھنا شروع ہو گیا ہے جو مستقبل میں مزید بڑھنے کے ساتھ ساتھ پالیسی سازاداروں کو اس سے نمٹنا اتنا آسان نہ ہو گا۔

پہلی سرد جنگ نے یہ ثابت کیا کہ کس طرح، مسابقت کے حصول میں، جمہوریتیں اپنے آپ کو ایک جنون میں مبتلا کر لیتی ہیں، غیر لبرل پالیسیوں میں مشغول ہو جاتی ہیں، دفاع کیلئے کسی بھی معقول ضرورت سے ہٹ کر سیکورٹی اداروں کو ملٹرائز'' کر سکتی ہیں، متوازن اقتصادی ترقی کے مشن کو بھول جاتی ''ہیں، اور عالمی نظام کے خصوصی تصورات کا پرچار کرتی ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ مودی سرکار اپنے ہاں جاری مذہبی تعصب، ہندازم کی برتری اور اپنے ہاں بسنے والی تمام اقلیتوں پر زندگی تنگ کرنے والی تاریخ کو دہرانے کا موقع نہ دے، خاص طور ایک ایسے وقت پر جبکہ اسے اپنی تہذیب، معیشت اور معاشرے کی بحالی کیلئے ابھی بہت طویل سفر طے کرنا ہے مودی سرکار کو یہ بھی ذہن نشین کرنا ہو گا کہ آج اقتدار کے نشے میں ہونے والی تمام غلطیاں کل کلاں اس کے خلاف ایک مضبوط ایف آئی آر درج ہو رہی ہے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں، اپنے آقا کی تاریخ پر نظر دوڑائے تو اپنے مفادات کی تکمیل پر اس کی اپنے دوستوں کو بے رحمی سے قربان کرنے کی روایات اس کی اپنی تاریخ کے اوراق سے بھری پڑی ہے۔

بڑی طاقتوں کے درمیان کچھ حد تک جغرافیائی سیاسی مسابقت ناگزیر ہے، اور اس کے امکان تب بڑھ جاتے ہیں اگر دونوں طاقتیں پڑوسی بھی ہوں لیکن اس مسابقت اور مقابلے بازی کی شدت ہمیشہ فریقین ہی طے کرتے ہیں۔ انیسویں صدی میں اینگلو-روسی دشمنی، بیسویں صدی کے پہلے نصف میں برطانیہ جرمنی دشمنی، امریکا سوویت جدوجہد، اور اثر ورسوخ اور طاقت کے حصول کیلئے متعدد دیگر علاقائی رقابتوں میں مختلف قسم کے مقابلوں کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ کچھ شدید طور پر متشدد تھے، کچھ زیادہ پیچیدہ اور لڑائی سے اپنے آپ کو روکے ہوئے تھے۔ بھارت اور چین کی دشمنی کچھ وجوہات کی وجہ سے ان کے خون میں شامل ہے۔ دونوں اپنی پرانی تہذیبوں کو قابل فخر جان کر اس کی فوقیت کے قائل ہیں، پیچیدہ جغرافیائی سیاست کی تاریخ کے ساتھ پڑوسی بھی ہیں ، خاص طور پر ہمالیہ کے سرحدی علاقوں میں دونوں کے ذیلی علاقہ جات میں مستقل مسائل بڑھتے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ دونوں طاقتیں اپنے آپ کو خطے کے ''پولیس مین'' کے طور پر بھی دیکھتی ہیں جبکہ پاکستان کی جغرافیائی حیثیت کا سب کو شدت سے احساس ہے اور مودی سرکار اپنے آقا امریکا اور مغرب کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا ہے کہ چین کو کمزور کرنے کیلئے پاکستان کو سبق سکھانا ضروری ہے لیکن اب یہ کسی کے بس میں نہیں رہا کہ طاقت کے زور پر ایسا کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کو معاشی لحاظ سے دباؤ میں رکھ کر اپنے مقاصد پورے کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔

تاہم ان سب کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اور خطے کی تینوں طاقتیں تصادم کی طرف بڑھنے سے گریزاں ہیں لیکن مودی سرکار چین کی آڑ میں امریکا اور مغرب کو اپنی غلامی کا یقین دلا کر تمام فوائد سمیٹ رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ متنازع سرحدیں یقیناً ایک ایسا مسئلہ ہیں، جس پر اعلیٰ سطح کی سیاسی اور فوجی توجہ اور فریقین کو انتہائی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ لداخ میں جاری تعطل نے بہت سے بھارتی مفروضوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے، جس پر چین اور بھارت نوّے کی دہائی سے امن برقرار رکھنے کیلئے انحصار کرتے تھے ۔ پاکستان کے ساتھ پہلے جیسی سرحدی چھیڑ چھاڑ بھی بند ہے

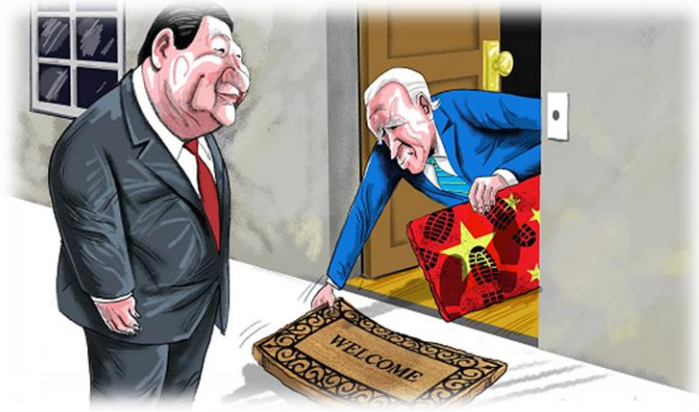

لیکن بلوچستان میں بدستور بھارتی دہشتگردی جاری ہے۔امن وسکون کی بحالی کیلئے تمام فریقین کو چاہیے کہ اپنی سلامتی کے بنیادی مفادات کو خطرے میں ڈالے بغیر امن وسلامتی کے حصول کیلئے متنازعہ مسائل کو کسی بیرونی دباؤ کے بغیر ان کے حل کیلئے کوشاں رہیں جس میں سرفہرست مسئلہ کشمیر ہے۔ہندو سرکار جس قدر جلد اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرے گی،اسی قدر اپنی مزید معاشی بربادی سے محفوظ ہونے کے ساتھ ساتھ اس خطے کی ترقی کے دروازے کھلتے جائیں گے تاہم اس توازن کو حاصل کرنے کیلئے مودی سرکار سے کوئی توقع رکھنا عبث ہوگا۔

بھارتی پالیسی سازوں کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ چین کا اصل مخالف اور محاذ ہمیشہ اس کی مشرقی سمندری سرحدوں پر رہے گا۔اپنے تمام داخلی مسائل کے باوجود،امریکا ایک بڑی طاقت ہے۔اس نے گزشتہ صدی میں چین کے مشرقی پڑوسیوں کو بحرالکاہل میں سلامتی کی ضمانت دیتے ہوئے بحرالکاہل کی سکیورٹی کے حوالے سے اپنی شناخت ضرور بنائی ہے لیکن اب افغانستان سے انخلاء کے بعد اس کی کارجہ پالیسیوں میں جوہری تبدیلیوں کے اشارے بھی مل رہے ہیں۔امریکا اور چین کے تعلقات مستقبل میں بھی پیچیدہ ہی رہیں گے،اسی لئے بھارت ان تمام حالات سے فوائد سمیٹنے کیلئے خود کو قربانی کا بکرا بنانے کیلئے پیش کررہا ہے لیکن لداخ میں بری طرح پسپائی سے مغرب اور امریکا کو بھی سمجھ آگئی ہے کہ قربانی کے بزدل بکرے کی پرورش کرنے کے باوجود اس سے خاطر خواہ نتائج نہیں مل سکتے جس کیلئے وہ کوئی درمیانی راستہ تلاش کرنے کی تگ ودو کررہے ہیں اور دوسری طرف ان کو یہ بھی احساس ہوگیا ہے کہ مودی تنازعات سے فائدہ اٹھارہا ہے اور خود اس کا حصہ بننے سے گریزاں ہے خاص طور پر ایشیا ان تنازعات کا شاید آنے والے دنوں میں بھی مرکز ہی رہے گا،اس لیے بھارت ان حالات کا بھرپور فائدہ اٹھانے کی حکمت عملی پر عمل پیرا ہے۔

مغرب میں کچھ لوگ چین سے ٹکراؤ کیلئے بھارت کا استعمال کرنا چاہتے ہیں۔اگرچہ چین کے خلاف ان ممالک کی اپنی پالیسی تضادات سے بھری ہوئی ہے اور وقتاً فوقتاً تبدیل ہوتی رہتی ہے۔بھارت کے پالیسی ساز چین سے ٹکراؤ کے یورپی ایجنڈے کیلئے بھارتی کندھا استعمال کرنے کی دعوت تو دے رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ چین کے بڑھتے ہوئے اثرورسوخ اور اسے عالمی طاقت بننے سے روکنے کی ذمے داری امریکا و مغرب پر عائد کرکے اپنی جان بچانے کی پالیسی بھی اپنائے ہوئے ہے۔بھارت کی جغرافیائی وسیاسی ترجیحات،اس کی سرحدی سلامتی،برصغیر اور مغرب کے بعد کے کثیر قطبی عالمی نظام کی تشکیل کے مقابلے میں بہت محدود ہیں اور بھارت کے پالیسی ساز اس بات سے بھی کوفزدہ ہیں کہ آئندہ چین کے ساتھ تصادم کی صورت میں پاکستان ایوب خان کے زمانے والی غلطی نہیں دہرائے گا۔

بھارت میں یہ سوچ بھی زور پکڑ رہی ہے کہ بھارت کو اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ امریکا اور چین کی تزویراتی مسابقت غیر متوقع رخ بھی اختیار کر سکتی ہے،مثلاً ضروری نہیں کہ یہ مسابقت اور رقابت کسی تنازع کی صورت ہی اختیار کرے بلکہ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کسی وقت یہ دونوں طاقتیں اپنی اس مسابقت کو معاونت میں بدل دیں اور اپنا اپنا اثرورسوخ قائم رکھنے کیلئے چند مشترکہ مفادات اور ترجیحات پر متفق ہوجائیں۔ایسی صورت میں بھارت کہاں کھڑا ہوگا؟اس لیے کسی دوسرے ملک کے مفادات کیلئے کسی سے بھی غیر ضروری دشمنی مول لینا کہاں کی عقل مندی ہے جبکہ پاکستان کی سرحد پر ایک ایسا ہمسایہ بھی موجود ہے جو کسی بھی وقت خطے میں تبدیلیوں کو حیران کن انداز کی سمت موڑ سکتا ہے۔

مزید یہ کہ کئی دہائیوں کے باہمی انحصار کو آسانی سے ختم نہیں کیا جاسکتا۔کانگریس میں موجود سرمایہ دار اور کاروباری افراد چین کے ساتھ 700/ارب ڈالر کے تجارتی تعلقات کو اتنی آسانی سے ختم نہیں ہونے دیں گے۔اس تجارت میں 33 فیصد کی شرح سے اضافہ ہوا ہے۔اور دوسرا بھارت کے تمام

ہمسایوں کے ساتھ بڑی تیزی کے ساتھ چین کے بڑھتے ہوئے تجارتی تعلقات کے بعد ان ملکوں کو بھی بھارت کی اجارہ داری سے جہاں رہائی نصیب ہو رہی ہے وہاں اپنی سلامتی کیلئے چین پر بڑھتا ہوا اعتماد ان کو بھارت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی ہمت بھی عطا کر چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلی مرتبہ نیپال نے بھارت کو اپنے ہاں جانے والی سڑک اور جیل پر بھارتی قبضے پر نہ صرف سخت احتجاج کیا بلکہ بھارت کو اپنا قبضہ بھی چھوڑنا پڑا۔ بھارت کو اب اس بات سے بھی شدید تجارتی خطرہ لاحق ہو گیا ہے کہ چین نے نیپال کی بھارتی سرحد پر اپنی تجارتی منڈی کو فروغ دینے کیلئے سرمایہ کاری پر توجہ دینا شروع کر دی ہے جس سے آئندہ بھارت میں چینی مال کی اسمگلنگ سے بھارتی کارخانوں اور فیکٹریوں کے مال کو سخت مقابلہ درپیش ہو گا جس کا فی الحال وہ مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔ اس کے نتیجے میں بھارتی کارخانے بند ہونے کا بھی شدید خطرہ ہے/اس کے ساتھ ساتھ نہ ہی دنیا کی بڑی بڑی سپلائی چین کمپنیاں چاہیں گی کہ بھارت کی خواہش پر چین کے ساتھ تعلقات کو مکمل طور پر ختم کر دیا جائے۔

بھارتی سرمایہ دار یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ اکیسویں صدی کی یہ دہائی ایک ایسی دہائی ہے، جہاں بھارت کو چاہیے کہ وہ اپنی پالیسیوں پر نظر ثانی کرے، بھارت نہ صرف چین بلکہ دیگر چھوٹی ترقی پذیر معیشتیں جنہوں نے معیاری حکمرانی اور ملک میں سماجی و اقتصادی استحکام فراہم کیا ہے ان کے ساتھ مل کر کام کرنے کو ترجیح دے۔ اپنے علاقائی مفادات کو سامنے رکھ کر چین اور پاکستان سے تعلقات کو آگے بڑھائے، جن شعبوں میں چین اور پاکستان کے ساتھ باہمی تعاون سے آگے بڑھا جا سکتا ہے وہاں کسی داخلی سیاست یا دیگر ممالک کے مفادات کو سامنے رکھ کر پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے اور جہاں باہمی مسائل ہوں وہاں بھی ان کی شدت کو اتنا رکھا جانا چاہیے کہ واپسی کا راستہ کھلا رہے۔ اس کیلئے انتہائی اہم ہے کہ باہمی تنازعات کو حل کرنے کیلئے سنجیدگی اختیار کی جائے۔ بھارت کے تمام اہم سرمایہ کار پہلے ہی کشمیر تنازعہ پر جاری بھاری اخراجات سے جان چھڑانے کا مشورہ دے رہیں ہیں لیکن بھارتی فوجی جنتا اپنی اہمیت کو جتانے کیلئے مودی سرکار کو یہ کہہ کر خوفزدہ کر رہی ہے کہ اگر کشمیر ہاتھ سے نکل گیا تو بھارت مزید کئی حصوں میں تبدیل ہو جائے گا لیکن یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہئے کہ روس جیسی مضبوط اور ایٹمی طاقت افغانستان کے ساتھ جنگی اخراجات کی بناء پر ہی اس کے بطن سے مزید چھ ریاستیں وجود میں آ گئیں اب بھلا مودی سرکار کب تک یہ بوجھ برداشت کر پائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت کو چین کے مقابلے میں خود کو کیش کروانے میں جہاں جلدی ہے وہاں اس کی تباہی کا راستہ بھی کھل جانے کا امکان ہے۔

بروز اتوار 19 رجب المرجب 1443ھ 20 فروری 2021ء

تو پھر کیا ہو گا؟

یوں تو ہر روز نوجوان نسل کے ذہین و فطین بچے سوالات کی بھرمار لئے میرے تعاقب میں رہتے ہیں لیکن یونیورسٹی کا طالب علم بڑی پریشانی و حیرانی میں ہوا پوچھ رہا تھا کہ آج آپ نے جمعہ کی نماز سے پہلے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ قیامت کے دن ہر انسان کے اعمال کی تختیاں اس کی گردن میں ڈالی الجھا ہوئی ہوں گی۔ اب آپ ہی بتائیں کہ اگر ایک آدمی کے 70 سال سے 100 سال عمر ہوئی تو کتنی بڑی اور لمبی تختی اس کے گلے میں ہو گی؟ میں نے اس کو بالکل ٹوکا نہیں، جب بات ختم کر چکا تو میں نے استفسار کیا کہ "تم میری اس اطلاع پر طنز کر رہے ہو یا اس تختی کی بات پر؟ جہاں تک تختی کی بات ہے تو یہ قرآن کی آیت ہے، جس پر تم ہنس رہے ہو؟ میرا جواب سن کر گھبرا گیا اور جلدی سے کانوں کو ہاتھ لگا کر معذرت کرنے لگا کہ مجھے پتہ نہیں تھا لیکن عقلی طور پر کوئی "لاجک" نظر نہیں آتی میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا کہ یہ لاجک بڑی آسانی سے آپ کی عقل قبول کر سکتی ہے اگر آپ نے اس پر غور کیا ہو، یہ سو فیصد "راشنل" عقلی بھی ہے اور "لاجیکل" بھی۔۔ ہمارا خالق قرآن حکیم میں تو بڑی وضاحت کے ساتھ ہمیں متنبہ فرما رہے ہیں کہ:

وَ كُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ؕ وَ نُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا (سورہ اسراء: 13)

اور ہم نے ہر آدمی کے نامۂ اعمال (یعنی: اس کے انجام کی بھلائی یا برائی) کو اس کی گردن میں لٹکا رکھا ہے، اور ہم اس لکھی ہوئی چیز کو اس کیلئے قیامت کے دن نکال لیں گے، جسے وہ کھلی ہوئی (کتاب کی طرح) پائے گا۔

سنو بچہ جی۔۔ تم یہ سمجھ رہے ہو کہ لمبی سی تختی گلے میں ڈالی ہو گی۔۔ کیونکہ تم اللہ کی ٹیکنالوجی کو اپنی ٹیکنالوجی سے کمزور سمجھتے ہو۔ واقعی اس میں قصور ہمارے دینی طبقہ کا ہے کہ اس نے وقت کے لحاظ سے تراجم نہیں کئے اور مدرسہ ابھی تک صدیوں پرانا علم ہی گھوٹ گھوٹ کر پلا رہا ہے۔ تم جانتے ہو تختی کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں؟ اس نے جب حیرانگی سے نفی میں سر ہلایا تو میں نے اسے کہا کہ کبھی گوگل سے پوچھ لیا ہوتا تو جواب ملتا کہ "تختی" کو "ٹیبلٹ" کہتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کو جو سلیٹ یا تختیاں دی گئی تھیں انہیں بھی ٹیبلٹ کہا جاتا ہے۔ سب سے قدیم کوئی ساڑھے چار ہزار سال قدیم جو تختیاں یا مٹی کی سلیٹ ملی ہیں وہ داستان گلگامیش کی ہیں جس پر میخوں کی طرح خطوط ہیں جسے میخی رسم الخط کہتے ہیں۔

اگر گلے میں لٹکتی تختی کو "آئی پیڈ" یا "سیمسنگ ٹیبلٹ" کہیں تو پھر تو جگہ بن جائے گی نا گلے میں؟ اور اگر اس کے "جی بی" کو بڑھا دیا جائے تو پورے ملک کا ڈیٹا آپ کی گردن میں لٹکایا جا سکتا ہے کہ نہیں۔ ابھی ہفتہ قبل تم نے مجھے انتہائی چھوٹا سا "پین ڈرائیو" دیتے ہوئے کہا تھا کہ آپ اپنی زندگی کا تمام قلمی سرمایہ اس میں اگر منتقل کر دیں تو تب بھی اس کا ایک کونہ بھی استعمال نہ کر سکیں گے۔

اس آیت کا دوسرا حصہ اگر تم غور سے پڑھو تو اللہ کریم فرما رہے ہیں کہ "ہم قیامت کے روز اس کیلئے ایک رجسٹر نکالیں گے، جس کو وہ بالکل کھلا ہوا پائے گا" سے مراد یہ ہے کہ جو تختی اس کے گلے میں ہو گی وہ "ٹیبلٹ" سے بھی چھوٹی ہو گی اور اس سے اللہ کریم پرنٹ نکال کر ہارڈ کاپی سامنے رکھ دیں گے۔ آج کل وہ ٹیڑھے میڑھے کالے کوڈ کے نشان جسے تم لوگ "کیو آر" کوڈ کہتے ہو، تم سب کے آفیشل کارڈز میں ہوتا ہے، جسے تم لوگ دفتر یا کسی وزٹ پر جاتے ہوئے گلے میں پہنے رکھتے ہو، اسے اسکین کر کے تمام ڈیٹا لیا جا سکتا ہے، اور آج کل دنیا بھر کے شہریوں کو ملک سے باہر سفر کرنے کیلئے "چپ شناختی کارڈ" چاہئے ہوتا ہے جس کے ایک جانب یہی "کیو آر" کوڈ ہوتا ہے۔ ایک لمحے کے سکین کے بعد فوری طور پر سامنے اسکرین پر تمہارے بینک اکاونٹس، تعلیم، خاندان، میڈیکل ہسٹری اور نجانے کیا کیا نکل کر سامنے آجاتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ اس دلیل کے بعد اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ

گیا۔ میں نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے محض اس کے یقین کو مزید مضبوط کرنے کیلئے ایک اور دلیل سے کام لیتے ہوئے کہا۔ چلو تھوڑی دیر کو ہم ٹیبلٹ کو اصل تختی سمجھ لیں تو ہمارا 200 جی بی کا موبائل فون جس میں ہماری ساری دو نمبریاں، فراڈ، بنک اکاؤنٹ، رپورٹس، ای میلز، فیملی ڈیٹیلز، تصاویر بلکہ نجانے کیسی کیسی تصاویر۔۔ ہوتی ہیں۔۔ چلو کچھ دیر کو ہم خود کو خدا کے سامنے حاضر سمجھ کر اپنا موبائل نکال کر خود اس کا محاسبہ کریں تو ایمانداری سے فیصلہ کریں کہ ہم جنتی ہیں یا جہنمی؟؟ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا "جہنمی" اور آنکھیں خود بخود نیچے فرش کی طرف جھک گئیں۔ کہنے لگا کہ میں نے تو اس طرح کبھی سوچا ہی نہیں۔

اس کا یہ اعتراف دیکھ کر مجھے خود بھی ایک جھرجھری سی آگئی کہ آج کل تمام کرائم سین میں سب سے پہلے جیو فنسنگ کی جاتی ہے اور موبائل ڈیٹا لیا جاتا ہے، چاہے عورت ہو یا مرد۔ اب تو فرانزک ٹیسٹ بھی آگیا ہے جس کو دنیا بھر کی عدالتیں سو فیصد سچ اور درست مان کر ملزمان کو مجرم ٹھہرا کر سزا سنا دیتی ہیں تو کیا میرا رب اس پر قادر نہیں، اس نے تو انسان کو یہ علم ہی اس لئے عطا کیا ہے کہ وہ اپنے خالق کی قوتوں سے آشنا ہو سکے۔ آج کل کسی بھی ٹی وی پروگرام میں جھٹ سے سیاستدانوں یا مہمانوں کی برسوں پرانی ویڈیوز دکھا کر ان کے ماضی کا حساب مانگ لیا جاتا ہے اور وہ خود اپنا ویڈیو دیکھ کر پریشان وپشیمان ہوتا ہے اور اس کو جواب بن نہیں پاتا۔ ہمیں تو یہ بتادیا گیا ہے کہ وہ دن جو ضرور آنا ہے جہاں یہ عبد ذلیل اپنے رب کے سامنے سر جھکائے کھڑا ہو گا۔ جامع ترمذی کی صحیح حدیث نمبر 2417 کے مطابق "ابو برزہ اسلمیؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن کسی بندے کے دونوں پاؤں نہیں ہٹیں گے یہاں تک کہ اس سے یہ نہ پوچھ لیا جائے: اس کی عمر کے بارے میں کہ اسے کن کاموں میں ختم کیا، اور اس کے علم کے بارے میں کہ اس پر کیا عمل کیا اور اس کے مال کے بارے میں کہ اسے کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا، اور اس کے جسم کے بارے میں کہ اسے کہاں کھپایا"

اپنے اپنے گریبانوں میں جھانکیں، صرف یہ موبائل ہی قبر میں فرشتوں نے کھول لیا جس میں زیادہ سے زیادہ گزشتہ 15 سالہ ڈیٹا ہو گا تو؟ اس معجزاتی ریاست کو اس حال میں کس نے پہنچایا، اس کی دولت کو لوٹ کر کن بینک اکاؤنٹس میں منتقل کیا، اربوں کھربوں کی جائیدادیں، پلازے، ملیں کیسے وجود میں آگئیں، تو کیا ہو گا؟ اسی لئے تو رب ذوالجلال نے ارشاد فرمایا۔

اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (بنی اسرائیل: 17)

لے! خود ہی اپنی کتاب آپ پڑھ لے۔ آج تو تو آپ ہی اپنا خود حساب لینے کو کافی ہے۔

بروز سوموار 20 رجب المرجب 1443ھ 21 فروری 2021ء

کیا بھارت متحد رہ سکے گا؟

عالمی سطح پر کچھ کر دکھانا ممکن نہ ہو تب بھی کم از کم جنوبی ایشیا کا چودھری بننے کی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے حوالے سے بی جے پی نے مودی کی قیادت میں وہ سب کچھ کیا جو کرنا چاہتے تھے۔ اس کے باوجود بھارت کو اب تک اس مقام تک نہیں پہنچایا جاسکا جہاں وہ ایک نمایاں قوت کے طور پر دکھائی دے۔ ایک طرف تو بھارت کے گوناگوں مسائل ہیں اور دوسری طرف تیزی سے بدلتے ہوئے عالمی و علاقائی حالات۔ آج کی دنیا کو جن پیچیدہ مسائل کا سامنا ہے اُن کا حل تلاش کرنے میں ترقی یافتہ ممالک کو بھی مستقل نوعیت کی الجھنوں کا سامنا ہے۔ سوچا جاسکتا ہے کہ ایسے میں بھارت کیلئے تیزی سے پنپنے اور خود کو علاقے کا چودھری بنانے کی گنجائش کہاں سے نکل سکتی ہے۔

مودی اور اُن کی ٹیم نے بھارت کو کہاں پہنچادیا ہے، اِس سوال پر ساری دنیا میں بحث ہو رہی ہے۔ آج بھارت کی سیاست عجیب موڑ پر آکھڑی ہوئی ہے۔ آئینی طور پر بھارت سیکیولر ہے مگر سیاست سے سیکیولرازم یوں نکل چکا ہے کہ ڈھونڈے نہیں ملتا۔ سنگھ پریوار کی سیاسی جماعتوں اور تنظیموں نے معاملات کو یوں بگاڑا ہے کہ اب پوری سیاست ہی مذہب کی بنیاد پر پھیلائی جانے والی منافرت کی نذر ہو کر رہ گئی ہے۔ مودی سرکار نے ہندُتوا فورسز کو خوش کرنے اور عام ہندوؤں کو اپنی طرف تیزی سے متوجہ کرنے کیلئے مقدس مقامات کو تعمیر و ترقی کے نئے مرحلے سے گزارنے کیلئے ایودھیا کے بعد کاشی، متھرا اور بنارس میں بھی شاندار مندر تعمیر کیے جارہے ہیں۔ بعض پرانے مندروں کو توسیع کے ذریعے وسیع و عریض کمپلیکس کی شکل دی جارہی ہے۔ مندروں کے ساتھ ساتھ شاپنگ مالز اور انٹرٹینمنٹ ایریا بھی بنائے جارہے ہیں۔ یہ سب مذہب کے نام پر ہو رہا ہے اور مقصود ہے ووٹ بینک مضبوط بنانا۔

12 برس میں وہ مہنگائی دکھائی نہیں دی جو آج مودی دور میں دکھائی دے رہی ہے۔ کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں جس کی قیمت عام آدمی کو سُکون کا سانس لینے کا موقع فراہم کرے۔ بیروزگاری بھی خطرناک حد تک بڑھ چکی ہے۔ بھارتی سیاست میں مذہب کا عمل دخل خطرناک حد تک بڑھ چکا ہے۔ ہر بڑی اور چھوٹی جماعت کی قیادت اب صرف مذہب کے نام پر ووٹ مانگنے کی تیاریاں کرتی دکھائی دے رہی ہے۔ مذہب کو سیاست کی بنیاد بنا کر کچھ اس انداز سے سُکون کا سانس لیا جارہا ہے گویا تمام بنیادی مسائل حل کیے جاچکے ہیں اور سیاست کی گرم بازاری کیلئے صرف مذہب رہ گیا ہے۔

حزبِ اقتدار ہو یا حزبِ اختلاف، آج بھارت میں ہر طرف مذہب کی بنیاد پر کی جانے والی سیاست کی بات ہو رہی ہے۔ پورے ملک میں مودی کو پوجا پاٹ کرتے، آرتی میں شریک ہوتے اور گنگا میں اشنان کرتے دکھایا جارہا ہے۔ اُنہیں چیلنج کرنے والے بھی خود کو مذہب کا اُن سے بڑا محافظ ثابت کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ راہول گاندھی چیخ چیخ کر اپنے ہندو ہونے کا ثبوت فراہم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کاشی میں جو کچھ تعمیرِ نو کے نام پر ہو رہا ہے اُس کا سہرا اکھلیش یادو اپنے سر باندھنے کی کوشش میں جُتے ہوئے ہیں۔ پارلیمنٹ کے ایوانِ زیریں لوک سبھا کے اگلے انتخابات میں خود کو حزبِ اختلاف کی سب سے بڑی رہنما بنانے کی کوشش میں مصروف مغربی بنگال کی ممتا بینرجی نے مندر، مسجد اور گرجا کی تصویر والے پوسٹر اور بینر چھپوا کر اپنی پارٹی ترنمول کانگریس کی پوری سیاست کو مذہب کے کھونٹے سے باندھ دیا ہے۔ ایک طرف بھارتیہ جنتا پارٹی مذہب کے نام پر سیاسی دکان چمکا کر اقتدار پر اپنی گرفت دوسری طرف حزبِ اختلاف کی جماعتوں کو بھی بھرپور انتخابی فتوحات مذہب کے سائے ہی میں دکھائی دے رہی ہیں۔ مضبوط تر کرنا چاہتی ہے تو ملک

کی کم و بیش تمام بڑی اور جھوٹی سیاسی جماعتوں کے منشور اور ترجیحات کا جائزہ لیجیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں لگتا ہی نہیں کہ ملک میں مذہب کے علاوہ بھی کوئی ایسا نکتہ ہے جس پر سیاست کی جاسکے۔ ترقی و خوش حالی کے مختلف پیمانوں کے مطابق جائزہ لیجیے تو بھارت آج بھی اچھا خاصا پچھڑا ہوا ہے۔ 25 فیصد سے زائد بھارتی آج بھی ناخواندہ ہیں۔ 35 فیصد سے زائد بھارتی باشندے خطِ افلاس سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ امیروں اور غریبوں کے درمیان فرق تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ بھارت وہی ملک ہے جو کورونا وائرس کی وبا سے بمشکل نکلا۔ تب ملک مرگھٹ میں تبدیل ہو کر رہ گیا تھا۔ شاید ہی کوئی ہو جس کے گھر، خاندان، دوستوں یا جاننے والوں میں سے کسی کو موت چُھو کر نہ گزری ہو۔ جن لوگوں نے اپنے پیاروں کو کاندھا دیا وہ اور جو اپنے پیاروں کا آخری دیدار بھی نہ کر سکے وہ اتنی جلدی اُس مشکل گھڑی کو کیسے بھول گئے؟ جن کے ہاتھ میں اقتدار ہے وہ تو چاہیں گے ہی کہ لوگ کورونا کی دوسری لہر کے ہاتھوں پیدا ہونے والی تباہی کو بھول جائیں۔ وہ تو یہ بھی چاہیں گے کہ لوگ یہ بھی بھول جائیں کہ ڈانواڈول قومی معیشت بھی اپنی جگہ ایک بڑی آفت اور مصیبت ہے۔ ملک ترقی کی راہ سے ہٹ چکا ہے۔ سیاسی تماشوں سے ہٹ کر دیکھنے کی کوشش پر لوگوں کو دکھائی دے گا کہ ملک انتہائی پریشان کن مسائل میں گھرا ہوا ہے۔

اس وقت ملک کو ایسی سیاست کی ضرورت ہے جو یہ بتائے کہ ملک میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو روزگار کیسے ملے گا، مہنگائی پر کس طور قابو پایا جاسکے گا، بچے اسکول کس طرح جاسکیں گے، اسپتالوں میں ڈاکٹر اور بستروں کی تعداد کیسے بڑھے گی۔ ملک کی مجموعی حالت تو یہ ہے کہ آکسیجن جیسی انتہائی بنیادی ضرورت بھی آسانی سے پوری نہیں ہوتی۔ مسائل ہیں کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتے۔ قومی وجود خطرے میں ہے۔ ایسے میں اس بات کی کیا اہمیت باقی رہ جاتی ہے کہ کون سا مندر کب اور کہاں بنے گا۔ عوام کس پارٹی کو حکومت چلانے کیلئے چُنیں گے یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا مگر سیاسی جماعتوں کے پاس اپنے منشور کے ذریعے ترجیحات ظاہر کرنے کا موقع موجود ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ تمام قابلِ ذکر سیاسی جماعتیں اپنی ترجیحات طے کر چکی ہیں، یہ ٹھان لی گئی ہے کہ الیکشن صرف مذہب کی بنیاد پر لڑنا ہے۔ سیاسی جماعتوں کی ترجیحات میں فی الحال یہ نکتہ شامل نہیں کہ عوام کا معیارِ زندگی کیونکر بلند کیا جاسکتا ہے۔

کورونا کی وبا نے بھارت کی معیشت کو شدید نوعیت کی شکست و ریخت سے دوچار کیا ہے۔ ہزاروں صنعتی یونٹ بند کر دیے جانے سے بیروزگاری بڑھ گئی۔ مہنگائی نے رہی سہی کسر پوری کرتے ہوئے عوام کا سُکون سے جینا دوبھر کر دیا ہے۔ آزاد بھارت کی تاریخ میں پہلی بار قومی معیشت پھیلنے کی بجائے سکڑ رہی ہے۔ متمول افراد تو یہ جھٹکا برداشت کر سکتے ہیں، عام آدمی کیا کرے کہ وہ تو شدید غربت کی چکی میں پِس رہا ہے۔ خطرے کی گھنٹی بج رہی ہے۔ کم و بیش ڈھائی عشروں کی محنت کے نتیجے میں جن کروڑوں افراد کو کسی نہ کسی طور غربت کے دائرے سے نکالنے میں کامیابی حاصل ہوئی تھی وہ دوبارہ غربت کے دائرے میں جاچکے ہیں۔ کم از کم 12 برس کے دوران ایسی مہنگائی دکھائی نہیں دی اور بیروزگاری کا تو 45 سال کا ریکارڈ ٹوٹ گیا ہے لیکن ان تمام بدحالی کے باوجود مودی نے جو مذہب کے نام پر سیاست شروع کی ہے، اس نے بھارت کو لامتناہی تباہی کی طرف دھکیل دیا ہے اور اب یوں محسوس

ہو رہا ہے کہ بھارت اپنی غلط پالیسیوں کے بوجھ تل خود ہی ٹوٹنے کے عمل کی طرف بگٹٹ بھاگ رہا ہے اور اس تباہی سے بچانے کیلئے اس کے آقا بھی ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔

بروز منگل 21 رجب المرجب 1443ھ 22 فروری 2021ء